فتاویٰ
یوسف القرضاوی
(جلد دوم)
علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

فتاویٰ
یوسف القرضاوی
(جلد دوم)

www.KitaboSunnat.com

مصنف

علامہ یوسف القرضاوی

مترجم

سیّد زاہد اصغر فلاحی

البدر پبلی کیشنز
23 راحت مارکیٹ' اُردو بازار' لاہور
فون: 042-37225030-37245030-0300-8485030

☆ نام کتاب فتاویٰ یوسف القرضاوی (دوم)
☆ مصنف علامہ یوسف القرضاوی
☆ ناشر علی سعید
☆ اشاعت جون 2012ء
☆ مطبع علی اعجاز پرنٹرز لاہور
☆ ہدیہ -/250 روپے

ترتیب

ارکانِ اسلام اور عبادات

عورت اور خاندان

اجتماعی و معاشی مسائل

طبی مسائل

سیاسی مسائل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

علاّمہ یوسف القرضاوی اس دور کے ایک دیدہ ور اور صاحبِ بصیرت عالمِ دین' محقق اور مصنف ہیں۔ قرآن وحدیث پر ان کی گہری نظر ہے۔ اُمت کے ائمہ وفقہاء اور ماہرین علومِ اسلامیہ کے افکار وخیالات کا انہوں نے بڑی دِقتِ نظر اور باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ دورِ حاضر کے مسائل اور پیچیدگیوں سے بہ خوبی واقف ہیں اور اسلام سے متعلق جو سوالات آج اُبھر رہے ہیں' ان کا جواب دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسلام کی ترجمانی کا دعویٰ تو ہر کس وناکس کر سکتا ہے اور آج کے دورِ پُرفتن میں اس کے دعوے دار ہر طرف گشت کرتے نظر آتے ہیں' لیکن ایسے افراد کم ہی ہیں' جن کے علم و فکر اور تقویٰ وطہارت پر اُمت کو اعتماد ہو' جن کی طرف وہ اپنی علمی وفکری مشکلات میں رجوع کرے' جنہیں وہ اسلام کا مستند ترجمان سمجھے اور جو فی الواقع ترجمانی کا حق ادا کر سکتے ہوں۔ علاّمہ یوسف القرضاوی کا شمار انہی معدودے چند افراد میں ہوتا ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کی بیسیوں تصانیف اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان کے خطبات' دروس اور فتووں سے بڑے پیمانے پر' خصوصاً انٹرنیٹ کے ذریعے پورے عالمِ عرب میں استفادہ کیا جا رہا ہے۔

فتاویٰ یوسف القرضاوی کی پہلی جلد کا ترجمہ اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی دوسری جلد کا ترجمہ الحمدللہ اب پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ جلد بڑی اہم ہے۔ اس میں قدیم موضوعات کے ساتھ دورِ جدید کے بعض اہم مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے۔ علاّمہ

قرضاوی نے بالعموم جمہورِ اُمت کے نقطۂ نظر کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اختلافی مسائل میں انہوں نے محاکے اور تحلیل و تجزیہ کا رویہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے قدیم علماء و فقہاء کے خیالات سے اتفاق بھی کیا ہے اور اختلاف بھی' اور اپنا موقف بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بعض اہم اور نازک مسائل میں ان کے خیالات اس عاجز کے خیالات سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں۔ جیسے غیر مسلموں سے تعلقات' ذمیوں کے حقوق' خواتین کے حقوق اور ان کی حریت فکر و عمل' امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اس کے حدود و شرائط وغیرہ۔ ان موضوعات پر اس عاجز نے اپنی کتابوں اور مقالات میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ بعض مسائل میں میری رائے ان کی رائے سے مختلف ہے۔ جیسے حجاب کا مسئلہ' عورت کی امامت و قیادت کا مسئلہ اور لاعلاج مریض کو ختم کردینے کا مسئلہ۔ ان مسائل پر جو لوگ میری رائے جاننا چاہیں وہ میری تحریریں دیکھ سکتے ہیں۔ سیاسی مسائل پر بھی انہوں نے بہت تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے پیشِ نظر خاص طور پر مسلم ممالک ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے بعض اصولی باتیں بھی چھیڑی ہیں' یہ مزید غور و فکر اور بحث و نظر کا تقاضا کرتی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علامہ قرضاوی کے یہاں عزیمت کی جگہ رخصت اور جواز کا پہلو غالب رہتا ہے۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جاسکتی کہ ہر شخص کے لیے عزیمت کی راہ اختیار کرنا آسان نہیں ہے۔ رخصت اور جواز کا ثبوت خود شریعت میں ہے۔ اگر حدود شریعت میں رخصت کی گنجائش فراہم کی جائے تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ بات غلط ہوگی کہ رخصت اور آسانی کی تلاش میں آدمی نصوص اور ان کے منشاء و مقصد کو نظر انداز کردے اور حدود شریعت سے تجاوز کرنے لگے۔ علامہ قرضاوی شریعت کے حدود سے آشنا ہیں۔ وہ دورِ حاضر کے متجددین کی طرح ان حدود کو توڑنے یا ان سے باہر قدم رکھنے کے روادار نہیں ہیں۔

علامہ یوسف القرضاوی کی تحریروں میں اجمال اور اختصار کی جگہ تفصیل اور

اِطناب پایا جاتا ہے۔ وہ جس مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہیں بڑی تفصیل سے کرتے ہیں۔ بعض مسائل میں ان سے مختلف اوقات میں اور مختلف گوشوں سے رجوع کیا گیا ہے اور ہر بار انہوں نے پوری تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مجموعہ فتاویٰ میں کہیں کہیں طوالت اور تکرار کا احساس ہوتا ہے۔ ترجمے میں یہ تکرار جہاں محسوس ہوئی' اسے بڑی حد تک حذف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سب کے باوجود یہ عالمِ اسلام کی ایک بڑی دینی شخصیت کے فتاویٰ ہیں اور بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ کسی مسئلے میں ان سے اختلاف بھی ہو تو ان کے دلائل غور و فکر کی دعوت ضرور دیتے ہیں۔ امید ہے کتاب کا اس حیثیت سے ان کے شایانِ شان استقبال ہوگا۔

سید جلال الدین عمری
دعوت نگر' نئی دہلی
یکم جنوری ۲۰۰۵ م

عرضِ مترجم

قارئین کرام! فتاویٰ یوسف القرضاوی (الفتاویٰ المعاصرۃ) کی دوسری جلد کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ موضوعات کی فہرست پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو اس کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا۔ آپ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ خود علاّمہ موصوف نے پہلی جلد کے مقابلے میں دوسری جلد کے ترجمے کی مجھے زیادہ تاکید کی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس دوسری جلد کا ترجمہ بھی اختتام پذیر ہوا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ قارئین اس سے کماحقہٗ استفادہ کر سکیں تاکہ ترجمہ کا مقصد پورا ہو۔

میں نے فتاویٰ یوسف القرضاوی کے پہلے حصے کی طرح دوسرے حصے میں بھی اپنی صلاحیت و استطاعت کی حد تک بھرپور کوشش کی ہے کہ ترجمے کی زبان آسان اور سلیس ہو تاکہ ایک عام قاری ہر بات بہ آسانی سمجھ سکے۔ حسبِ ضرورت طوالت سے بچنے کے لیے میں نے کم سے کم لفظوں میں بات مکمل کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی، وہاں قدرے تفصیل سے بات کو واضح کیا ہے۔

میری گزارش ہے کہ اس ترجمے کو صرف اس زاویے سے نہ دیکھا جائے کہ یہ کسی کتاب کا محض ایک ترجمہ ہے، بلکہ حقیقت میں یہ ایک عظیم مقصد کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ علاّمہ یوسف القرضاوی نے دینِ اسلام کو صحیح صحیح سمجھنے اور اس کی بنیادی اور اصولی تعلیمات کو اجاگر کرنے کے لیے وہی روش اختیار کی ہے، جو ہمارے سلفِ صالحین، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یا بعض دوسرے ائمہٗ حدیث و فقہ

اور سب سے بڑھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار کی تھی۔ قرآن مجید اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کا اصل مرجع وماٗخذ تھے۔ سلفِ صالحین نے جس طرح اپنے دور کے مسائل اور معاملات کو حل کرنے میں دین کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ اپنے دور کے تقاضوں اور انسانی ضرورتوں کی رعایت کی ہے' اسی طرح علامہ یوسف القرضاوی نے بھی جدید دور کے مسائل کو حل کرنے میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ نئے زمانے کی ضرورتوں' تقاضوں اور انسان کے اطراف وماحول کی رعایت رکھی ہے۔ اس بنا پر ان کے فتاویٰ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر کے مسلمانوں کو بھی علامہ موصوف کی علمی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرنا چاہئے۔ ہمارے یہاں فقہی مسائل میں عام طور پر جمود اور تعصب کا عنصر غالب رہتا ہے جو کہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ آپ اگر اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ جاننا چاہتے ہوں تو فتاویٰ یوسف القرضاوی کی پہلی جلد کے مقدمے پر ایک نگاہ ضرور ڈال لیں۔

میں چاہتا ہوں کہ علامہ موصوف کی تمام علمی کاوشیں اُردو میں منتقل ہو جائیں تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کو بھی اسلام کو اس کے اصل ماٗخذ سے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ ''فتاویٰ یوسف القرضاوی'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور میں اس سلسلے کی مزید تحریروں کو پیش کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس بات کی توفیق اور صلاحیت عطا فرمائے۔ آمین۔

والسلام

سید زاہد اصغر فلاحی

دوحہ' قطر

پہلا باب

قرآن اور حدیث

☆ قرآن شریف کا اِملا اور رسم الخط

☆ حدیث اور عقل و درایت

☆ حدیث ''بدأ الاسلام'' کا مطلب

☆ حدیث ''لاتقوم الساعۃ ......'' کی تشریح

☆ ایک حدیث پر اشکال

☆ صفائی ستھرائی اور احادیثِ رسول ﷺ

☆ حضور ﷺ اور جادو

قرآن شریف کا اِملا اور رسم الخط

سوال: قرآن کی طباعت اِملا کے مروّجہ طریقوں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً لفظ ''صلاۃ'' قرآن میں واؤ کے اضافہ کے ساتھ ''صلوٰۃ'' لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ ''ریاح'' اِملا کے مروّجہ طریقے سے ہٹ کر ''راتح'' لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں بے شمار الفاظ ایسے ہیں' جو اِملا کے عام طریقے سے کسی قدر مختلف لکھے جاتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان تمام الفاظ کو املا کے مروّجہ طریقے پر لکھا جائے تاکہ ان کا پڑھنا آسان ہو۔ ورنہ ایک عام قاری ان کے پڑھنے میں عموماً غلطی کر بیٹھتا ہے۔ کیا دوران تعلیم طلبہ کی آسانی کی خاطر بلیک بورڈ پر ان الفاظ کو اِملا کے عام طریقے پر لکھا جاسکتا ہے؟

جواب: قرآن کریم کی بے شمار خصوصیتوں میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ضمانت خود اپنے ذمّے لی ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کی حفاظت اللہ نے انسانوں کے ذمّے کی تھی اور وہ تمام کتابیں اپنی اصل حالت میں باقی نہ رہ سکیں۔ قرآن کریم چونکہ آخری آسمانی کتاب ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے کسی قسم کی ادنیٰ تحریف وتبدیلی سے محفوظ رکھنے کی ذمّے داری خود لے لی۔ ارشاد ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ○ (الحجر: ۹)

''اس (قرآن) کو ہم نے نازل کیا ہے اور اس کی حفاظت بھی خود ہم ہی کریں گے''۔

اس حفاظت کی خاطر اللہ تعالیٰ نے کچھ خاص انتظامات کیے مثلاً یہ کہ اللہ نے قرآن کریم کو قیامت تک کے لیے سینہ بہ سینہ محفوظ رکھنے کا انتظام فرمادیا' چنانچہ نبی کریم ﷺ کے عہد سے لے کر آج تک ہر دور میں قرآن کو مکمل حفظ کرنے کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے اور یہ سلسلہ ان شاء اللہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ ان انتظامات میں ایک یہ بھی ہے کہ

صحابہ کرام کے عہد ہی سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ الہامی توفیق بخشی کہ وہ اس عظیم الشان کتاب کی کتابت ہمیشہ اسی رسم الخط میں کریں' جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں کرائی تھی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے متفقہ طور پر اس رسم الخط کو پسند فرمایا اور اپنی منظوری دی۔ اس کے بعد اسی رسم الخط میں اس کی کتابت ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اسی وجہ سے اس رسم الخط کو رسم عثمانی یا خطِ عثمانی کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے ہر دور میں قرآنی الفاظ و آیات کی کتابت میں اسی رسمِ عثمانی کی پابندی کی ہے' تاکہ یہ الفاظ کی ظاہری شکل وصورت میں بھی قیامت تک اپنی اصل حالت میں محفوظ رہے۔ البتہ بعد کے دور میں اعراب کی ایجاد کے بعد آسانی کے لیے زبر' زیر' پیش اور نقطے لگائے گئے لیکن الفاظ کے رسم الخط میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

دورِ حاضر میں بعض حضرات اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ قارئین کی آسانی کے لیے قرآن کریم کی طباعت موجودہ دور کے رسم الخط پر ہو۔ لیکن میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ قرآن کو اسی خطِ عثمانی پر برقرار رکھا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا جو مکمل انتظام کر دیا ہے' وہ قیامت تک برقرار رہے اور لوگ یہ جان لیں کہ آج بھی ہم قرآن کو اسی صورت و شکل میں پڑھتے ہیں' جس شکل میں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ البتہ اگر کوئی استاد طلبہ کی آسانی کے لیے قرآن کی بعض آیتوں کو بلیک بورڈ پر آج کے مروّج طریقوں پر لکھتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ طلبہ پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ قرآن میں ان الفاظ کا املا اس سے مختلف ہے۔

نوٹ: اسی سوال سے ملتا جلتا ایک دوسرا سوال ہے' اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی طباعت کسی دوسری زبان کے رسم الخط مثلاً لاطینی وغیرہ میں جائز ہے یا نہیں؟ تاکہ دوسری زبان والے بھی قرآن کی تلاوت آسانی سے کر سکیں۔ پہلے سوال کے جواب کی طرح اس سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ قرآن کریم کو کسی قسم کی تحریف و تبدیلی سے محفوظ رکھنے

کے لیے ضروری ہے کہ اسے خطِ عثمانی ہی میں لکھا جائے۔ غور کریں کہ قرآن کو خطِ عثمانی کے علاوہ عربی کے کسی دوسرے خط میں لکھنا بھی مناسب نہیں ہے تو اسے کسی اور زبان میں لکھنا بدرجۂ اولیٰ مناسب نہیں ہوگا۔ قرآن کو اللہ نے عربی زبان میں نازل فرمایا ہے اور اس کی حفاظت کا تقاضا ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے عربی زبان ہی میں لکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿الزخرف:۳﴾

''ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے' تا کہ تم اسے سمجھ سکو''۔

مزید یہ کہ عربی زبان میں بے شمار ایسے الفاظ ہیں جنہیں اگر دوسری زبان میں لکھا جائے تو پڑھنے کے دوران ان کی صحیح ادائی ممکن نہیں ہوگی اور ظاہر ہے کہ قرآن کو الفاظ کی صحیح ادائی کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔ البتہ تعلیم و تدریس کی خاطر اور وہ بھی شدید ضرورت کی بنا پر اسے کسی دوسری زبان میں لکھنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

حدیث اور عقل و درایت

سوال: ہم چند احباب جو کہ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ الحمدللہ اکثریت دین داروں کی ہے۔ ہم میں بعض دینی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی۔ موضوع بحث وہ حدیثیں تھیں' جو موضوع اور گھڑی ہوئی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلامی تعلیمات کی غلط تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ ہم دوستوں میں سے اکثر اس بات پر متفق تھے کہ ہمیں کسی بھی حدیث کو قبول کرتے وقت اپنی عقل کا استعمال کرنا چاہئے' جو حدیث عقل کی کسوٹی پر پوری اترے اسے قبول کر لینا چاہئے اور جو حدیث عقل کی رُو سے ناقابلِ قبول ہو اسے رد کر دینا چاہئے۔ ہمارے بعض دوست اس رائے سے متفق نہیں تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ کسی بھی حدیث کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا معیار اس حدیث کی سند ہوتی ہے نہ کہ ہماری عقل۔ اگر ہماری ناقص عقل کسی حدیث کو سمجھنے سے قاصر ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اسے ضعیف اور موضوع قرار دیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ آپ ہمیں حدیث کے صحیح اور معتبر ہونے کے رہنما اصول اور ضوابط سے آگاہ کریں اور اس بات سے بھی کہ کسی حدیث کو قبول یا ردّ کرنے میں ہم اپنی عقل اور سمجھ کو کہاں تک استعمال کر سکتے ہیں؟

جواب: نہایت خوش آئند بات ہے کہ ہماری نوجوان نسل اپنی مجلسوں میں دینی مسائل پر گفتگو کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دین اور مذہب ہی اس کائنات کا سب سے اہم موضوع ہے۔ اس لیے کہ اس پر ہماری اُخروی اور لافانی زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ ہمارے جوان اور بوڑھے سب ہی دین کی اہمیت سے غافل نہ ہوں۔ جب کبھی جمع ہوں تو دُنیوی مسائل کے ساتھ ساتھ دینی امور پر بھی گفتگو کیا کریں۔ دینی مسائل پر گفتگو کرنا کوئی علماءِ کرام کی جاگیر نہیں ہے' بلکہ ہر مسلم پر فرض ہے کہ دین کے بارے میں اسے جتنا کچھ معلوم ہے اسے دوسروں کو بھی بتائے۔ تاہم یہ حقیقت بھی مسلّم ہے کہ ہر شخص علمی باریکیوں کا ادراک نہیں کر سکتا' اس لیے ضروری ہے کہ اہم اور دقیق علمی مسائل سے آگاہی کے لیے علماء و مشائخ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اللہ کا فرمان ہے:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (الانبیآء:۷)

''پس علم والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے ہو''۔

آپ نے جس اہم موضوع کے بارے میں سوال کیا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کا معیار کیا ہے؟ اس کی سند یا اس کا متن یا دونوں چیزیں؟ یہ ایک خالص علمی موضوع ہے اور اس سلسلے میں تشفی بخش جواب صرف وہی عالمِ دین دے سکتا ہے جسے علمِ حدیث پر اکمل دسترس حاصل ہو۔ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس موضوع کے تحت جید علماءِ حدیث نے جو کچھ اب تک لکھا ہے' اس کا خلاصہ میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

علماءِ حدیث نے صحیح حدیث کی مکمل اور جامع تعریف یوں کی ہے

ما اتصل سنده برواية عدل تام انضبط من اول السند الى منتهاه وسلم من الشذوذ والعلة

''صحیح حدیث وہ ہے جس کی سند شروع سے آخر تک متصل ہو' ایسے راوی کی روایت سے جو عدل ہو اور جس کی یادداشت مکمل ہو اور حدیث شذوذ اور سُقم سے پاک ہو''۔

عدل کا مفہوم یہ ہے کہ راوی نیک اور پرہیز گار شخص ہو' جو اپنے اقوال و افعال میں اللہ سے ڈرتا ہو' جسے آخرت کا خوف ہو' جھوٹ اور فریب سے پاک ہو' گناہ کبیرہ کا ارتکاب اور گناہ صغیرہ پر اصرار نہ کرتا ہو۔ سند راویوں کی اس کڑی یا اس سلسلے کو کہتے ہیں کہ جو آخری راوی سے شروع ہو کر اس صحابی تک پہنچتی ہے جنہوں نے حضور ﷺ کا قول یا عمل بیان کیا ہے۔ سند کے متصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ راویوں کی کڑی شروع سے آخر تک ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہو۔ اس سلسلے کی کوئی کڑی درمیان سے غائب نہ ہو۔ حدیث کا شذوذ سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث کسی زیادہ معتبر راوی کی روایت سے مختلف نہ ہو۔ اور سُقم حدیث کی سند یا اس کے متن کی اس باطنی کمزوری کو کہتے ہیں جسے صرف باریک بین عالمِ حدیث کی نظر ہی تلاش کر سکتی ہے۔

صحیح اور ضعیف حدیث کے درمیان تمیز کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز پر نظر کی جاتی ہے' وہ حدیث کی سند ہے۔ چنانچہ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کی سند متصل ہو اور اس سند کے تمام راوی عدل ہوں۔ اس لیے ان میں سے فرداً فرداً ہر ایک راوی کی مکمل شخصیت سے واقفیت ضروری ہے۔ کسی صحابی کے عدل ہونے کے لیے اس کا صحابی ہونا کافی ہے۔ کیونکہ قرآن و حدیث کے مطابق تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عدل ہیں۔ سند کی کڑی میں کسی ایک راوی کا ضعیف ہونا پوری حدیث کو ضعیف بنا دیتا ہے۔ خواہ اس کے علاوہ باقی روایت کرنے والے مکمل عدل ہوں۔ خواہ یہ راوی اپنے اخلاق و کردار کی وجہ سے ضعیف ہو یا یادداشت کی کمزوری کی وجہ سے۔ اگر

حدیث کی سند متصل نہ ہو اور راویوں کی کڑی میں سے کسی ایک راوی کا نام غائب ہو تو ایسی حدیث بھی ضعیف قرار دی جاتی ہے۔

عام طور پر علماءِ حدیث کا یہ مسلک رہا ہے کہ صحیح اور ضعیف حدیث میں تمیز کی خاطر انہوں نے حدیث کے متن (مضمون کے مقابلے میں سند) پر زیادہ توجہ دی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے متن کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ جیسا کہ بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علماءِ حدیث نے محض حدیث کے متن اور مضمون کے ناقابلِ قبول ہونے کی وجہ سے بے شمار حدیثوں کو ضعیف اور موضوع قرار دیا ہے۔ متن اور مضمون کی بنیاد پر کسی حدیث کو ضعیف قرار دینے کی درج ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) حدیث کا مضمون بیہودہ اور لایعنی باتوں پر مشتمل ہو۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''بیگن ہر بیماری کا علاج ہے'' یا یہ حدیث کہ ''دال کی قدوسیت ستر نبیوں کی زبان پر ہے'' ظاہر ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی زبان سے اس طرح کی لایعنی اور لغو باتیں نہیں نکل سکتیں۔

(۲) حدیث صریح عقل کیخلاف ہو اور اس میں کسی ایسی بات کا تذکرہ ہو جسے عقلِ سلیم قبول کرنے سے انکار کرے۔

(۳) حدیث میں کوئی ایسی بات ہو جو قرآن اور دوسری صحیح احادیث سے ثابت شدہ اصول کیخلاف ہو۔

(۴) حدیث میں کسی ایسی بات کا ذکر ہو جو تجربہ کے ذریعے ثابت اور مسلّم حقیقت کے خلاف ہو۔

(۵) حدیث کسی ثابت شدہ تاریخی حقیقت سے مختلف ہو۔

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ''کسی نے خوب کہا ہے کہ جب تم کسی حدیث کو عقلِ سلیم یا قرآن وسنّت کی اصولی باتوں کے خلاف پاؤ تو جان لو کہ یہ حدیث من

گھڑت ہے''۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح حدیث کی سند پر بحث و تحقیق ضروری ہے اسی طرح حدیث کے متن اور مضمون پر بھی تحقیق ضروری ہے' تا کہ وہ حدیث جسے عقلِ سلیم قبول نہ کرے یا قرآن وسنّت کی اصولی باتوں سے ٹکراتی ہو' اسے ضعیف قرار دیا جا سکے۔ تاہم عقل کی بنیاد پر مضمون کو قبول یا رد کرنے کی عظیم الشان ذمّے داری صرف ماہر علماءِ حدیث ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ کسی صورت میں مناسب نہیں ہے کہ ہر شخص کسی بھی حدیث میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے اور اس کی عقل اس حدیث کو قبول نہ کرتی ہو تو اسے ماننے سے انکار کر دے۔ اس لیے کہ بسا اوقات بعض حضرات اپنی ناقص عقل کی بنیاد پر کسی صحیح اور معتبر حدیث کو ضعیف قرار دینے میں نہایت جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں' لیکن تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کی اپنی عقل ہی ناقص ہے' ورنہ حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے عقلِ سلیم قبول نہ کر سکے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حدیث میں کسی ایسی بات کا تذکرہ ہوتا ہے' جس کا وقوع پذیر ہونا بہ ظاہر ناممکن اور محال نظر آتا ہے اور اس بنا پر بعض ناقص العقل حضرات اس حدیث کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ جس بات کو ناممکن اور محال سمجھ رہے ہوتے ہیں عقلاً وہ چیز ناممکن اور محال نہیں ہوتی۔

بعض لوگ کسی صحیح اور معتبر حدیث کو اس لیے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں کہ یہ کسی ثابت شدہ سائنسی حقیقت کےخلاف ہے۔ حالانکہ وہ جس سائنسی حقیقت کو ثابت شدہ اور مسلّم سمجھ رہے ہوتے ہیں کچھ سالوں کے بعد پتہ چلتا ہے کہ حقیقت یہ نہیں' بلکہ اس کے برعکس ہے[1] جیسا کہ ڈارون کے نظریے کو پہلے ایک سائنسی حقیقت حاصل تھی۔ بعد میں خود سائنس دانوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ بعض لوگ کسی صحیح اور معتبر حدیث کو اس بنا پر رد کر دیتے

---

[1] جیسا کہ پہلے سائنس دانوں کا دعویٰ تھا کہ سورج حرکت نہیں کرتا ہے اور اپنی جگہ ساکت ہے۔ یہ نظریہ قرآن کے نظریہ کےخلاف ہے۔ چند سالوں کے تجربہ کے بعد سائنسدانوں نے اپنے پہلے نظریے کو غلط قرار دیتے ہوئے قرآنی نظریہ کی تصدیق کر دی کہ سورج متحرک ہے۔

ہیں کہ یہ حدیث کسی قرآنی آیت یا کسی اور صحیح حدیث کیخلاف ہے۔ حالانکہ غور کیا جائے تو ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ سارا قصور ان حضرات کے اپنے ناقص فہم کا ہوتا ہے۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ متن اور مضمون کی بنیاد پر کیا کسی حدیث کو ضعیف قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے کچھ اصول و قواعد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''یہ ایک عظیم سوال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ متن کی بنیاد پر کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینے کا حق دار صرف وہی عالمِ حدیث ہے، جس کے گوشت پوست میں حدیث کا ادراک رچ بس گیا ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور ان کی تعلیمات پر اس کی گہری نظر ہو اور جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند و ناپسند اور ان رجحانات و میلانات کا ایسا شعور ہو کہ وہ کسی حدیث کو محض سن کر یہ فیصلہ کر دے کہ یہ بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہو سکتی ہے یا نہیں''۔ اس کے بعد علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے چند ضعیف احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ عالمِ حدیث ان احادیث کے مضمون کو پڑھ کر بہ خوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہ احادیث من گھڑت ہیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''جس نے سبحان اللہ و بحمد اللہ کہا' اللہ اس کے لیے جنت میں کھجور کے ایسے کروڑوں درخت لگائے گا جن کی جڑیں سونے کی ہوں گی''۔ اس طرح کی من گھڑت حدیثوں کو بیان کرنے کے بعد علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف اور موضوع احادیث کو سمجھنے کے لیے چند اصول اور ضوابط بنائے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

(۱) حدیث کا ایسی مبالغہ آرائیوں پر مشتمل ہونا جن کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کو زیب نہیں دیتا۔ اور اس طرح کی حدیثیں بے شمار ہیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''جس نے لا الہ الا اللہ کہا اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کلمہ طیبہ کے عوض ایک ایسا پرندہ تخلیق کرے گا، جس کی ستر ہزار زبانیں ہوں گی۔ ہر زبان کی ستر ہزار بولیاں ہوں گی' جو اس بندے کے لیے دعائے مغفرت کریں گی۔ اور جس نے فلاں فلاں کام کیے اسے جنت میں ستر ہزار شہر دیے جائیں گے ہر شہر میں ستر ہزار محل ہوں

گے اور ہر محل میں ستر ہزار حوریں ہوں گی''۔اس طرح کی جھوٹی احادیث وضع کرنیوالے یا تو غایت درجہ جاہل لوگ ہوتے ہیں یا پھر انکا مقصد اہانتِ رسول ہوتا ہے۔نعوذ باللہ من ذٰلک۔

(۲) حدیث میں ایسی باتوں کا تذکرہ' جو تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت شدہ حقائق کے خلاف ہیں۔مثلاً یہ حدیث کہ ''بیگن ہر مرض کی دوا ہے'' یا یہ حدیث کہ ''بات کرنے کے دوران جب کوئی شخص چھینکے تو یہ اس کے سچ ہونے کی علامت ہے'' یا یہ حدیث کہ ''دال کھایا کرو کیونکہ دال دل کو نرم بناتی ہے اور آنسو میں اضافہ کرتی ہے'' ظاہر ہے کہ یہ تمام حدیثیں من گھڑت اور حقیقت و تجربہ کیخلاف ہیں۔اس لیے کہ نہ تو بیگن ہر مرض کی دوا ہے (بلکہ یہ بہ ذات خود بہت ساری بیماریوں کا سبب ہے) اور نہ چھینک ہی سچائی کی علامت ہے' کیونکہ یہ بات ہمارے آئے دن کے مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ بہت سارے جھوٹے لوگ بھی بات کے دوران چھینکتے ہیں۔

(۳) حدیث میں ایسی باتوں کا تذکرہ' جو لوگوں کے مذاق اور استہزاء کا موضوع بن جائیں۔مثلاً یہ کہ ''اگر چاول آدمی کی شکل کا ہوتا تو بڑا نرم دل ہوتا' اسے جو بھی کھاتا شکم سیر ہو جاتا وغیرہ۔اس قسم کی مضحکہ خیز باتیں حضور ﷺ کا کلام نہیں ہو سکتیں۔

(۴) حدیث میں ایسی باتوں کا تذکرہ جو قرآن اور سنتِ مطہرہ کی واضح تعلیمات کیخلاف ہوں۔چنانچہ ہر وہ حدیث جو ظلم وفساد یا لغو باتوں پر مشتمل ہو' صحیح حدیث نہیں ہو سکتی۔اسی طرح وہ حدیث جو باطل کی مدح سرائی کرے یا حق کو جھٹلائے' صحیح حدیث نہیں ہو سکتی۔مثلاً یہ حدیث کہ ''جس نے محمد یا احمد نام رکھا' وہ جہنم میں نہیں جا سکتا''۔

اس حدیث کے من گھڑت ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔اس لیے کہ قرآن و

حدیث کی واضح تعلیمات کے مطابق صرف نام اور القاب کی بنا پر جہنم سے نجات نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس کے لیے ایمان اور نیک اعمال ضروری ہیں۔ اس جیسی بے شمار من گھڑت احادیث ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی نیکیوں پر جہنم سے نجات کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ یہ بات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

(۵) وہ حدیث جو باطل ہو' مثلاً یہ حدیث کہ ''آسمان میں کہکشاں اس سانپ کی رگ ہے' جو عرش کے نیچے رہتا ہے''۔ اور یہ حدیث کہ ''اللہ جب غصہ کی حالت میں ہوتا ہے تو فارسی میں وحی نازل کرتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو عربی میں نازل کرتا ہے''۔ وغیرہ

(۶) حدیث میں ایسی بات ہو جو نبی ﷺ کے شایانِ شان نہ ہو' مثلاً یہ حدیث کہ ''تین چیزیں آنکھ کی روشنی بڑھاتی ہیں' ہریالی کی طرف دیکھنا' بہتے ہوئے پانی کو دیکھنا اور خوبصورت چہرے کو دیکھنا''۔

(۷) جس حدیث میں یہ دعویٰ ہو کہ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں کوئی بات کہی یا کوئی کام کیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے متفقہ طور پر اسے لوگوں سے پوشیدہ رکھا ہو۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''حضور ﷺ حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر علی ابنِ ابی طالب کا ہاتھ پکڑ کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس تشریف لائے اور علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے سامنے کھڑا کیا تاکہ سارے لوگ انہیں پہچان جائیں اور فرمایا کہ یہ میرا بھائی اور وارث ہے اور میرے بعد یہی میرا خلیفہ ہے۔ تم اس کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا'' صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور ﷺ کی یہ بات سنی لیکن متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ یہ بات لوگوں سے پوشیدہ رکھنی چاہیے۔

(۸) جس حدیث میں علاج و معالجے سے متعلق خلافِ عقل باتیں ہوں۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''جبریل علیہ السلام میرے پاس جنت سے ہدیہ لے کر آئے' جب میں نے اسے کھایا تو مجھے ہم بستری کے لیے چالیس مردوں کی قوت عطا کی گئی'' یا یہ کہ ''مومن شیریں

ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے''۔

(۹) جس حدیث میں دن اور تاریخ کی تحدید کے ساتھ کوئی بات کہی گئی ہو مثلاً یہ کہ جب محرم کے مہینے میں چاند گرہن ہوتا ہے تو مہنگائی بڑھتی ہے اور جنگیں ہوتی ہیں''۔

(۱۰) جس حدیث میں پھوہڑ اور بھدی زبان استعمال کی گئی ہو۔ مثلاً یہ کہ ''چار چیزیں چار چیزوں سے شکم سیر نہیں ہوتیں: عورت مرد سے' زمین بارش سے' آنکھ دیدار سے اور کان اخبار سے۔ اسی طرح وہ احادیث جن میں حبشیوں اور کالوں کی مذمت ہو' صحیح نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً یہ کہ ''حبشی جب شکم سیر ہوتا ہے تو زنا کرتا ہے اور جب بھوکا ہوتا ہے تو چوری کرتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام احادیث جن میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل کے بیان میں مبالغہ آرائی ہو' صحیح احادیث نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً یہ کہ ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کیلئے جلوہ افروز ہوگا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے خصوصی طور پر' یا یہ کہ ''اگر میں عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل عمرِ نوح تک بیان کروں تو یہ فضائل ختم نہیں ہوں گے۔ اور عمر رضی اللہ عنہ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہیں''۔

اس پوری تفصیل کے بعد یقینی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علماءِ حدیث نے جس طرح احادیث کی سند میں بے انتہا بحث و تحقیق کی ہے' اسی طرح انہوں نے احادیث کے متن اور مضمون کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ کسی بھی حدیث کو قبول کرنے اور اسے صحیح اور معتبر ماننے کے لیے صرف اس کی سند کا مذکورہ معیار کے مطابق ہونا کافی ہے' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ سند کی طرح اس کا مضمون بھی قابلِ اعتراض نہ ہو۔

حدیث ''بدأ الاسلام'' کا مطلب

سوال: ایک مشہور حدیث ہے:

بدأ الاسلام غریباً و سیعود غریبا کما بدأ فطوبی للغرباء

''اسلام شروع میں اجنبی تھا اور دوبارہ اجنبی بن جائے گا جیسا کہ پہلے تھا۔ پس خوشخبری ہے اجنبیوں کے لئے''۔

یہ حدیث اگر صحیح ہے تو اس کا کیا مفہوم ہے؟ کیا لفظ ''غربت'' غرابت سے ماٴخوذ ہے، جس کا مفہوم ہے انوکھا پن۔ یا لفظ ''غربت'' سے ماٴخوذ ہے جس کا مفہوم ہے اجنبیت۔ اگر لفظ ''غریب'' غربت سے ماٴخوذ ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اسلام کمزور ہو جائے گا اور اس کا ستارہ غروب ہو جائے گا؟ کیا قرآن وحدیث میں اس بات کے دلائل ہیں کہ اسلام ایک بار پھر طاقتور اور فاتح بن کر اُبھرے گا جیسا کہ قرونِ اولیٰ میں تھا۔

جواب: یہ حدیث متفقہ طور پر صحیح اور بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے۔ اس کا ذکر مسلم شریف وسنن ترمذی کے علاوہ ابنِ ماجہ اور طبرانی میں بھی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ وہ احادیث جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہوتا ہے، یا جن میں آخری زمانے کی علامتیں بیان ہوتی ہیں، اکثر پڑھنے والے انہیں پڑھ کر مایوسی کے غار میں چلے جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ اب تو بڑا خراب زمانہ آ گیا ہے اور اس پُر آشوب زمانے میں معاشرے کی اصلاح کا کوئی امکان نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو مایوسی اور بے عملی کی تعلیم دی ہو یا ہمیں یہ سکھایا ہو کہ دنیا میں فساد اور بُرائیوں کے عام ہو جانے کے باوجود ہم اصلاحِ معاشرہ کی طرف سے مایوس ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں۔ اس کے برعکس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ہم آخری لمحوں تک بلکہ آخری سانس تک عمل، کوشش اور جدوجہد کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ایک مشہور حدیث کا مفہوم ہے کہ اگر قیامت شروع ہو جائے اور ہم میں سے کسی کے ہاتھ میں ایک پودا ہے جسے وہ لگانا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ مرنے سے قبل اسے لگا دے۔ قابلِ غور بات ہے کہ دُنیوی

معاملات میں حضور ﷺ نے آخری لمحے تک عمل کا حکم دیا ہے تو دینی معاملات میں مایوسی اور بے عملی کا حکم کیسے دے سکتے ہیں؟

اب آیئے لفظ "غریب" کے مفہوم کا تعین کریں یہ لفظ غربت سے مأخوذ ہے نہ کہ غرابت سے، اور اس بات کی دلیل، خود اس حدیث کا آخری جملہ ہے "فطوبی للغرباء" لفظ "غرباء" اس غریب کی جمع ہے جو غربت سے مأخوذ ہے۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام اجنبی بن کر آیا تھا اور پھر اجنبی بن جائے گا۔ پس خوشخبری ہے ان لوگوں کے لئے، جو اجنبی ہوں گے۔ وہ اجنبی اپنی شخصیت کی وجہ سے نہیں ہوں گے بلکہ اس اسلام کی وجہ سے ہو جائیں گے جو کہ خود اجنبی بن چکا ہوگا۔

یہ امرِ واقعہ ہے کہ دورِ حاضر میں اور اس سے قبل بھی اسلام اس حال کو پہنچ چکا ہے کہ لوگ اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ لوگ صحیح اسلام کو نہیں جانتے ہیں اور جو تھوڑے سے لوگ صحیح اسلام کو جانتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں، وہ لوگ معاشرے میں نکو اور اجنبی بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات انہیں معاشرے اور اصحابِ اقتدار کی طرف سے ظلم و اذیت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ دراصل مذکورہ حدیث میں بشارت انہیں مؤمنین صالحین کے لیے ہے، جو ایسے دور میں بھی حق پر جمے رہتے ہیں، جبکہ باطل کی ریشہ دوانیوں کیوجہ سے اسلام معاشرے میں بے نام، اجنبی اور باعثِ ذلت بن جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اجنبت دائمی اور عالمی ہوگی؟ یا وقتی اور علاقائی؟

میری اپنی رائے یہ ہے کہ یہ اجنبیت دائمی نہیں ہوگی۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ اسلام پر جب اجنبیت کا دور آئے گا تو قیامت تک کے لیے برقرار رہے گی۔ قیامت تک اسلام اور مسلمان کمزور اور بے وقعت رہیں گے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ اس دور کے شروع ہو جانے کے بعد اسلام دنیا کے ہر گوشے میں اجنبی اور بے وقعت ہو کر رہ جائے گا، بلکہ بعض علاقے اور ممالک ایسے بھی ہوں گے، جہاں اسلام اور اہلِ اسلام باعزت اور طاقتور ہوں گے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ اسلام اور اہلِ اسلام پر اجنبیت اور بے وقعتی کا دور آتا جاتا رہے گا۔ جیسا کہ تمام مذاہب اور ملتوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ یہی اللہ کی سنّت اور طریقۂ کار ہے۔ اللہ کی سنّت کبھی تبدیل نہیں ہوتی اور نہ قوموں اور ملتوں کو دو پیمانوں سے ہی ناپتی ہے۔ اللہ کی سنّت سب کے لیے ایک جیسی ہے۔ اللہ کی سنّت ہے کہ ہر مذہب وملت پر عروج وزوال آتا جاتا رہے گا۔ اور یہی معاملہ اسلام کے ساتھ بھی ہوگا۔

اس حدیث میں محض یہ پیشگوئی ہے کہ اسلام پر کبھی ایسا دور بھی آئے گا' جب اسلام بے وقعت' کمزور اور گم نام ہو کر رہ جائے گا۔ اس میں اس بات کا ذکر کہیں بھی نہیں ہے کہ تا قیامت اسلام اسی طرح بے وقعت اور کمزور رہے گا۔ اور نہ اس حدیث میں اس بات کی ہی تعلیم ہے کہ حضور ﷺ کی پیشگوئی کی وجہ سے مقدر سمجھ کر ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہیں۔ بلکہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں کامیاب اور جنتی وہ لوگ ہوں گے جو اسلام کی قوت وعظمت کی بحالی اور اس کے اقتدار کو واپس لانے کے لیے کمربستہ ہو جائیں گے۔ بعض روایتوں میں ''غرباء'' کی تشریح فرماتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اصلاحِ معاشرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور بُرائیوں کو دور کرنے کی کوشش میں لگ جائیں گے۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ''غرباء'' کی یہ قلیل سی تعداد مایوس ہو کر گھر بیٹھ جانے والوں میں سے نہیں ہوگی' بلکہ یہ لوگ قوم وملت کے معمار ہوں گے اور اسلام کی عظمت ورفعت واپس لانے کے لیے حد درجہ جدوجہد کرنے والے ہوں گے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ کسی نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ یہ ''غرباء'' کون ہیں' جن کے لیے بشارت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اَلَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ اِذَا فَسَدَ النَّاسُ'' یہ وہ لوگ ہوں گے کہ جب لوگ بگڑ چکے ہوں گے تو ان میں اصلاح کا کام کریں گے''۔

ایک دوسری روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''نَاسٌ صَالِحُوْنَ فِیْ نَاسٍ کَثِیْرٍ'' ''بہت سارے لوگوں کے درمیان یہ تھوڑے سے نیک اور صالح لوگ ہوں گے''۔

اس توضیح سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث مایوسی اور بے عملی کی دعوت نہیں دیتی نہ اس میں اس بات کی ہی پیشین گوئی ہے کہ اسلام کا ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو جائے گا۔ بلکہ محض اس بات کا بیان ہے کہ اسلام پر ایسا دور بھی آئے گا' جب اسلام اور اہلِ اسلام اجنبی اور کمزور بن کر رہ جائیں گے لیکن بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو اجنبیت اور بے وقعتی کے اس دور میں اصلاحِ معاشرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا قرآن وسنّت میں اس بات کے دلائل ہیں کہ اسلام کو ایک بار پھر قوت وغلبہ نصیب ہوگا؟ تو آپ جان لیں کہ قرآن وسنّت میں اس کے بہت سے دلائل ہیں۔

ارشادِ الٰہی ہے:

هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ ○ (التوبۃ:۳۳)

''وہ اللہ ہی ہے' جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے' تا کہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو''۔

اسی مفہوم کی دوسری آیتیں سورۂ فتح اور سورۂ صف میں بھی ہیں۔ احادیث میں اسلام کے دوبارہ غالب آنے کی بہت سی بشارتیں ہیں۔ میں صرف چند کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

حدیثِ نبوی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ اَیْ جَمَعَهَا وَضَمَّهَا فَرَاَیْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُهَا مَازُوِیَ لِیْ مِنْهَا۔

''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو لپیٹا تو میں نے اس کے مشرق ومغرب

کو دیکھا۔ میری اُمت کی بادشاہت زمین کے ان تمام حصوں پر ہوگی جو مجھے لپیٹ کر دکھائے گئے"۔

اس حدیث میں اس بات کی بشارت ہے کہ اُمت مسلمہ کی بادشاہت اس روئے زمین کے مشرق ومغرب میں پھیل جائے گی۔ ابھی یہ پیشین گوئی مکمل طور سے پوری نہیں ہوئی ہے اور ہم سب اس دور کے انتظار میں ہیں جب یہ پیشین گوئی مکمل طور پر پوری ہوگی اور اسلام طاقتور بن کر پوری دنیا میں حکمرانی کرے گا۔ ابنِ حبان کی صحیح حدیث ہے:

لَيَبْلُغَنَّ هٰذَا الْاَمْرُ يَعْنِي الْاِسْلَامَ مَابَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَلَا يَتْرُكُ اللّٰهُ بَيْتَ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ هٰذَاالدِّيْنَ بِعِزِّ عَزِيْزًا وَيُذِلُّ ذَلِيْلٍ عِزًّا يُعِزُّ اللّٰهُ بِهِ الْاِسْلَامَ وَذَلًا يُذِلُّ اللّٰهُ بِهِ الْكُفْرَ۔ (ابنِ حبان)

"یہ معاملہ یعنی اسلام دنیا کے اس کونے تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک رات اور دن پہنچتا ہے۔ اور اللہ کسی بھی گھر کو نہ چھوڑے گا مگر یہ کہ اس میں اس دین کو داخل کرے گا۔ طاقتور کی طاقت کے ذریعہ اور کمزور کی کمزوری کی وجہ سے۔ ایسی طاقت، جس کے ذریعے اللہ اسلام کو مضبوط بنائے گا اور ایسی ذلت وکمزوری، جس کے ذریعے اللہ کفر کو ذلیل وکمزور کرے گا"۔

اگر پہلی حدیث میں اسلامی حکومت کے مشرق ومغرب میں پھیلنے کی بشارت ہے تو دوسری حدیث میں دینِ اسلام کے پھیلنے کی بشارت ہے۔

ایک اور حدیث ہے، جس میں یورپ تک اسلامی حکومت کے پہنچنے کی خوشخبری ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ نَكْتُبُ اِذْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَيُّ الْمَدِيْنَتَيْنِ تُفْتَحُ اَوَّلًا۔ قُسْطُنْطِيْنَةُ اَوْرُوْمِيَةُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَدِيْنَةُ هِرَقْلَ تُفْتَحُ اَوَّلًا۔ (مسند احمد، حاکم)

''عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے کہ کسی نے پوچھا کہ اے رسول اللہ! قسطنطنیہ اور روم میں سے کون سا شہر پہلے فتح ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ہرقل کا شہر یعنی قسطنطنیہ پہلے فتح ہوگا''۔

قسطنطنیہ یا استنبول تو پہلے ہی (۱۴۵۳ء میں) ترکی خلیفہ محمد بن الفاتح کے ہاتھوں فتح ہو چکا ہے۔ اب اٹلی کی راجدھانی روم کی باری ہے اور ہمیں یقین ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق کبھی نہ کبھی یہ شہر بھی اسلامی حکومت کے دائرۂ اختیار میں آئے گا اور یہ وہ وقت ہوگا جب اسلام طاقتور بن کر دوبارہ یورپ میں داخل ہوگا۔

الحمدللہ اسلام کے غلبہ کی علامتیں اب ظاہر ہونے لگی ہیں۔ اسلامی بیداری کی لہر ہر طرف سے اٹھ رہی ہے۔ غیر مسلموں میں بھی اسلام سے واقفیت کا جذبہ اُبھر رہا ہے۔ اور مسلمان بھی رفتہ رفتہ بدعات وخرافات کے چکروں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ وہ جابر وفاسق نظامِ حکومت نیست و نابود ہو رہے ہیں' جنہوں نے اسلام پر پابندی لگا رکھی تھی اور مسلمانوں کو بزورِ طاقت اسلام سے دور کر رکھا تھا۔ مثال کے طور پر کمیونزم کا جنازہ نکل چکا ہے اور بہت سارے ایسے مسلم ممالک آزاد ہو چکے ہیں' جہاں پر پہلے کمیونزم نے اسلام پر پابندی لگا رکھی تھی' بلکہ ہر اسلامی شناخت کو ختم کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ جو حال کمیونزم کا ہوا ہے ان شاء اللہ وہی حال ان تمام نظام ہاءِ حکومت کا بھی ہوگا' جو اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے۔ بشرطیکہ اُمت مسلمہ میں ایسے ''غرباء'' اٹھ کھڑے ہوں جنہیں مذکورہ حدیث میں بشارت دی گئی ہے۔ اُمت مسلمہ میں جب ایسے غرباء پیدا ہوں گے تو یقیناً اسلام کو فتح ونصرت اور غلبہ حاصل ہوگا اور وہ ہوگا جو اللہ نے فرمایا ہے:

وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ بِنَصْرِ اللَّهِ (الروم:۴)

''اس دن مسلمان اللہ کی نصرت ومدد سے خوش ہو جائیں گے''۔

حدیث ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةَ'' کی تشریح

سوال: حدیثِ نبوی ہے:

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تُقَاتِلُوا الْیَهُوْدَ فَیَخْتَبِی الْیَهُوْدِیُّ وَرَاءَ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ فَیَقُوْلُ الْحَجَرُ وَالشَّجَرُ یَا عَبْدَ اللّٰهِ یَا مُسْلِمُ هٰذَا یَهُوْدِیٌّ وَرَائِیْ فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ۔

''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تمہاری یہودیوں سے جنگ نہ ہوگی۔ اس جنگ میں یہودی کسی پتھر یا پیڑ کے پیچھے چھپ جائے گا تو پتھر اور پیڑ بھی بول پڑیں گے کہ اے مسلم! اے اللہ کے بندے ادھر میرے پیچھے ایک یہودی ہے۔ آؤ اور اسے قتل کرو''۔

میرا سوال یہ ہے کہ اس حدیث کی رُو سے کیا یہودیوں کے ساتھ ہماری جنگ قیامت تک جاری رہے گی؟ کیا واقعی پیڑ اور پتھر حقیقت میں بولیں گے؟ کیا یہ سب کچھ مسلمانوں کی عزت افزائی کے لیے ہوگا؟' کیا آج کے مسلمان اس عزت افزائی کے اہل ہیں؟ یا اس کی حقدار ہماری آئندہ نسلیں ہوں گی؟

جواب: مذکورہ حدیث کی روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور یہ متفقہ طور پر صحیح حدیث ہے۔ بخاری و مسلم شریف کی عبارت یوں ہے:

لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تُقَاتِلُوا الْیَهُوْدَ حَتّٰی یَقُوْلُ الْحَجَرُ وَرَاءَهٗ الْیَهُوْدِیُّ یَا مُسْلِمُ هٰذَا یَهُوْدِیٌّ وَرَائِیْ فَاقْتُلْهُ

''اس وقت تک قیامت نہیں برپا ہوگی جب تک یہودیوں سے تمہاری جنگ نہ ہو۔ حتیٰ کہ اس جنگ میں جس پتھر کے پیچھے یہودی چھپا ہوگا وہ بھی بول پڑے گا کہ اے مسلم میرے پیچھے یہودی ہے اسے قتل کردو''۔

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کی ہے۔ اس پیشین گوئی کو کئی صدیاں

گزر چکی ہیں اور آج کا مسلمان اس حدیث کو پڑھ کر عجیب صورتِ حال سے دوچار ہو جاتا ہے، جب وہ یہ سوچتا ہے کہ یہودیوں کی طاقتور پوزیشن اور مسلمانوں کی ابتر صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ پیشین گوئی کیوں کر شرمندۂ تعبیر ہوسکتی ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالیے تو پتہ چلتا ہے کہ جب ساری دنیا نے یہودیوں کو ٹھکرا دیا اور انہیں اپنے ظلم کا نشانہ بنایا اور کسی نے بھی انہیں پناہ نہیں دی تو اسلام اور اہلِ اسلام کے آغوش میں انہیں پناہ ملی۔ مسلمان انہیں اپنے ملکوں میں لائے، انہیں بسایا اور مکمل مذہبی آزادی عطا کی۔ کیونکہ مسلمانوں کی نظر میں یہ اہلِ کتاب ہیں۔

ماضی کا مسلمان حیران تھا کہ اس قوم سے ہماری جنگ کیسے ہوسکتی ہے، جسے ہم نے پناہ دی ہے۔ آخر کہاں سے اسے قوت و طاقت نصیب ہوگی کہ ہمارے مقابلے میں آ کر وہ جنگ کرسکے۔ لیکن اس کے باوجود جنگ کا آغاز ہوگیا۔ یہ جنگ اس دن سے شروع ہوگئی جب یہودیوں نے فلسطین اور مسجد اقصیٰ پر غاصبانہ تسلّط قائم کرلیا۔ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا اور فلسطین کی سرزمین پر یہودی حکومت و مملکت کی بنیاد ڈال دی۔

لیکن وہ جنگ جس کی پیشین گوئی اس حدیث میں ہے اور جس میں مسلمانوں کو یہودیوں پر فتح حاصل ہوگی، ہمیں پورا یقین ہے کہ لامحالہ وہ جنگ شروع ہوگی۔ لیکن کب شروع ہوگی اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ ہمارے لیے اہم بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کی خبر کے مطابق کبھی نہ کبھی یہ جنگ شروع ہوگی۔ یہ جنگ نہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر ہوگی اور نہ زمین اور حدود کے لیے ہوگی۔ بلکہ یہ جنگ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک مذہبی جنگ ہوگی۔ یہ جنگ یہودیوں، فلسطینیوں یا مصریوں کے درمیان نہیں ہوگی، بلکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوگی۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ یہودی قوم چاہے دنیا کے کسی کونے میں ہو، متحد ہوکر اور اپنی تمام تر قوت و طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے مسلمانوں کیخلاف برسرِ پیکار

ہے۔ اس راہ میں وہ اپنا مال بھی خرچ کر رہی ہے' حالانکہ وہ دنیا کی بخیل ترین قوم ہے۔ وہ اپنی جانیں بھی قربان کر رہی ہے' جبکہ انہیں اپنی جان بہت عزیز ہے۔ وہ انتہائی سنجیدگی اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس نے اپنی جنگ کی بنیاد اپنی مذہبی کتاب توریت وتلمود پر رکھی ہے۔ اور اس کی تمام تر جدوجہد اپنے مذہب کی سربلندی کے لیے ہے۔ اس کے برعکس ہم مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ یہودیوں کے ساتھ اس معرکہ آرائی میں اسلام کا کوئی نام ونشان نہیں ہے۔ ہمارے اربابِ اقتدار اس جنگ کو قومیت اور زمین کی بنیاد پر لڑنا چاہتے ہیں' جس میں دین و مذہب کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ یہودی تو اس جنگ کو یہودیت کی بنیاد پر لڑ رہے ہیں اور ہم اس جنگ میں اسلام کا نام لیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ وہ یہودیت کی بنیاد پر ساری دنیا سے ہجرت کر کے اسرائیل میں اکٹھا ہو رہے ہیں اور ہم ایک جگہ اکٹھا ہونے کے باوجود اسلام کے نام پر متحد نہیں ہو رہے ہیں۔ وہ اس جنگ کو موسیٰ کے نام پر لڑ رہے ہیں اور ہم اس جنگ میں محمد ﷺ کا نام لیتے ہوئے بھی شرماتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی تردّد نہیں کہ اس جنگ میں یہودیوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے رویے اور طرزِ جنگ کو بدلنا ہوگا۔ ہمیں بھی اس انداز میں مذہب کی بنیاد پر جنگ لڑنی ہوگی جس طرح وہ ہمارے ساتھ جنگ لڑ رہے ہیں۔

یہ حدیث جو ہمیں یہودیوں پر فتح کی بشارت سناتی ہے' یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ کون خوش نصیب مسلمان ہوں گے' جنہیں یہ فتح حاصل ہوگی۔ ان کے اوصاف کیا ہوں گے اور وہ کس طرز کی جنگ لڑیں گے۔ یہ اوصاف حدیث کے الفاظ میں یوں ہیں ''عبداللہ'' یعنی اللہ کا بندہ اور ''مسلم'' وہ اللہ کے بندے ہوں گے' مال و دولت اور جاہ وکرسی کے نہیں۔ وہ مسلم ہوں گے یعنی اس جنگ کو اسلام کی بنیاد پر لڑیں گے۔ عربیت اور وطنیت کی بنیاد پر نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ پیڑ اور پتھر کا بولنا کیا واقعی حقیقی انداز میں ہوگا یا محض زبانِ حال

سے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں کے امکانات ہیں۔ اللہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ بے جان پیڑ پتھر بول پڑیں۔ ہم نے رواں صدی میں انسانی ہاتھوں سے بنائی گئی سینکڑوں ایسی محیر العقول چیزیں دیکھی ہیں جن کا ماضی میں تصوّر بھی محال تھا۔ اللہ کی قوت وطاقت سے پیڑ پتھروں کا بولنا بہت معمولی سی بات ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ پیڑ اور پتھر زبانِ حال سے بولیں گے۔ بلکہ زبانِ حال، زبانِ قال کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلیغ اور پُر تاثیر ہوتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ یہودیوں کے ساتھ ہماری جنگ کیا قیامت تک جاری رہے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ یہودیوں سے اس قسم کی جنگ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے اور یہ کہ یہ جنگ قیامت تک جاری رہے گی۔ بلکہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے برپا ہونے سے پہلے یقیناً ایک ایسی جنگ ہوگی جس میں مسلمانوں کو یہودیوں پر حتمی غلبہ نصیب ہوگا۔

حدیث کی کتاب ''الجامع الصغیر'' میں پچیس ایسی حدیثیں ہیں جن میں ''لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ......'' کا صیغہ موجود ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت اس وقت تک برپا نہیں ہوگی جب تک فلاں فلاں چیزیں وقوع پذیر نہ ہو جائیں گی۔ ان میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو واقع ہو چکی ہیں۔ مثلاً کسی حدیث میں قیامت سے قبل ترکوں سے جنگ کی پیشین گوئی ہے اور مسلمانوں کی ترکوں سے جنگ واقع ہو چکی ہے۔ کسی حدیث میں یہ تذکرہ ہے کہ قیامت سے قبل لوگ مسجدوں کی تعمیر میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے تاکہ دوسروں کو زیر کیا جا سکے۔ مسجدوں کی تعمیر میں یہ دوڑ عرصہ ہوا شروع ہو چکی ہے۔ ان میں بعض ایسے امور ہیں جو ابھی واقع نہیں ہوئے ہیں، لیکن قیامت سے قبل ان کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔ مثلاً سورج کا مغرب سے طلوع ہونا وغیرہ۔

یہودیوں سے جنگ والی حدیث پڑھ کر سوال کرنے والے نے غالباً یہ مفہوم اخذ

کرلیا کہ یہودیوں سے ہماری فیصلہ کن جنگ قیامت سے قریبی زمانہ میں ہوگی' حالانکہ حدیث میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ یہ جنگ کس زمانے میں ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ وہ زمانہ اب بہت دور نہ ہو' کیونکہ ایک طرف یہودیوں نے جس طرح فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کر کے مسلمانوں پر ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں میں اسلامی بیداری کی لہر ہر چہار جانب سے اُمڈ رہی ہے اور مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں اور جہاد میں ان کا یقین بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ سارے آثار اشارہ کر رہے ہیں کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے۔ اور اس جنگ میں ان شاء اللہ فتح ہم مسلمانوں کی ہوگی:

اَلَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ''سن لو بلاشبہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے''۔

ایک حدیث پر اشکال

سوال: میں نے جمعہ کے خطبہ میں یہ حدیث سنی' جس سے میں فکر مند ہوں۔

اَكۡثَرُ اَهۡلِ الۡجَنَّةِ الۡبُلۡهُ ''اکثر جنتی سادہ لوح ہوں گے''۔

میں نے بعض علماء سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی معرکہ آرا کتاب احیاء علوم الدین میں اس حدیث کا تذکرہ ہے۔ براہ کرم بتائیں کہ کیا یہ حدیث صحیح حدیث ہے۔ جنتیوں کی اکثریت سادہ لوح اور بے وقوفوں پر کیسے مشتمل ہو سکتی ہے' جبکہ اسلام نے عقل اور سمجھداری کی تعلیم دی ہے' بلکہ سب سے پہلے نازل ہونیوالی آیت بھی علم سیکھنے کی تعلیم دیتی ہے؟

جواب: ہماری مسجدوں کے خطیبوں اور اماموں کی مصیبت یہ ہے کہ وہ کسی بھی کتاب سے کوئی بھی روایت اپنے خطبوں اور تقریروں میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ تحقیق کیے بغیر کہ یہ روایت صحیح ہے یا نہیں۔ یا اگر صحیح ہے بھی تو سامعین کی ذہنی اور علمی سطح اور معیار کے مطابق ہے یا نہیں؟ مجھے کئی ممالک کی مسجدوں میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا موقع ملا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ امام حضرات ایسی روایتیں پڑھ کر لوگوں کو سناتے ہیں جو سند اور

مضمون دونوں اعتبار سے نہایت ضعیف ہوتی ہیں۔

علامہ ابنِ حجر الہیثمی نے اپنی کتاب فتاوی الحدیثیۃ میں اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ ضعیف احادیث پڑھنے والے امام حضرات کو خطبے کی بالکل اجازت نہ دی جائے۔ تاکہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے لوگوں کا دین وایمان تباہ و برباد نہ کرسکیں۔

آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں متعدد مقامات پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ گرچہ ایک زبردست عالمِ دین اور علمِ کلام و تصوف کے ماہر تھے تاہم علمِ حدیث کے معاملے میں وہ خود ہی فرماتے تھے کہ اس میدان میں ان کی نظر اور علم ذرا کوتاہ ہے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ اس مدرسۂ فکر سے متاثر تھے، جس پر تصوف اور فلسفے کا غلبہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں متعدد ایسی احادیث نقل کی ہیں، جو حد درجہ ضعیف اور گھڑی ہوئی ہیں۔ آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ ضعیف حدیث ہے، بلکہ قرآن وسنت کی واضح تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن وسنت دونوں ہی اُمت مسلمہ کو عقل و ذہانت، غور وفکر اور علم و عمل کی تعلیم دیتے ہیں۔ قرآن میں سولہ مقامات پر ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو ''اولوا الالباب'' (عقل منداور سمجھدار ہیں) اور انہیں جنت کا اہل قرار دیا گیا ہے۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ جو اپنی عقل اور سمجھ کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ نادان، غبی اور اندھے بہرے بن کر جیتے ہیں، انہیں جہنم کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ عقل اور سمجھ والوں کے سلسلے میں اللہ کا ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱)

[illegible] سمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے

آنے میں ان عقل مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمانوں کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ فضول کام کرے۔ پس اے ربّ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے"۔

جہنمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہوں نے عقل اور سمجھداری کے ان اعضاء کا استعمال نہیں کیا جنہیں استعمال میں لانے کا اللہ حکم دیتا ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ؁ (الاعراف:۱۷۹)

"اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں' ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں' ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں' بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہ غفلت میں پڑے ہوئے لوگ ہیں"۔

قیامت کے دن جہنمی اعترافِ جرم کریں گے اور کہیں گے:

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؁ (الملک:۱۰)

"اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو ہم جہنمی نہ ہوتے"۔

بلاشبہ سب سے زیادہ جاہل اور غبی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی نادانی' بدعقلی اور بے وقوفی جہنم کی طرف لے جائے۔ اور سب سے زیادہ عقلمند اور ذہین وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی سمجھداری اور ہوشیاری جنت کا حقدار بنادے۔

قرآن کے علاوہ صحیح احادیث میں بھی ہوشیاری اور سمجھداری کی تعلیم دی گئی ہے۔

بخاری و مسلم کی حدیث ہے:

لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَیْنِ (بخاری و مسلم)

''مومن ایک ہی بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا ہے''۔

مسلمان کو اتنا سادہ لوح' سیدھا سادھا اور بے وقوف نہیں ہونا چاہئے کہ یکے بعد دیگرے لوگ اسے نقصان پہنچاتے رہیں۔ اس کی شخصیت اتنی سستی بھی نہ ہو کہ اقوامِ عالم میں اس کی حیثیت کنکر پتھر سے زیادہ نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک عظیم الشان مذہب کے پیروکار کی شخصیت بھی اتنی عظیم الشان ہو کہ لوگوں کے دلوں پر اس کی حکمرانی ہو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ ضعیف حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ''البلہ'' کی یہ تاویل کی ہے کہ یہاں ''بلہ'' (سادہ لوح) سے مراد ایسے لوگ ہیں' جنہیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہے اور اسی وجہ سے دنیاوی معاملات میں یہ لوگ سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ لیکن آخرت کے معاملے میں نہایت ہوشیار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تاویل نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ فرماتا ہے:

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (الروم: ۶'۷)

''مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بھی غافل ہیں''۔

اس آیت کی رُو سے وہ لوگ جنہیں دنیاوی معاملات کے بارے میں یونہی معمولی علم ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مختصر علم کو کوئی حیثیت نہ دیتے ہوئے جہالت سے تعبیر کیا ہے اور ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ آخرت کی طرف سے بھی غافل ہیں۔

مذکورہ ضعیف حدیث نے بہت سارے کم فہم مسلمانوں کو بڑا گمراہ کیا ہے۔ ان کا یہ

اعتقاد ہے کہ قبروں اور مزاروں کے اطراف میں بسنے والے بہت سارے مجذوب قسم کے پاگل اور بے وقوف لوگ اولیاء اللہ ہوتے ہیں۔ ان مجذوب قسم کے نام نہاد اولیاء اللہ کے بارے میں ان لوگوں نے کرامات اور معجزات کی ایسی داستانیں گھڑ لی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور انہیں سادہ لوح مسلمانوں کو بے وقوف اور گمراہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''البلہ'' کی جو تشریح کی ہے وہ اسلام کے نقطہ نظر سے مطابقت نہیں رکھتی ہے۔ کیونکہ دینِ اسلام جس طرح آخرت کی طرف دعوت دیتا ہے اسی طرح دنیا کمانے اور مادی ترقیوں کو حاصل کرنے کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ اسلام روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ مادی تربیت کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دین و دنیا کا حسین امتزاج ہے۔ اسی میانہ روی کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے اور اسی پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلفِ صالحین کا عمل رہا ہے۔

صفائی ستھرائی اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سوال: ''النظافة من الایمان'' (صفائی ایمان کا حصہ ہے)۔ کیا یہ کسی حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں جیسا کہ مشہور ہیں؟ اگر یہ حدیث نہیں ہے تو صفائی ستھرائی کا اسلام میں کیا مقام ہے؟ (۱)

جواب: بعینہ ان ہی الفاظ میں کوئی حدیث منقول نہیں ہے۔ البتہ اس مفہوم اور مدعا

(۱) پچھلے سوال کی طرح یہ سوال بھی ہمارے معاشرہ میں ایک زبردست غلط فہمی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دین میں صفائی ستھرائی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے باوجود ہمارے معاشرہ میں اس کا کچھ خاص اہتمام نہیں کیا جاتا۔ تنبیہ کے باوجود بعض لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ ان کے کپڑے یا گھر وغیرہ گندے یا غیر منظم ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جو صفائی ستھرائی کے بہت زیادہ اہتمام کو دنیا داری سمجھتے ہوئے اسے فضول عمل تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ صفائی ستھرائی شخصیت کو مضبوط و مستحکم بنانے اور متعدد بیماریوں سے محفوظ رکھنے میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے بے شمار دُنیوی اور اُخروی فوائد ہیں۔ ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔ (مترجم)

کو بیان کرنیوالی بے شمار صحیح احادیث ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم کی یہ حدیث:

اَلطَّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ ''صفائی آدھا ایمان ہے''۔

الطھور یعنی طہارت' معنوی گندگی یعنی کفر و شرک اور گناہوں سے پاکی کا نام بھی ہے اور مادی گندگی یعنی جسمانی اور ظاہری گندگی سے پاکی کا نام بھی۔ چنانچہ طہارت کے بغیر نماز نہیں ہوسکتی۔ اس میں کپڑے اور جسم کی صفائی بھی شامل ہے اور نماز سے قبل وضو کرنا بھی۔

حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

لَایَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةً بِغَیْرِ طُهُوْرٍ

''اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں سب سے پہلے طہارت کا باب پڑھایا جاتا ہے۔ کیونکہ طہارت نماز کی کنجی ہے اور نماز جنت کی کنجی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان لوگوں کی متعدد مقامات پر تعریف کی ہے جو صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس صفائی کی وجہ سے اللہ ان سے محبت بھی کرتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ○

(التوبۃ:۱۰۸)

''جو مسجد اوّل روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی' وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں عبادت کرو۔ اس میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو پاک صاف رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ طہارت اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

دوسرے مقام پر اللہ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ○ (البقرۃ:۲۲۲)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور طہارت اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے“۔

حدیث کی کتابوں میں بے شمار صحیح احادیث ہیں، جو مختلف پہلوؤں سے صفائی ستھرائی کا حکم دیتی ہیں۔ ذیل میں ایسی چند احادیث پیش کرتا ہوں:

حَقَّ اللّٰهِ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِىْ كُلِّ سَبْعَةِ اَيَّامٍ يَوْمٌ يَّغْسِلُ فِيْهِ رَأْسَهٗ وَجَسَدَهٗ (بخاری، مسلم)

”ہر مسلمان پر اللہ کا حق ہے کہ ہفتہ کے سات دنوں میں ایک ایسا دن ہو کہ جس میں وہ اپنے سر اور بدن کو غسل دے“۔

اور یہ نہانا اور غسل کرنا اس وقت فرض ہو جاتا ہے جب انسان کے جسم پر ظاہری یا معنوی گندگی (احتلام) ہو۔ اسی طرح بعض احادیث میں جسم کے مختلف اعضاء کی صفائی ستھرائی کی تلقین ہے۔ مثلاً دانتوں اور منہ کی صفائی کی تلقین بہت واضح انداز میں یوں کی گئی ہے:

لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِىْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ۔

(بخاری، مسلم، ترمذی)

”اگر میرا یہ حکم میری اُمت پر گراں نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے (دانتوں کی صفائی) کا حکم دیتا“۔

اسی طرح بالوں کی صفائی کا حکم اس انداز میں ہے:

مَنْ كَانَ لَهٗ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ (ابوداؤد)

”جس کسی کے بال ہوں تو اسے چاہئے کہ وہ ان کی دیکھ بھال کرے“۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور ان کی نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَمَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يُسَكِّنُ بِهٖ شَعْرَهٗ

''کیا اسے کوئی ایسی چیز نہیں ملتی، جس سے یہ اپنے بال سنوار لے؟''۔

ایک دوسرے شخص پر نگاہ پڑی جس کے کپڑے گندے تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

أَمَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يَغْسِلُ بِهِ ثِيَابَهُ (مسند احمد)

''کیا اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑے دھولے''۔

ان احادیث کو پڑھ کر کوئی بھی شخص بہ خوبی سمجھ سکتا ہے کہ حضور ﷺ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ انسان اس حالت میں رہے کہ اس کے بال بے ترتیب اور بکھرے ہوئے ہوں اور اس کے کپڑے گندے ہوں۔

بعض صحیح احادیث میں اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ظاہری زیب و زینت اور فطری حسن و زیبائش کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ'' یعنی اللہ صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ یہ بات حضور ﷺ نے اس شخص کے جواب میں فرمائی تھی، جس نے یہ سوال کیا تھا کہ میں اچھے اور عمدہ کپڑے زیب تن کرنا پسند کرتا ہوں۔ گھمنڈ اور ریاکاری کی وجہ سے نہیں، بلکہ زیب و زینت کے لیے کیا یہ جائز ہے؟ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ بھی زیب و زینت کو پسند کرتا ہے۔

اسی طرح حضور ﷺ نے ناخن ترشوانے، زیرناف اور غیر ضروری بالوں کو صاف کرنے اور گھروں کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطَّيِّبَ نَظِيْفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ فَنَظِّفُوْا أَفْنِيَتَكُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ (ترمذی)

''بلاشبہ اللہ کی ذات پاک ہے اور پاکی کو پسند کرتا ہے۔ صاف ستھرا ہے اور صفائی کو پسند کرتا ہے۔ پس اپنے گھروں کو صاف رکھا کرو اور یہودیوں سے مشابہت نہ اختیار کرو (غالباً اس زمانے میں یہودی اپنے گھروں کو گندا رکھتے ہوں گے)''۔

حضور ﷺ نے گھر سے باہر سڑکوں کی صفائی کا بھی حکم دیا ہے۔ اور اس بات سے سختی سے منع کیا ہے کہ لوگ راستوں اور دیواروں کے سایہ میں پیشاب یا پاخانہ کریں۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

اِتَّقُوا اللَّاعِنَیْنِ قَالُوْا وَمَا اللَّاعِنَانِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اَلَّذِیْ یَتَخَلّٰی فِیْ طَرِیْقِ النَّاسِ اَوْ ظِلِّهِمْ (مسلم)

''دونوں قابلِ لعنت آدمیوں سے بچو' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کون سے دو قابلِ لعنت لوگ۔ فرمایا جو سرِ راہ پیشاب پاخانہ کرے یا ایسی جگہ' جہاں لوگ سائے میں بیٹھتے ہیں۔''

اسی طرح حضور ﷺ نے کھانے پینے کی چیزوں میں صفائی ستھرائی کی تلقین کی ہے' فرمایا:

اَغْلِقُوْا اَبْوَابَکُمْ وَ خَمِّرُوْا آنِیَتَکُمْ وَاَطْفِأُوْا سُرُجَکُمْ وَاَوْکِئُوْا اَسْقِیَتَکُمْ (مسلم)

''اپنے گھروں کے دروازے بند کرلیا کرو (یعنی سوتے وقت تاکہ جانور وغیرہ نہ گھس جایا کریں) اور اپنے برتنوں کو ڈھک دیا کرو اور بتیاں گل کردیا کرو اور پانی کے برتنوں کو ڈھک دیا کرو''۔

حضور ﷺ اور جادو

سوال: میں ایک طالبعلم ہوں اور میری تمنا ہے کہ میرے علم میں زیادہ سے زیادہ وسعت اور گہرائی آئے۔ میں ان علماءِ کرام کی بے حد عزت کرتا ہوں جنھوں نے علم کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور اُمت مسلمہ کو بحرِ ضلالت سے نکالنے اور راہِ ہدایت دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان علماءِ کرام میں ایک قابلِ قدر نام علامہ سیّد رشید رضا مرحوم کا ہے' جو ساری زندگی بدعات وخرافات کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ لیکن چند دن قبل مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے صحیح بخاری کی ایک حدیث کو صحیح ماننے سے انکار کردیا ہے۔ اس حدیث میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ یہودیوں نے حضور ﷺ

پر جادو کیا تھا۔

آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علامہ سیّد رشید رضا کے زبردست مداح ہیں۔ انہوں نے جب ایک صحیح حدیث کا انکار کیا ہے تو کیا پھر بھی آپ کی نظروں میں ان کی وہی قدر ومنزلت ہے؟ کیا واقعی انہوں نے مذکورہ حدیث کا انکار کیا ہے؟ کیا اس انکار کے باوجود وہ عالمِ دین کہلائیں گے؟

جواب: قابلِ تحسین وتعریف ہیں وہ لوگ جو حصولِ علم کا شوق رکھتے ہیں اور علماءِ کرام کی عزت واحترام کرتے ہیں۔ علم ایک قیمتی شے ہے' جس کا حصول اور جس میں اضافہ کی تمنا ہر عقلمند شخص کو کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم دیا کہ وہ علم میں اضافہ کی دعا کرتے رہیں۔

رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (طٰہٰ:۱۱۴)

''اے میرے رب! مجھے زیادہ علم عطا فرما''۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگ نہ خود علم حاصل کرنے کی فکر کرتے ہیں اور نہ ہی علماءِ کرام کے لیے ان کے دلوں میں عزت واحترام کا جذبہ ہوتا ہے۔ بلکہ بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو موقع ملنے پر علماءِ کرام کو ذلیل ورسوا کرتے ہیں اور اس پر فخر اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔

بے شک میں علامہ سیّد رشید رضا مرحوم کا زبردست مداح ہوں۔ انہیں جلیل القدر عالمِ دین تسلیم کرتا ہوں جو ساری زندگی اُمت مسلمہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے رہے۔ انہیں علم وعمل کی طرف بلاتے رہے اور بدعتوں اور جہالتوں کیخلاف جنگ لڑتے رہے۔ لیکن وہ بھی ایک انسان تھے اور غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں۔ نہ انہوں نے کبھی اپنے بارے میں معصوم عن الخطاء ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ہی ہم ان کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ساری زندگی اس بات کیخلاف جنگ کرتے رہے کہ معزز شخصیتوں کو مقدس مان کر انہیں معصوم عن الخطاء تصوّر کیا جائے۔ جہاں تک مجھے علم ہے

علاّمہ مرحوم نے مذکورہ حدیث کا انکار نہیں کیا ہے۔ تاہم اگر ہم فرض کر لیں کہ انہوں نے اس حدیث کا انکار کیا ہے تو کیا اس انکار کی وجہ سے ان کے وہ عظیم الشان کارنامے کالعدم قرار دیے جائیں گے جن کا میں نے اوپر تذکرہ کیا ہے؟ صحابۂ کرام اور سلفِ صالحین میں بے شمار ایسے بزرگ علماءِ حدیث ہیں جنہوں نے ایک یا ایک سے زائد حدیث کا انکار کیا ہے' کیونکہ یہ احادیث ان کے نزدیک کسی نہ کسی معقول سبب کی بنا پر معتبر نہیں ہیں' لیکن اس انکار کے باوجود ان کی شان اور منزلت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعض احادیث کا انکار کیا ہے' کیونکہ یہ احادیث ان کی اپنی سمجھ کے مطابق قرآن سے ٹکرا رہی ہیں۔ پھر یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ جس نے بخاری یا مسلم کی ایک یا دو احادیث کا انکار کر دیا گویا اس نے کُل کی کُل بخاری یا مسلم ہی کا انکار کر دیا ہے۔

علاّمہ مرحوم نے جادو والی حدیث کا انکار نہیں کیا ہے' بلکہ اپنی سمجھ کے مطابق اس کی توضیح وتشریح کی ہے۔ حالانکہ سلفِ صالحین میں سے بعض علماءِ حدیث نے اس حدیث کا انکار بھی کیا ہے۔ مثلاً امام ابوبکر الرازی جو ایک زبردست حنفی عالمِ دین تھے انہوں نے اس حدیث کو ماننے سے انکار کیا ہے۔

علاّمہ مرحوم نے اس حدیث کی جو تشریح کی ہے اسے بیان کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ میں اس حدیث کو پیش کر دوں۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ

> ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بنو زریق قبیلہ کے ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا۔ اس آدمی کا نام لبید بن الاعصم تھا۔ اس جادو کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس موجود تھے پھر بھی بار بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اے عائشہ (رضی اللہ عنہا) کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اللہ سے جس چیز کے بارے میں دریافت کیا تھا اللہ نے مجھے اس کے بارے میں باخبر کر

دیا۔ میرے پاس دو شخص (فرشتے) آئے۔ ان میں سے ایک میرے سر کے پاس بیٹھا اور دوسرا میرے پیر کے پاس۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ اسے کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ کسی نے جادو کر دیا ہے۔ پہلے نے پوچھا کہ کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ لبید بن الاعصم نے۔ پہلے نے پوچھا کہ کس چیز میں پڑھ پھونک کر جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ کنگھی اور اسکے بالوں میں اور کھجور کے خوشوں میں۔ پہلے نے دریافت کیا کہ یہ چیزیں کہاں رکھی ہوئی ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا کہ ذروان نامی کنویں کے اندر۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ اس کنویں کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! اس کا پانی مہندی کے پانی کی طرح سرخ تھا اور کھجور کے خوشے شیطان کے سر کے بالوں کی طرح لگ رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ اے رسول اللہ ﷺ! آپ نے اُسے کنویں سے باہر نہیں نکالا؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا بخش دی تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں خواہ مخواہ اس واقعہ کی تشہیر کر کے لوگوں میں فتنہ کھڑا کروں''۔(۱) (بخاری)

اس حدیث کے الفاظ ''يُخَيَّلُ اِلَيْهِ اَنَّهُ كَانَ يَفْعَلُ الشَّيْءَ وَلَمْ يَفْعَلْهُ'' یعنی جادو کے اثر کی وجہ سے حضور ﷺ کو یہ گمان ہوتا تھا کہ آپ نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ انہوں نے اس کام کو نہ کیا ہوتا۔ حدیث کے ان الفاظ سے اکثر علماءِ حدیث نے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ جادوگر لبید بن الاعصم نے حضور ﷺ کی عقل پر جادو کر دیا تھا۔

---

(۱) جادو کی حقیقت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں علماءِ کرام کا اختلاف ہے۔ بعض علماءِ کرام کہتے ہیں کہ جادو محض تخیلاتی اور تصوّراتی چیز ہے۔ ٹھوس حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اہلِ علم جادو کا انکار کرتے ہیں اور اسے نہیں مانتے ہیں۔ لیکن علماءِ کرام کی اکثریت جادو کو ایک ٹھوس حقیقت تسلیم کرتی ہے۔

اس جادو کی وجہ سے حضور ﷺ یہ خیال فرماتے تھے کہ آپ نے فلاں کام کرلیا ہے' جبکہ آپ نے اس کام کو نہ کیا ہوتا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی فلاں بیوی سے مباشرت نہیں کی پھر بھی حضور ﷺ کو ایسا لگتا تھا کہ آپ ﷺ نے مباشرت کرلی ہے۔ گویا یہ جادو حضور ﷺ کی عقل اور سمجھ پر تھا۔

علامہ سیّد رشید رضا مرحوم علماءِ حدیث کی اس تشریح اور مفہوم کو صحیح تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ جادوگر نے حضور ﷺ کی عقل پر جادو کردیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت اور رسالت کی بہت ساری باتیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ وہ یوں کہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے جادو کے اثر کی وجہ سے نبوت اور وحی کی کچھ باتیں اپنی اُمت کو نہ بتائی ہوں اور آپ سمجھ رہے ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ باتیں بتادی ہیں یا یہ کہ جادو کے اثر کی وجہ سے بعض باتوں اور احکام کو آپ ﷺ نے اس انداز میں نہ بتایا ہو جس انداز میں بتانے کا حکم ملا ہو۔ اس لیے اس حدیث سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ جادوگر نے حضور ﷺ کی عقلی اور ذہنی حالت پر جادو کردیا تھا غلط ہے۔ علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ حدیث کے یہ الفاظ ''حضور ﷺ کو یہ گمان ہوتا تھا کہ انہوں نے فلاں کام کرلیا ہے حالانکہ انہوں نے یہ کام نہیں کیا ہوتا تھا'' یہاں کام سے مراد کوئی بھی کام نہیں' بلکہ صرف ایک کام ہے اور وہ ہے آپ کا اپنی بیویوں سے مباشرت کرنا جیسا کہ بعض روایتوں میں اس کی صراحت ہے۔ صرف یہی ایک عمل ہے جس کے سلسلے میں جادوگر نے حضور ﷺ پر جادو کردیا تھا۔ حضور ﷺ یہ سمجھتے تھے کہ آپ نے اپنی بیویوں سے مباشرت کرلی ہے حالانکہ آپ نے ایسا نہیں کیا ہوتا تھا۔ گویا جادو کا اثر صرف بیویوں سے مباشرت تک محدود تھا۔ نبوت اور وحی کی باتوں پر جادو کا اثر نہیں تھا۔

یہ ہے وہ توضیح وتشریح جسے لوگوں نے اس بات پر محمول کرلیا کہ علامہ مرحوم نے اس حدیث کا انکار کردیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے اس حدیث کا انکار نہیں کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے جمہور علماءِ حدیث کی تشریح وتوضیح سے مختلف تشریح پیش کی ہے۔

دوسرا باب

اُصولِ فقہ

- ☆ مسئلہ تقلید
- ☆ مسلکی وفکری اختلاف کے باوجود تعاون واتحاد
- ☆ بدلتے ہوئے حالات میں فقہی مسائل میں تجدید کی ضرورت
- ☆ کیا جنت وجہنم ابدی ٹھکانے ہیں

۲

مسئلۂ تقلید

سوال: کسی ایک ہی مسلک کی مکمل تقلید کے سلسلے میں آپ کا کیا موقف ہے؟ کیا چاروں ائمہ (ابوحنیفہ' مالک' شافعی اور احمد بن حنبل) کو چھوڑ کر کسی اور امام کی تقلید جائز ہے؟ اور کیا یہ جائز ہے کہ کسی ایک مسئلے میں کسی ایک امام کی تقلید کی جائے اور دوسرے مسئلے میں کسی دوسرے امام کی؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اماموں کی تقلید کی بجائے قرآن و سنّت کا براہِ راست اتباع کیا جائے؟

جواب: عدل و انصاف پر مبنی جواب کے لیے ہمیں مندرجہ ذیل اصول و ضوابط کو ذہن میں رکھنا ہوگا:

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلامی فقہ صرف چار مسلکوں تک محدود نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ امام صرف چار (ابوحنیفہ' مالک' شافعی اور احمد بن حنبل) ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ دوسرے علماء فقہ بھی ہیں جو علمی مرتبہ میں ان چاروں کے ہم پلہ ہیں۔ مثال کے طور پر امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ جو کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں امام لیث رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بہتر فقیہ تھے۔ اسی طرح عراق میں امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ تھے جو کہ علم فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی برابری کر سکتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں پانچواں امام تسلیم کیا ہے۔ علمِ حدیث میں انہیں ''امیر المومنین'' کا خطاب عطا کیا گیا ہے۔ اسی طرح امام طبری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی جید فقہاء میں ہوتا ہے۔ فقہ کے علاوہ انہیں تفسیر' تاریخ اور حدیث پر بھی زبردست کمال حاصل تھا۔ ابوحنیفہ' مالک' شافعی اور ابنِ حنبل سے قبل بھی علمِ فقہ کے عمائدین پائے

جاتے تھے اور جو ان چاروں اماموں کے استاد بھی تھے۔ کون ہے جو امام زہری رحمۃ اللہ علیہ اور سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کے ناموں سے ناواقف ہے۔ اسی طرح ان عمائدین سے قبل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بھی جید علماء و فقہاء پائے جاتے تھے مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ بے شمار نام ہیں جو فقہ کے میدان میں بہت اونچے مرتبہ پر فائز تھے۔

(۲) ان چاروں ائمہ نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ معصوم عن الخطاء ہیں اور ان سے غلطی نہیں ہوسکتی۔ اور نہ دوسرے علماءِ کرام ہی ان چاروں ائمہ کے بارے میں اس طرح کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ صحیح اور سچی بات یہ ہے کہ یہ امام حضرات قرآن و حدیث کی روشنی میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے اجتہاد کرتے تھے۔ ان کے اجتہاد کی بنیاد قرآن و سنّت پر تھی نہ کہ اپنی مرضی اور خواہش پر۔ اسی اجتہاد کے نتیجے میں ان کے درمیان اختلافات ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق اجتہاد کی راہ میں حق اور صحیح بات تک پہنچنے والے کو دو اجر ملیں گے۔ جبکہ غلطی کرنے والا بھی ایک اجر کا مستحق قرار پائے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ میں بشر ہوں اور غلطی بھی کرسکتا ہوں۔ پس میرے قول کو قرآن و حدیث کے پیمانے پر پرکھا کرو۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ میری رائے ہے اور یہ رائے میری نظر میں سب سے بہتر ہے۔ لیکن اگر میری رائے سے بہتر کوئی رائے مجھے معلوم ہو تو میں فوراً اسے قبول کرلوں گا''۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ ''میری رائے میری نظر میں صحیح ہے اور غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اور دوسروں کی رائے میری نظر میں غلط ہے، لیکن صحیح بھی ہوسکتی ہے''۔ اس اجتہاد کا نتیجہ تھا کہ کبھی کبھی ایک ہی مسئلے میں کسی ایک امام کی ایک سے زائد رائے ہوتی تھیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب عراق میں تھے تو عراق کے ماحول اور وہاں کی ضرورتوں کے مطابق ان کے فتوے ہوتے تھے۔ اور جب مصر میں جا بسے تو مصر کے حالات اور حاجات کے مطابق ان کے فتوے عراق سے قدرے مختلف ہوتے تھے۔ اسی طرح کسی ایک ہی مسئلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو

رائے آج ہوتی تھی، اگلے سال مختلف حالات کی وجہ سے ان کی رائے بھی مختلف ہوتی تھی۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ ایسا کیوں ہے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ جواب دیتے کہ "ذٰلك بما علمنا وهذا على ما نعلم" (کل کا فتویٰ کل کے علم کے مطابق تھا اور آج کی رائے آج کے علم کے مطابق ہے۔)

(۳) کسی ایک مسلک کا اتباع اور تقلید کرنا فرض ہے اور نہ سنّت، بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ ایسی تقلید قرآن وسنّت کی رُو سے جائز نہیں ہے۔

(الف) قرآن وسنّت سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر شریعت کے معاملے میں صرف اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے کسی ایک متعین شخص کی اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ایسی کوئی شخصیت نہیں ہے، جس کی تمام رائیں صحیح ہوں اور جس سے غلطی کا امکان نہ ہو۔ انسان خواہ کتنا ہی بڑا عالم وفقیہ ہو، اگر اس سے غلطی کا امکان ہے تو اس کی مکمل تقلید اور اتباع کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ یہ تو سراسر گمراہی کی بات ہے۔ اس طرح کی تقلید کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے اس عالم وفقیہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ عطا کر دیا۔ اپنے علماء وفقہاء کو رسول یا خدا کا درجہ عطا کر دینا ایسی صریح گمراہی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی سخت سرزنش کی ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ:۳۱)

"انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا ربّ بنا لیا ہے"۔

(ب) خود ان علماء وفقہاءِ کرام نے لوگوں کو اپنی مکمل تقلید سے منع کیا ہے اور اس بات سے روکا ہے کہ اندھے بہرے ہو کر ان کی باتوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "نہ میری تقلید کرو نہ مالک رحمۃ اللہ علیہ کی نہ ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی اور نہ اوزاعی کی۔ بلکہ اس کی بات مانو جس کی بات ان سب نے مانی ہے" یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جو کہ مشہور حنفی عالم تھے، فرماتے ہیں "کسی کے لیے جائز نہیں

ہے کہ ہماری باتوں کو بیان کرے اور تسلیم کرے' یہ جانے بغیر کہ ہم نے کہاں سے یہ باتیں اخذ کی ہیں''۔

(ج) اس طرح کی مکمل تقلید کرنا اور اس کے لیے متعصب ہونا ایک ایسی بدعت ہے جس کا وجود قرونِ اولیٰ (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلفِ صالحین کے دور) میں نہیں تھا۔ یہ تو بعد کے دور کی پیداوار ہے جب اُمت مسلمہ میں علم اور اخلاص کی کمی ہوگئی۔ علامہ ابوزید اپنی کتاب ''تقدیم الادلہ'' میں فرماتے ہیں ''صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے دور میں لوگ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں کی بات تقلید کی بنیاد پر نہیں' بلکہ دلیل کی بنیاد پر مانتے تھے۔ کسی ایک شخص کی مکمل تقلید نہیں کرتے تھے۔ ایک مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات مانتے تو دوسرے مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترجیح دیتے۔ نہ کوئی مکمل طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقلید کرتا اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی۔ یہ وہ دور تھا جس کی تعریف خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ لیکن بعد کے دور میں جب لوگوں میں تقوے کی کمی آ گئی اور اجتہاد کی مشقتوں سے کترانے لگے تو وہ قرآن وسنت کی دلیلوں کے بجائے اپنے علماءِ کرام پر تکیہ کرنے لگے۔ پس کوئی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر تکیہ کرنے لگا اور حنفی بن گیا اور کوئی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر تکیہ کرنے لگا اور مالکی بن گیا''۔ وغیرہ وغیرہ

(۴) کسی مسئلہ میں کسی امام کی رائے سے اتفاق نہ کرنا ان کی شان مین گستاخی نہیں ہے اور اس سے ان کی علمی منزلت میں بھی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ علماءِ کرام کی عزت و احترام کرنا ایک اسلامی فریضہ ہے' کیونکہ علماءِ کرام انبیاء کے حقیقی جانشین ہیں' جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ عزت واحترام کرنا ایک بات ہے اور کسی کی رائے سے اتفاق نہ کرنا دوسری بات ہے۔ کسی کی رائے سے مخالفت کے باوجود اس کی بھرپور عزت کی جا سکتی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے حد درجہ محبت کے باوجود فرماتے تھے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں صائب الرائے بھی ہیں اور ایسے بھی ہیں جن سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا سراسر جہالت ہے کہ کسی مسئلہ میں کسی امام کی رائے سے

اختلاف کرنا' اس کی شان میں گستاخی یا اس کی بے عزتی ہے۔

(۵) ہم نے تقلید کے سلسلے میں نہایت نرم الفاظ استعمال کیے ہیں اور بتایا ہے کہ تقلید نہ تو واجب ہے اور نہ سنت' لیکن ہمارے سلفِ صالحین نے تقلید کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابنِ حزم کہتے ہیں کہ تقلید حرام ہے۔[1] اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ اور رسول کے علاوہ کسی اور کی بات بغیر کسی دلیل کے قبول کرلے۔ اللہ کا حکم ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ

(الاعراف:۳)

''لوگو! جو کچھ تمہارے ربّ کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے ربّ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو''۔

دوسری جگہ اللہ کا فرمان ہے:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (البقرۃ:۱۷۰)

''ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے''۔

تمام صحابہ کرام' تابعین اور سلفِ صالحین رضوان اللہ علیہم اجمعین اس بات پر متفق رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی ایسا شخص نہیں ہے' جس کی تمام کی تمام باتیں قبول کرلی جائیں۔ کیونکہ اس کی باتیں صحیح بھی ہوسکتی ہیں اور غلط بھی۔ جو لوگ مکمل طور پر ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' شافعی رحمۃ اللہ علیہ' مالک رحمۃ اللہ علیہ یا احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرتے ہیں انہیں یہ

---

[1] علماءِ کرام اپنے علم کے باوجود کسی مسلک کی مکمل تقلید کریں تو ان کے حق میں یہ تقلید حرام کہی جاسکتی ہے۔ لیکن عام لوگ جنہیں شریعت کا علم نہیں ہوتا ہے وہ اگر کسی مسلک کی تقلید کریں تو یہ حرام نہیں ہوسکتا۔ (مترجم)

جان لینا چاہئے کہ وہ ایسا کر کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلفِ صالحین کی متفق علیہ روش سے ہٹ کر کام کرتے ہیں۔ آخر کس بنیاد پر انہوں نے ان اماموں کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر فوقیت دے رکھی ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مکمل تقلید تو کر لیتے ہیں' لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی تقلید نہیں کرتے؟

شیخ الاسلام علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے کسی امام کی اس طرح تقلید کی کہ اس کی ساری باتوں کو برحق مانتا ہو اور دوسرے اماموں کی باتوں کو رد کر دیتا ہو' اسے قتل کر دینا چاہئے الا یہ کہ وہ اس عمل سے توبہ کر لے' کیونکہ ایسا کر کے اس نے اپنے امام کو شارع اور نبیؑ کے درجہ پر لا بٹھایا اور اس کے اس عمل نے اسے اسلام سے خارج کر دیا۔

(۶) کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو رائے سب سے زیادہ مشہور اور جس کے ماننے والے کثرت میں ہوں' وہی رائے سب سے زیادہ صحیح رائے ہو یا جس رائے کے ماننے والے اقلیت میں ہوں وہ رائے سرے سے غلط ہو' کیونکہ کسی رائے کے صحیح یا غلط ہونے کا دارومدار اس کی شہرت اور اس کے متبعین کی کثرت پر نہیں ہے' بلکہ دلیل کے مضبوط اور معتبر ہونے پر ہے۔ ورنہ اسلام کبھی دینِ حق نہ ہوتا کیونکہ اس کے ماننے والے دنیا میں ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (رعد:۱)

''لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے''۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ○ (یوسف:۱۰۳)

''تم کیسی ہی خواہش کر لو لیکن لوگوں کی اکثریت ایمان نہیں لائے گی''۔

(۷) اجتہادی مسائل میں اختلاف کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے اپنی عزت اور وقار کا مسئلہ بنا کر تفرقہ اور دشمنی کی صورت پیدا کر لی جائے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلفِ صالحین رحمۃ اللہ علیہم فقہی مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے لیکن کبھی

ایسا نہیں ہوا کہ اس اختلاف کی وجہ سے ان کے درمیان دشمنی ہوئی ہو۔ اس اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور ان کے درمیان مکمل اتحاد و اتفاق تھا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی فقہی مسائل میں اختلاف رکھتے تھے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی کو اپنی بات کے صحیح ہونے پر اس قدر اصرار ہو کہ دوسرے کی بات کو سرے سے قبول ہی نہ کرے۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نمازِ فجر میں دعاءِ قنوت کو ضروری سمجھنے کے باوجود جب انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کے نزدیک نمازِ فجر ادا کی تو ان کے رتبہ کا احترام کرتے ہوئے فجر کی نماز میں دعاءِ قنوت نہیں پڑھی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے' لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے' کیا آپ ان کی امامت میں نماز پڑھ سکتے ہیں؟ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور سعید بن المسیّب رحمۃ اللہ علیہ جیسے حضرات کی امامت میں نماز پڑھنے سے کیسے تأمل ہوسکتا ہے۔

اکثر یہ دیکھا اور سنا گیا ہے کہ عام لوگ ان فقہی مسائل میں اختلافات کی کثرت دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ آخر ان اختلافات کے اسباب کیا ہیں؟ ان کے اطمینان قلب کے لیے ان اسباب کا بیان ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہیں:

(۱) شرعی احکام کا منبع وماٰخذ قرآنی آیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت طیبہ ہے' اور یہ عین فطری بات ہے کہ ان قرآنی آیات یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو سمجھنے میں اور ان کے مفہوم کے تعین میں لوگ مختلف ہو جائیں۔ بعض لوگ ظاہری مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض لوگ بات کے اصل مدعا ومقصد کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس کے اصل مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔ مفہوم کے تعین میں اس اختلاف کی وجہ سے فقہی مسائل میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ احزاب سے واپسی کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يُصَلِّيَنَّ الْعَصْرَ اِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ (بخاری ومسلم)

''جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو وہ عصر کی نماز بنی قریظہ پہنچ کر ہی ادا کرے''۔

جب سورج غروب ہونے کا وقت آیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بنی قریظہ نہیں پہنچ سکے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کے بارے میں غور کرنے لگے۔ چنانچہ بعض صحابہ کہنے لگے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بنی قریظہ پہنچ کر ہی عصر کی نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے' اس لیے ہم وہیں جا کر ادا کریں گے خواہ نماز قضا ہو جائے' اور بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم نماز قضا کر دیں بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ ہم جلد از جلد بنی قریظہ پہنچنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ انہوں نے سورج غروب ہونے سے قبل اور بنی قریظہ پہنچنے سے قبل عصر کی نماز ادا کر لی۔ یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایک فریق نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا اور دوسرے فریق نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے اصل مدعا و مقصد کو مدِ نظر رکھا۔ بعد میں جب یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریقوں کو درست قرار دیا۔

اب آپ دیکھ لیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ایک ہی تھا لیکن دونوں فریقوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اجتہاد کے مطابق عمل کیا اور ان کے درمیان اختلاف ہوا اور اس اختلاف کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو درست قرار دیا۔

(۲) طبعاً بعض لوگ سختی اور تشدد کی طرف مائل ہوتے ہیں' جبکہ بعض لوگ فطری طور پر سہل پسند ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نسبتاً سخت مزاج واقع ہوئے تھے اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا میلان سہل پسندی اور آسانی کی طرف

تھا۔ طبیعت میں اس فرق کی وجہ سے بھی فقہی مسائل میں اختلافات ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی سخت طبیعت کی وجہ سے اپنے بچوں کو بوسہ دینے سے گریز کرتے تھے' جبکہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما ایسا کرنے کو نیک عمل سمجھتے تھے۔

(۳) عربی زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں قسم کے معنوں کا احتمال ہوتا ہے۔ بعض لوگ حقیقی معنی و مفہوم کو لیتے ہیں اور بعض لفظ کے مجازی مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کے الفاظ "اَوْلَا مَسْتُمُ النِّسَآءَ" میں لفظ "لَامَسْتُمْ" میں حقیقی اور مجازی دونوں مفہوم کی گنجائش ہے۔ اس کا حقیقی معنی ہے ہاتھ سے چھونا۔ اور اس کا مجازی مفہوم ہے بیوی سے مباشرت کرنا۔ جن فقہاءِ کرام نے اس کے حقیقی مفہوم کو ترجیح دی ان کے نزدیک بیوی کو صرف ہاتھ سے چھو دینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے' لیکن جن کے نزدیک یہاں لفظ کا مجازی مفہوم مراد ہے۔ ان کے نزدیک بیوی کو صرف ہاتھ سے چھو دینے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔

(۴) بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک روایت اور حدیث کسی امام کے نزدیک صحیح اور معتبر ہوتی ہے اور وہ اس کے مطابق اپنی رائے قائم کرتا ہے' جبکہ کسی دوسرے امام کے نزدیک یہ حدیث غیر معتبر اور ضعیف ہوتی ہے اور وہ اس غیر معتبر روایت کو اپنی دلیل نہیں بناتا۔ روایت کے معتبر ہونے یا نہ ہونے سے بھی فقہی مسائل میں اختلافات ہوئے ہیں۔

(۵) بعض فقہاءِ کرام فقہی مسائل کے سلسلے میں قرآن و حدیث کے علاوہ دوسرے عوامل پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً دنیا کے بدلتے حالات' مختلف علاقے والوں کی مختلف ضرورتیں اور عوامی مصلحتیں وغیرہ۔ ان فقہاءِ کرام کے نزدیک ان عوامل کا فقہی مسائل اور ان کے احکام میں بڑا عمل دخل ہوتا ہے' جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ عوامل کچھ زیادہ معتبر نہیں ہیں۔

(۶) بعض فقہاء کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کی شریعتیں' حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے

بھیجے گئے انبیاء ورسل کی شریعتیں ہمارے لیے بھی شریعت کی حیثیت رکھتی ہیں اور انہیں بطورِ دلیل پیش کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ بعض کے نزدیک اگلی شریعتیں ہمارے لیے شریعت کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جن کی وجہ سے فقہاءِ کرام کے درمیان فقہی مسائل میں اختلافات ہوئے ہیں۔ ان اسباب کے متعلق بہت ساری کتابیں بھی تصنیف کی گئی ہیں۔ مثلاً علامہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الانصاف فی اسباب الاختلاف'' اور شیخ علی الخفیف کی ''اسباب اختلاف الفقہاء''۔

ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ فقہی مسائل میں اختلافات کوئی مصیبت یا تفرقہ کی علامت نہیں ہے' بلکہ یہ تو ایک شرعی ضرورت ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ اختلافات ہمارے دین کی وسعت اور کشادگی کی واضح علامت ہیں اور ہم بندوں کے حق میں رحمت ہیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہی تو ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو شرعی مسائل میں تنگی نہیں' بلکہ کشادگی عطا کی ہے۔ انہیں کسی ایک رائے کا پابند نہیں بنایا ہے' بلکہ انہیں یہ گنجائش عطا کی ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں اور اپنے علاقے اور اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے کسی موزوں اور بہتر رائے پر عمل کریں۔ بالکل فطری بات ہے کہ کوئی فتویٰ کسی پرانے زمانے کے لحاظ سے موزوں اور مناسب ہو لیکن وہی فتویٰ آج کے بدلے ہوئے حالات اور گوناگوں ضرورتوں کے پیشِ نظر بالکل موزوں اور مناسب نہ ہو۔ اسی طرح عین ممکن ہے کہ کوئی فتویٰ کسی ملک کے لیے موزوں ہو لیکن دوسرے ملک کے لیے ناموزوں ہو' کیونکہ دونوں ملکوں کے حالات مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب مصر میں مقیم تھے تو ان کے فتوے ان فتووں سے مختلف تھے جو انہوں نے عراق میں قیام کے دوران دیے۔ کیونکہ دونوں ملکوں کے حالات جدا جدا تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سال ایک فتویٰ دیتے اور اگلے سال اسی مسئلہ میں مختلف فتویٰ دیتے اور جب پوچھا جاتا تو جواب دیتے کہ کل کا فتویٰ کل کے حالات کے لحاظ سے تھا اور آج کا فتویٰ

آج کے لحاظ سے۔ خلیفہ منصور نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے خواہش ظاہر کی کہ تمام مسلمانوں کو ان کی تصنیف ''الموطا'' کا پابند بنادیں تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ امیر المؤمنین ایسا نہ کیجئے' کیونکہ مسلمان مختلف ملکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کے حالات جدا جدا ہیں اور ان کی ضرورتیں الگ الگ ہیں۔

تمام لوگوں کو کسی ایک ہی مسلک کا پابند بنا دینا یا اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا' شریعت کی رُو سے ایک غلط عمل ہے' کیونکہ یہ عمل قرآن وسنّت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل کیخلاف ہے۔ اس طرح کی فکر اس زمانے کی پیداوار ہے جب مسلمانوں میں علمی جہالت اور ہر طرح کی پسماندگی آ گئی۔ حنبلی علماءِ کرام کہتے ہیں کہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی ایسے عالم اور فقیہ کا ہونا لازمی ہے جو اجتہاد کے مرتبہ پر فائز ہو۔ اور یہ بات اللہ کی رحمت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ البتہ وہ شخص جو قرآن وسنّت اور دوسرے شرعی علوم پر عبور نہ رکھتا ہو' اسے چاہئے کہ جن مسائل میں اسے علم نہ ہو ان کے سلسلہ میں علماءِ کرام کی طرف رجوع کرے اور ان سے سوال کرے' کیونکہ خدا کا حکم ہے:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (الانبیاء:۷)

''پس علم والوں سے پوچھو' اگر تم نہیں جانتے ہو''۔

کسی مسئلہ میں علم نہ ہونے کے باوجود کوئی رائے قائم کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا یہ بات جائز ہے کہ کوئی شخص کسی ایک مسئلہ میں حنفی مسلک کا اتباع کرے اور دوسرے مسلک میں شافعی یا مالکی مسلک کا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض علماءِ کرام نے اس سے منع فرمایا ہے اور بعض نے اس کی اجازت دی ہے۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص محض آرام پسندی اور آسان فتوے کے چکر میں ایسا کرتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے اور اسے اس بات سے کوئی مطلب نہ ہو کہ اس آسان فتوے کی دلیل مضبوط ہے بھی یا نہیں۔ ایسا شخص گویا اپنے نفس کا اتباع کرتا ہے' شریعت کا نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص قرآن وسنّت کی دلیل کی بنیاد پر کسی رائے کو لائق ترجیح سمجھتا

ہے اور اس سے اجتہاد کرتا ہے' خواہ یہ رائے کسی بھی مسلک کے مطابق ہو تو اس کا یہ عمل نہ صرف جائز ہے' بلکہ لائقِ ستائش ہے۔

مسلکی وفکری اختلاف کے باوجود تعاون واتحاد

سوال: اکثر میں نے آپ کو تقریروں اور خطبوں میں اس قاعدۂ کلیہ کا اعادہ کرتے سنا ہے کہ ''جو امور ہماری اُمت مسلمہ کے درمیان متفق علیہ ہیں' ان میں ہمیں آپس میں تعاون کرنا چاہیے اور جن امور میں ہمارے درمیان اختلاف ہے ان سے صرف نظر کرنا چاہیے اور انہیں تفرقہ اور پھوٹ کا سبب نہیں بننے دینا چاہیے''۔

سوال یہ ہے کہ کس نے یہ قاعدۂ کلیہ وضع کیا ہے؟ کیا شریعت میں اس کی کوئی دلیل ہے؟ آخر ہم ان لوگوں سے کیسے تعاون کر سکتے ہیں' جو اہلِ بدعت ہیں۔ دراں حالے کہ بہت ساری باتوں میں ہمارے اور ان کے درمیان اتفاق ہے۔ جو لوگ قرآن وسنت کی تعلیمات کی خلاف ورزیاں کر رہے ہیں' ان سے کیوں کر صرف نظر کیا جا سکتا ہے؟ ہمیں تو شریعت نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ بدعتوں اور گمراہیوں کی روک تھام کی جائے نہ کہ رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی جائے۔ اس سلسلے میں وضاحت مطلوب ہے۔

جواب: مذکورہ قاعدۂ کلیہ کو وضع کرنے اور اس کی طرف اُمت مسلمہ کو بلانے والے مصری عالمِ دین سیّد رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کا مدعا ومقصد یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کی تمام جماعتوں کو جو فی الحال اپنے آپسی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور ہیں' انہیں اسلام کے دشمنوں کیخلاف متحد ومنظم کیا جائے۔ انہیں متحد ومنظم کرنے کے لیے جس بات کو بنیاد بنایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان جماعتوں کے مابین لاکھ اختلافات سہی' لیکن وہ باتیں ان اختلافی امور کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں جن پر یہ تمام جماعتیں اتفاق رکھتی ہیں مثلاً ایک اللہ' ایک رسول' ایک قرآن وحدیث کی اصولی تعلیمات' ان کے علاوہ اور بھی بے شمار باتیں ہیں جن پر تمام اُمت کا اتفاق ہے۔ اس

قاعدہ کلیہ کا مقصد یہ ہے کہ تمام جماعتیں اپنے فکری اور مسلکی اختلافات کو بھول کر متفق علیہ باتوں کی بنیاد پر متحد ہو جائیں۔ علامہ مرحوم نے اس قاعدہ کلیہ کو یونہی بے دلیل نہیں وضع کیا تھا۔ اس کی بنیاد انہوں نے قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات پر رکھی تھی۔ غور کرنے والا محسوس کرے گا کہ آج ہماری اُمت مسلمہ کس قدر آپسی انتشار کا شکار ہے اور ہمیں کس قدر آپسی اتحاد و اتفاق اور باہمی تعاون کی ضرورت ہے۔ تمام مسلمان اس بات پر تو متفق ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور اسلام ان کا مذہب ہے لیکن اس اتفاق کے باوجود وہ آپسی انتشار کا شکار ہیں جبکہ مسلم دشمن طاقتیں مختلف مذاہب و ملل میں بٹنے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں متحد اور متعاون ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝ (الانفال:۷۳)

''جو لوگ کافر ہیں ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم نے بھی ایسا نہ کیا تو زمین میں بڑا فتنہ اور فساد برپا ہوگا''۔

یہ کافر جماعتیں مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتی ہیں۔ اگر تم مسلمانوں نے مسلم دشمن طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے ویسے ہی اتحاد و اتفاق اور باہمی تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا جیسا کہ اہلِ کفر کرتے ہیں تو اس روئے زمین پر بڑا فساد برپا ہوگا اور ہر سُو فتنہ پھیل جائے گا یعنی ہر سُو کفر و الحاد کا غلبہ ہوگا۔ چنانچہ صورت حال یہی ہے کہ ہم مسلمان آپسی اختلافات کا شکار ہو کر ایک دوسرے کیخلاف برسر پیکار ہیں اور ساری زمین پر ان لوگوں کا غلبہ ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ مسلم اُمت کی مختلف جماعتوں کے درمیان جو فکری یا مسلکی یا کسی قسم کے اختلافات ہیں انہیں فراموش اور نظر انداز کر کے آپسی اتحاد و اتفاق کی فضا ہموار کی جائے اور اُمت مسلمہ کے اہم ترین مسائل کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔

علامہ سیّد رشید رضا جیسے غیرت منداور باشعور عالمِ دین نے جب دیکھا کہ یہودی، عیسائی اور بت پرست سب کے سب مسلمانوں کی دشمنی میں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نظریاتی اور مسلکی اختلافات میں الجھ کرایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے میں مشغول ہیں، تو انہوں نے اس قاعدۂ کلیہ کو وضع کیا، جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلم جماعتوں کومتحد کرنے کی راہ میں ان کے نظریاتی اور مسلکی اختلافات حائل نہ ہوں۔ مسلم دانشوروں نے اس قاعدۂ کلیہ کو کھلے دل کے ساتھ خوش آمدید کہااوران سب کی خواہش اور تمنا ہے کہ اس قاعدۂ کلیہ کوعملی جامہ پہنایا جائے۔

رہا یہ سوال کہ اُمت مسلمہ کی ان جماعتوں کے ساتھ کیسے تعاون کیا جائے جو بدعتوں میں مبتلا ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جسطرح کفر کے کئی درجے اور منزلیں ہوتی ہیں اسی طرح بدعت کی بھی کئی منزلیں اور قسمیں ہیں۔ بعض بدعتیں شدید اور بھیانک قسم کی ہوتی ہیں جن کا ارتکاب کرنے والا اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور بعض بدعتیں ہلکی ہوتی ہیں اور ان کا ارتکاب کرنے والا صرف گناہگار ہوتا ہے، اسلام سے خارج نہیں ہوتا ہے۔ یہ تصوّر کرنا غلط ہے کہ بدعت خواہ کسی قسم کی ہواوراس کی نوعیت کیسی بھی ہو،اس کاارتکاب کرنے والامسلمان نہیں رہا۔

اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اہلِ بدعت اور گمراہ قسم کے مسلمانوں کے ساتھ ان باتوں میں تعاون کیا جائے جو دین کی اصولی باتیں ہیں اور جنہیں اہلِ بدعت بھی تسلیم کرتے ہیں یاان باتوں میں جن میں ہم سب کا مشترکہ مفاد وابستہ ہو۔ ایسی بے شمار باتیں ہوسکتی ہیں جن میں ہم سب کا مشترکہ سیاسی یا معاشی یا سماجی مفاد ہو۔ ہمیں چاہیے کہ ان امور میں ہم سب مل جل کر کام کریں۔ بلکہ اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ ان معتدل قسم کی غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ تعاون کیا جائے جو متشدد اور مسلم مخالف غیر مسلم جماعتوں کے مقابلہ میں ہمیں تعاون دینا چاہتی ہوں۔ نبی ﷺ نے فتح مکہ کے بعد قبیلہ ہوازن کے مشرکین کے مقابلہ میں بعض مشرکینِ قریش کا تعاون حاصل کیا تھا

کیونکہ رشتہ داروں کی بنا پر مشرکینِ قریش کے دلوں میں حضور ﷺ کے لیے قبیلہ ہوازن کے مقابلہ میں نرم گوشہ تھا۔ حتیٰ کہ صفوان بن امیہ نے اسلام قبول کرنے سے قبل کہا تھا کہ ہم میں قریش کا ایک شخص (یعنی حضور ﷺ) حکومت کرے، بہتر ہے اس بات سے کہ قبیلہ ہوازن کا کوئی شخص ہم پر حکومت کرے۔

ذرا سورۂ روم کی ابتدائی آیتوں کے پس منظر پر غور کیجیے۔ اہلِ فارس اور رومیوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں رومیوں کو شکست اٹھانی پڑی۔ اہلِ فارس آگ پوجتے تھے اور اللہ پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ جبکہ رومی عیسائی تھے۔ اہلِ کتاب تھے اور اللہ پر یقین رکھتے تھے۔ اس بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کے لیے نرم گوشہ تھا اور رومیوں کی فتح کے تمنائی تھے۔ حالانکہ دونوں ہی غیر مسلم قومیں تھیں۔ لیکن رومیوں کی شکست نے انہیں غم زدہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوشخبری سنائی کہ صرف چند سالوں کے بعد رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان دوبارہ جنگ ہوگی اور اس جنگ میں رومیوں کو فتح نصیب ہوگی اور ان کی فتح سے مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوگی۔ آخر میں اللہ فرماتا ہے:

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ط (الروم:۴)

''اور اس دن اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے''۔

علماء اہلِ سنّت اور سلفِ صالحینؒ نے معتزلیوں کو اہلِ بدعت قرار دینے کے باوجود ان سے ان کی علمی و فکری کاوشوں میں استفادہ کیا ہے۔ علامہ زمخشری کی تفسیر ''الکشاف'' تمام اہلِ سنّت کے نزدیک ایک معتبر اور مقبول عام تفسیر کی کتاب ہے حالانکہ علامہ زمخشری معتزلی تھے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ فلسفیوں پر ان کی گمراہیاں اور فتنہ پردازیاں واضح کرنے کے لیے میں نے کبھی معتزلیوں سے مدد حاصل کی اور کبھی کرامیوں سے حالانکہ یہ دونوں بدعتی گروہ ہیں، لیکن میں نے ان سے اس لیے مدد حاصل کی کہ فلسفیوں کی گمراہیاں زیادہ خطرناک ہیں۔ رہی وہ مسلم جماعتیں جن سے ہمارا

اختلاف فقہی مسائل اور شرعی احکام میں ہے مثلاً حنفیوں اور شافعیوں کے درمیان یا حنفیوں اور سلفیوں کے درمیان تو یہ اختلاف ہرگز ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے ہمارے درمیان اتحاد و اتفاق کا جذبہ ختم ہو کر دشمنیاں اور دوریاں پیدا ہو جائیں اور ہر ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی پر اتر آئے۔ بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم ان مسلکی اختلافات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اور رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مل جل کر مشترکہ قومی و ملی مفادات کے لیے کام کریں۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ قرآن و حدیث کی وہ دلیلیں جن کی وجہ سے مسلک کا اختلاف ہوتا ہے دو طرح کی ہوتی ہیں:

(۱) پہلی قسم ان دلیلوں کی ہے جنہیں اصطلاحی زبان میں قطعی کہا جاتا ہے یعنی وہ دلیلیں جن کا مفہوم بالکل واضح اور اٹل ہوتا ہے مثلاً وہ قرآنی آیات یا احادیث جن میں نماز یا زکوٰۃ یا رمضان کے روزوں کا حکم ہے یا توحید و آخرت کی تعلیم ہے۔ ان آیات یا احادیث کا مفہوم بالکل واضح اور اس کے صحیح ہونے میں کسی قسم کے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت مسلمہ کی تمام جماعتیں ان قطعی دلیلوں کو تسلیم کرتی ہیں اور کسی کو بھی ان سے اختلاف نہیں ہوتا ہے۔

(۲) دوسری قسم ان دلیلوں کی ہے' جنہیں اصطلاح میں ظنی کہتے ہیں۔ یعنی وہ قرآنی آیات یا احادیث جن میں ایک سے زائد مفہوم کا احتمال ہوتا ہے۔ چونکہ ان کا مفہوم بالکل اٹل اور قطعی نہیں ہوتا بلکہ ان میں کافی گنجائش ہوتی ہے' اس لیے فقہاءِ کرام اپنی اپنی سمجھ کے لحاظ سے ان کا مفہوم متعین کرتے ہیں اور یوں مسلک کا اختلاف وجود میں آتا ہے۔ مثلاً بعض قرآنی آیات یا احادیث میں کسی بات کا حکم ہوتا ہے' لیکن اس حکم کا صیغہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے واجب اور فرض ہونے کا بھی مفہوم نکلتا ہے اور محض سنّت یا نفل ہونے کا بھی۔ مثلاً یہ حدیث شریف:

اُحْفُوا الشَّوَارِبَ وَوَفِّرُوا اللُّحٰی ''مونچھیں ترشواؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ''۔

اس حدیث میں مونچھیں ترشوانے اور داڑھی بڑھانے کا حکم ہے۔ بعض فقہاء نے

اس حکم کو واجب اور فرض پر محمول کیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک داڑھی بڑھانا اور مونچھیں ترشوانا سنّت نہیں بالکل واجب اور فرض ہے۔ جبکہ بعض فقہاء نے اس حکم کو سنّت اور نفل پر محمول کیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک داڑھی بڑھانا اور مونچھ ترشوانا سنّت اور مستحب ہے۔ چونکہ اس حکم میں دونوں قسم کے مفہوم کی گنجائش ہے اس لیے دونوں مسلک کو غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔

الغرض یہ کہ ظنی دلیلوں کی بنا پر مسلک کا اختلاف ایسا اختلاف نہیں ہے جو معیوب ہو اور جس کی بنا پر ہمارے درمیان ناچاقی اور دشمنی پیدا ہو۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس طرح کے اختلافات سے صرف نظر کرتے ہوئے ان باتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کریں جن پر ہم سب کا اتفاق ہے۔ البتہ قطعی دلیلوں میں اگر کوئی مسلم جماعت اختلاف کرتی ہے یعنی نماز' روزہ وغیرہ کے فرض ہونے سے انکار کرتی ہے تو ایسی جماعت سے تعاون کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ ان کی شدید مخالفت ہونی چاہیے۔

بدلتے ہوئے حالات میں فقہی مسائل میں تجدید کی ضرورت

سوال: علماءِ کرام کا ایک طبقہ اس بات کے حق میں ہے کہ بدلتے ہوئے حالات' گوناگوں ترقیاں اور نت نئے مسائل اور ضرورتوں کے پیشِ نظر فقہ اسلامی کے اصول و قواعد میں بھی تجدید اور تبدیلی کی ضرورت ہے' جبکہ دوسرا طبقہ کسی قسم کی تبدیلی یا تجدید کے حق میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا موقف ہے؟

جواب: تجدّد پسندی اور تبدیلی کے نام پر بعض لوگوں نے مذہبی معاملات میں کچھ یوں فتنے کھڑے کردیے ہیں کہ علماءِ کرام اور دین دار حضرات اس لفظ سے کچھ چڑ سے گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مغرب پرست ذہنیت رکھتے ہیں اور جدت پسندی کی آڑ لے کر اُمت مسلمہ کی اسلامی شناخت کو سبوتاژ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ انھی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا کہ ان کی نئی باتیں وہ ہیں جو یورپ میں قدیم ہوچکی ہیں۔ یہ تو کعبے کو بھی بدل دینا چاہتے ہیں۔ کیا اس کے لیے وہ

یورپ سے پتھر لے کر آئیں گے؟ ان کی تجدد پسندی یہ ہے کہ یہ لوگ اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی شعائر کے مقابلے میں یورپ کے افکار و نظریات اور ان کے عادات و اطوار کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تجدد پسندی کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ میں نے اپنے کسی مقالہ میں لکھا ہے کہ اس قسم کی تجدد پسندی کو ''تجدید'' نہیں، بلکہ ''تبدید'' (تباہی) کا نام دینا چاہیے۔ تاہم اصولی طور پر تجدد اور تبدیلی نہ صرف شرعاً جائز ہے، بلکہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور نئی دنیا کی نئی نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر تجدد پسندی وقت کی اہم ضرورت بن چکی ہے۔ خواہ معاملہ دنیا کا ہو یا دین کا۔ حتیٰ کہ ایمان جو کہ دین کا سب سے بنیادی عنصر ہے اس میں بھی وقتاً فوقتاً جدت کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث ہے جسے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

اِنَّ الْاِیْمَانَ لَیَخْلَقُ فِیْ جَوْفِ اَحَدِکُمْ کَمَا یَخْلَقُ الثَّوْبُ الْخَلَقُ فَاسْئَلُوا اللّٰہَ اَنْ یُّجَدِّدَ الْاِیْمَانَ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (حاکم)

''بلاشبہ ایمان تمہارے اندر اسی طرح بوسیدہ ہونے لگتا ہے جس طرح پرانا کپڑا بوسیدہ ہوجاتا ہے۔ پس تم اللہ سے دعا کرتے رہا کرو کہ وہ تمہارے دلوں میں ایمان کی تجدید کرتا رہا کرے''۔

ایک دوسری حدیث ہے جسے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِأَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا (ابوداؤد اور حاکم)

''بے شک اللہ تعالیٰ اس اُمت میں ہر سو سال کے بعد ایسی شخصیت بھیجتا رہے گا جو اس کے دین کی تجدید کرے''۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ دین و ایمان کے معاملات میں تجدید کا عمل ہماری شرعی ضرورت ہے۔ اس لیے وہ تمام علوم جن کا تعلق ہمارے دین سے ہے مثلاً علمِ تفسیر، علمِ فقہ، علمِ اصولِ فقہ اور علمِ کلام وغیرہ۔ ان تمام علوم میں نئے حالات اور بدلے ہوئے

زمانے کے پیشِ نظر مسلسل ریسرچ اور تحقیق ہونی چاہیے اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان علوم میں بعض تبدیلیوں اور جدتوں کو شرعی ضرورت سمجھتے ہوئے قبول کرنا چاہیے۔

اصولِ فقہ بھی ایک اسلامی علم ہے' جسے شروع دور میں فقہاءِ کرام نے ایجاد کیا تھا تاکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہ (مسائل کے استنباط) کے قواعد واصول معلوم کیے جاسکیں۔ ماضی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ مثلاً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الرسالہ'' اور امام شوکانی کی ''ارشاد الفحول'' اور دورِ حاضر میں بھی اس موضوع پر مختلف کتابیں اور مقالات لکھے گئے ہیں اور کل سے آج تک کے اس لمبے علمی سفر میں فقہاءِ کرام نے اس علم میں حالات اور حاجات کی مناسبت سے مختلف وسعتیں اور جدتیں پیدا کیں۔ اس تجدد پسندی کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اجتہاد کے دروازے کو بند نہ کردیا جائے جیسا کہ بعض علماءِ کرام نے اسے بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فقہ اسلامی کے بعض اصول ایسے ہیں جو قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں اور جن کی حیثیت قطعی اور اٹل ہے۔ جن میں کسی قسم کی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ وہ اصولی اور بنیادی احکام ہیں' جن پر ہمارے دین کی عمارت کھڑی ہے اور جن پر قیامت تک ہر زمانہ اور ہر قسم کے ماحول میں یکساں طور پر عمل کرنا لازمی ہے۔ مثلاً:

(۱) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ؕ (فاطر:۱۸)

''کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائے گا''۔

یعنی ہر شخص اپنے گناہوں کا بوجھ خود ہی اٹھائے گا۔ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے گناہوں کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جو تا قیامت برقرار رہے گا اور اس میں کوئی تبدیلی جائز نہیں ہے۔

(۲) وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ (الحج:۷۸)

''اور اللہ نے تم پر دین میں کوئی سختی اور مشقت نہیں رکھی ہے''۔

یہ بھی ایک اصولی حکم ہے کہ دینی معاملات میں حتی الامکان قدرے نرم اور آسان پہلو اختیار کرنا چاہیے۔ بلاوجہ کی مشقتوں کو اختیار کرنا ہمارے دین کا مزاج نہیں ہے۔

(۳) اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (بخاری، مسلم)

''ہر طرح کے اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے''۔

یہ بھی ہمارے دین کا اصولی اور بنیادی پہلو ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ اس کی نیت کے لحاظ سے دیا جائے گا۔

(٤) لَاضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ (موطا امام مالک)

''نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ''۔

اس اصولی حکم کے تحت کوئی بھی ایسا عمل جائز نہیں ہے جس میں انسان کے لیے نقصان کا پہلو ہو۔

یہ چند مثالیں ہیں، ان اٹل اور قطعی اصول وقواعد کی۔ یہ وہ اصول ہیں جن پر تاقیامت اسی طرح عمل ہوتا رہے گا اور ان میں کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ان اٹل اور قطعی اصول وقواعد کے مقابلے میں اسلامی شریعت کے اندر بے شمار ایسے اصول وقواعد ہیں جن کی حیثیت قطعی نہیں ہے اور جن میں بدلتے ہوئے حالات اور نئے زمانے کی نئی ضرورتوں کے پیشِ نظر تبدیلی اور تجدد کی گنجائش ہوتی ہے، تاکہ ہماری شریعت کے احکام ہر زمانے کے حالات سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ واضح رہے کہ قطعی اصول وقواعد کے مقابلے میں غیر قطعی اصول وقواعد کی تعداد بے شمار ہے۔ یا بالفاظِ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری شریعت کے وہ اصول جو قطعی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے اور ان اصول وقواعد کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہیں زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلنے اور ہر دور کے حالات سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام صرف وہی علماء وفقہاء کرسکتے ہیں جن کے اندر اجتہادی صلاحیت موجود ہو۔

بہر حال جدت پسندی کے نام پر نام نہاد اسلامی اسکالروں کو اس بات کی اجازت

نہیں دی جاسکتی کہ وہ قرآن وحدیث سے ثابت شدہ اور قطعی اصول وقواعد میں خواہ مخواہ دخل اندازی کریں اور انہیں اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے بدلنے کی کوشش کریں۔ اس طرح تو سارا دین ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائے گا۔ ذرا ان کی جرأت پر غور کیجئے کہ یہ لوگ قرآن کے بعض احکام کو بھی بدل دینا چاہتے ہیں۔ مثلاً قرآن کا واضح حکم ہے کہ وراثت میں مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں دوگنا حصہ ملے گا۔ لیکن یہ لوگ عورتوں اور مردوں میں مساوات کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ان دونوں کو برابر برابر حصہ دینا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہر دور اور ہر معاشرہ میں نان ونفقہ کی ذمّے داری مردوں پر ہوتی ہے۔ عورت خواہ امیر ہو یا غریب گھر کی معاشی کفالت کی ذمّے دار نہیں ہوتی ہے۔ اگر وہ سروس کرتی ہے تو محض رضا کارانہ طور پر۔ ان معاشی ذمّے داریوں کے پیشِ نظر مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں دوگنا حصہ ملتا ہے۔

بعض حضرات کی زبان سے یہاں تک سنا گیا ہے کہ سؤر کا گوشت قرآن نے اس لیے حرام قرار دیا ہے کہ اس کی غذا ناپاک چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ چونکہ آج کل کے سؤر ناپاک اشیاء پر نہیں پلتے ہیں بلکہ بڑی صفائی کے ساتھ ان کی نگہداشت ہوتی ہے، اس لیے آج کل کے سور کا گوشت حرام نہیں ہونا چاہئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی خواہشوں اور مرضیات کو اللہ کی شریعت کے تابع نہیں، بلکہ اللہ کی شریعت کو اپنی خواہش کی مرضی کے تابع بنانا چاہتے ہیں۔ یہ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اسلام کو زمانہ کی ترقیوں کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔ میں ان سے سوال کرتا ہوں کہ یہ لوگ اسلام کو زمانے کی ترقیوں کے ساتھ کیوں چلانا چاہتے ہیں؟ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ دُنیوی ترقیوں کو اسلام کے مزاج کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے حاکم کو محکوم اور محکوم کو حاکم بنا ڈالا ہے۔

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝ (المائدۃ:۵۰)

''کیا یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور اللہ کے حکم سے بہتر کیا ہوگا ان لوگوں کے لیے جو یقین وایمان رکھتے ہیں''۔

کیا جنت وجہنم ابدی ٹھکانے ہیں؟

سوال: بچپن ہی سے ایک عقیدہ میرے ذہن میں راسخ ہے اور یہ لوگوں میں مشہور و معروف بھی ہے' وہ یہ کہ جہنم ایک دائمی اور ابدی ٹھکانہ ہے۔ کفار ومشرکین کے لیے اس کی آگ کبھی فنا نہیں ہوگی۔ لیکن چند دنوں قبل میں نے کسی کتاب میں پڑھا کہ علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردِ رشید علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اس رائے سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ جہنم ابدی اور دائمی جگہ نہیں ہے۔ اسے کبھی نہ کبھی فنا ہونا ہے۔ ایک دن وہ بھی آئے گا جب اس میں سارے لوگ نکال لیے جائیں گے اور اس میں کوئی بھی نہ بچے گا۔ بہ راہ کرام بتائیں کہ یہ رائے علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ہے یا غلط طور پر ان کی طرف منسوب کردی گئی ہے؟

جواب: عرصہ دراز سے میں علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ پورے وثوق کے ساتھ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کسی کتاب میں بھی مذکورہ رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ البتہ اس رائے کا اظہار ان کے شاگردِ رشید علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ لیکن لوگوں نے غلط فہمی میں یہ رائے ان کے استاد علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کردی۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے جہنم کے فنا ہونے کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے' میں اس کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے جہنم کے فنا ہونے یا اس کے ابدی ہونے کے سلسلے میں علماءِ کرام کے سات اقوال نقل کیے ہیں۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ تمام جہنمی اپنی اپنی سزائیں بھگت کر کبھی نہ کبھی جنت کی طرف منتقل کردیے جائیں گے۔ اور ایک دن وہ آئے گا جب اس میں کوئی بھی نہ بچے گا اور اس کے بعد جہنم فنا کردی جائے گی۔ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے اسے اختیار کیا ہے اور

انہوں نے اس کے حق میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں:

(۱) قرآن کریم میں تین آیتیں ایسی ہیں جن میں اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ جہنم ابدی اور دائمی ٹھکانا نہیں ہے۔

لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا ○ (النبا:۲۳)

''جس میں (جہنم میں) وہ مدتوں پڑے رہیں گے''۔

قرآن کا یہ طرز بیان کہ جہنمیوں کا جہنم میں قیام مدتوں رہے گا واضح کررہا ہے کہ جہنم میں ان کا قیام ہمیشہ کے لیے نہیں' بلکہ مدتوں پر محیط ہوگا۔ کیونکہ ہمیشہ رہنے والوں کے لیے عربی زبان میں ''لّٰبِثِیْنَ اَحْقَابًا○'' کی تعبیر استعمال نہیں کی جاتی۔ یہی رائے متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ قرآن کو ہم سے بہتر سمجھتے تھے۔

دوسری آیت ہے:

قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ○ (الانعام:۱۲۸)

''اللہ فرمائے گا جہنم تم لوگوں کا ٹھکانہ ہے۔ اس میں تم ہمیشہ رہو گے اِلّا یہ کہ اللہ تمہیں جتنی مدت تک رکھنا چاہے۔ بے شک تمہارا ربّ حکمت والا اور علم والا ہے''۔

تیسری آیت یوں ہے:

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ○ (هود:۱۰۷)

''جہنم میں وہ اس وقت تک رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہے اِلّا یہ کہ تیرا ربّ جیسا چاہے۔ بے شک تیرا ربّ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔

آخرالذکر دونوں آیتوں میں اس بات کا بیان ہے کہ جہنم کی مدتِ بقا اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس کی مدتِ بقا دائمی

اور ابدی نہیں ہے۔

(۲) متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین' تابعین اور سلفِ صالحین کی رائے بھی یہی ہے کہ جہنم ابدی اور دائمی ٹھکانہ نہیں ہے' بلکہ اسے کبھی نہ کبھی فنا ہونا ہے۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر جہنمی جہنم میں ریت کے ذروں کے برابر دن بھی رہ جائیں تب بھی ایک دن ایسا آئے گا جب وہ اس سے نکال لیے جائیں گے''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جب اس کے دروازے بند کر دیے جائیں گے اور اس میں کوئی بھی نہیں بچے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جہنم میں کوئی بھی نہیں بچے گا۔ یہی رائے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ' حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ اور متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ہے۔ تابعین میں امام شعبی۔ اسحاق بن راہویہ وغیرہ بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

(۳) عقلی اور نقلی تمام دلیلیں ثابت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ حکیم اور رحیم ہے اور یہ بات اس کی حکمت و رحمت کے منافی ہے کہ قصور وار لوگ ہمیشہ کے لیے عذاب جہنم کے مستحق قرار دیے جائیں۔ دلیلوں سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیوی سزائیں حکمت و مصلحت کی بنا پر عائد کی ہیں۔ حکمت و مصلحت یہ ہے کہ ان سزاؤں کے ذریعے لوگوں کو ان کے گناہوں سے پاک کیا جائے' لوگ ان سزاؤں سے سبق حاصل کریں اور دوبارہ وہ ایسی غلطیاں نہ کریں۔ گویا یہ سزائیں خود انسان کے فائدے کے لیے ہیں اور یہ دُنیوی سزائیں وقتی ہوتی ہیں' دائمی نہیں۔ دنیا کی طرح آخرت کی سزائیں بھی اللہ کی حکمت اور رحمت کی وجہ سے ہیں۔ ان سزاؤں کے پیچھے نعوذ باللہ اللہ کا ظلم کار فرما نہیں ہے۔ بلکہ صحیح حدیث میں ہے کہ دنیا میں اللہ کی رحمت آخرت میں اس کی رحمت کا ایک چھوٹا سا جز ہے۔ آخرت میں اس کی رحمت بے پایاں اور بے حد و حساب ہوگی۔ اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ جہنم کا عذاب ہمیشہ باقی نہ رہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ اللہ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں کو خواہ مخواہ عذاب دے۔ اللہ فرماتا ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ط (النساء: ۱۴۷)

''آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو''۔

اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک متعینہ مدت تک عذاب دے کر انہیں جہنم سے نکالے گا۔ اور جہنم کا وجود ختم کر دیا جائے گا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں ہمیں بتایا ہے کہ اس کی رحمت ہر چیز، حتیٰ کہ اس کے غیظ و غضب پر بھی حاوی ہے۔ اور یہ کہ اس کی رحمت جس طرح مؤمنین کے لیے ہے اسی طرح کفار و مشرکین کے لیے بھی ہے۔ اس نے اپنے لیے غفور، رحیم اور رحمان جیسے ناموں کا انتخاب کیا ہے جن میں رحمت و مغفرت کی صفت پائی جاتی ہے۔ لیکن اس نے اپنے لیے کسی ایسے نام کا انتخاب نہیں کیا ہے، جس میں عذاب دینے اور انتقام لینے والے کی صفت پائی جاتی ہے۔ گویا عذاب دینا اور انتقام لینا اس کی دائمی صفت نہیں ہے، بلکہ اس کا وقتی عمل ہے، جو ضرورت کی بنا پر ظاہر ہوتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تخلیق کسی عظیم غرض و غایت کے لیے کی ہے۔ انہیں عذاب دینے کے لیے نہیں۔ بندوں کو عذاب دینا بندوں کی تخلیق کا مقصد ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ بات اس غرض و غایت کے منافی ہے کہ بندوں کو ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا رکھا جائے۔

(۶) وہ دلائل جو جہنم کی ابدیت کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں ان پر جرح اور تنقید کرتے ہوئے علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی دلیل جہنم کی ابدیت کو ثابت نہیں کرتی۔ مثلاً قرآن کی وہ تمام آیتیں جن میں جہنم کے لیے ''خلود'' کی خبر دی گئی ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خلود کا مفہوم ایسی ہمیشگی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ حالانکہ لفظِ خلود ایسی ہمیشگی کے لیے نہیں استعمال ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ لفظِ خلود کا مفہوم صرف یہ ہے کہ فلاں چیز بہت زیادہ لمبے عرصے تک برقرار رہے گی۔ چنانچہ قرآن

نے بعض گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں مثلاً قتل کرنے والے مسلمانوں کو جہنم میں خلود کی وعید سنائی ہے۔

فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خَالِدًا فِیۡہَا (النساء:۹۳)

''پس اس کی سزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا''۔

لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ مسلم شخص اپنے اس قتل کی سزا بھگت کر ایک نہ ایک دن جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظِ خلود اس بات پر دلالت نہیں کرتا ہے کہ اس کی سزا کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ رہی قرآن کی وہ آیتیں جن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین جہنم سے کبھی نہیں نکالے جائیں گے۔ مثلاً:

وَمَا ہُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنَ النَّارِ ۝ (البقرۃ:۱۶۷)

''اور وہ لوگ جہنم سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پائیں گے''۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک جہنم کا وجود باقی رہے گا یہ کفار و مشرکین بھی اسی جہنم میں رہیں گے۔ اس آیت سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ جہنم ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔

اس ساری تفصیل کے بعد علامہ ابن القیم اس مسئلہ کو اللہ کی مشیت پر چھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ نہ جہنم کے دائمی ہونے کے بارے کامل یقین کے ساتھ کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہ اس کے فنا ہونے کے بارے میں۔ اس معاملے میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ' حضرت علی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول نقل کرنا زیادہ مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ جیسا چاہے گا ویسا معاملہ کرے گا۔ یہ کام اللہ کا ہے اور سب کچھ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ۝ (ھود:۱۰۷)

''بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔

تیسرا باب

ارکانِ اسلام اور عبادات

☆ عہدِ نبوی میں مسجد کا دعوتی اور سرکاری مرکز ہونا

☆ جمعہ سے متعلق چند بدعتوں کی توضیح

☆ چاند کی توثیق کے لیے جدید آلات کا استعمال

۳

عہدِ نبوی میں مسجد کا دعوتی اور سرکاری مرکز ہونا

سوال: ہمارے درمیان ایک اہم مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ اس معاملے میں آپ سے رجوع کریں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کو سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہاں تو اس کے کیا دلائل ہیں اور اگر نہیں تو اس کی کیا توجیہ ہے؟

جواب: عہدِ نبوی میں مسجد مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ یہ محض عبادت اور نماز کی جگہ نہیں تھی' بلکہ جس طرح نماز کے لیے مسجد عبادت گاہ تھی اسی طرح حصولِ علم کے لیے یونیورسٹی' ادبی سرگرمیوں کے لیے اسٹیج' مشاورتی امور کے لیے پارلیمنٹ اور باہمی تعارف کی خاطر نقطۂ ملاقات کا کام دیتی تھی۔ عرب کے دور دراز علاقوں سے وفود آتے تو مسجد ہی میں آنحضورﷺ سے ملاقات کا انتظام ہوتا اور تمام دینی' معاشرتی اور سیاسی تربیت کے لیے آپ مسجد ہی میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔

حضورﷺ کے زمانے میں دین اور سیاست علیحدہ علیحدہ چیز نہیں تھی جیسا کہ آج تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مسائل کے حل کے لیے اور سیاسی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے حضورﷺ کے پاس الگ الگ مراکز نہیں تھے۔ دونوں طرح کے مسائل مسجد ہی میں نمٹائے جاتے تھے۔

عہدِ نبوی کی طرح خلفاءِ راشدین کے عہد میں بھی مسجد مسلمانوں کی تمام دینی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ نامزد ہونے کے بعد اپنا پہلا سیاسی خطبہ مسجد ہی میں دیا تھا' جس میں انہوں نے اپنی سیاست کے

خدوخال بیان فرمائے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا تھا: ''اے لوگو! میں تمہارا خلیفہ مقرر کیا گیا ہوں' حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر شخص نہیں ہوں۔ اگر تم مجھے حق پر دیکھو تو میری مدد کرو اور اگر باطل پر پاؤ تو مجھے سیدھا کر دو''۔ اسی مسجد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا پہلا سیاسی خطبہ دیا تھا اور فرمایا تھا: ''اے لوگو! تم میں سے جو شخص مجھ میں کجی دیکھے تو اسے چاہیے کہ مجھے سیدھا کر دے''۔ کسی شخص نے دورانِ خطبہ برملا کہا کہ بہ خدا اگر ہم نے آپ کے اندر کوئی کجی پائی تو تلوار کی دھار پر آپ کو سیدھا کر دیں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ شکر ہے اللہ کا جس نے عمر کی رعایا میں ایسے لوگ پیدا فرمائے ہیں جو عمر کو تلوار کی دھار پر سیدھا کر سکتے ہیں۔ یہ رول ہوا کرتا تھا مسجدوں کا اس زمانے میں جب مسلمانوں کو عروج حاصل تھا۔ لیکن جب اُمت مسلمہ میں انحطاط اور زوال کا دور شروع ہو گیا اور مسلم معاشرہ پسماندگی کا شکار ہو گیا تو مسجدوں نے بھی اپنا ہمہ جہت رول کھو دیا' وہ صرف نمازوں تک محدود ہو کر رہ گئیں اور جمعہ کے خطبے بے جان اور بے اثر ہو گئے۔

مجھے نہیں معلوم کہ سیاست کو اس قدر غلیظ اور بدنام کیوں تصوّر کیا جاتا ہے حالانکہ سیاست بہ حیثیت علم نہایت سنجیدہ اور اعلیٰ و ارفع علم ہے۔ سیاست بہ ذات خود نہ گندگی ہے اور نہ جرم' لیکن جس سیاست میں اچھے بُرے کی تمیز نہ ہو اور مقصد حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز ہتھکنڈے اختیار کیے جائیں وہ سیاست اپنے غلط طریقۂ کار کی وجہ سے یقیناً گندی سیاست ہے۔ رہی وہ سیاست جس کا مقصد کارہائے حکومت کو اس طرح انجام دینا ہو کہ معاشرے میں ظلم و فساد کی سرکوبی ہو' مصالحِ عامہ کی بازیابی ہو اور معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام ہو تو یقیناً ایسی سیاست ہمارے دین کا ایک اہم حصہ ہے۔ اور اس اہم حصے کی انجام دہی کے لیے مسجدوں کو ان کے فعال کردار سے محروم کرنا زبردست غلطی ہو گی۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ہمارا دین ایک مکمل نظام حیات ہے۔ جس میں عقیدہ

بھی ہے، عمل صالح بھی اور عمل صالح کی طرف لوگوں کو بلانا بھی۔ لوگوں کو اچھی باتیں بتانا اور بری باتوں سے خبردار کرنا ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران:۱۱۰)

''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے انسانوں کی خاطر نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

حدیث شریف ہے:

اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ (مسلم)

''دین نام ہے اس کا کہ لوگوں کو نصیحت کی جائے اور انہیں بھلی بات بتائی جائے''۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن قوموں نے اس فریضے کی طرف سے غفلت برتی وہ اللہ کے نزدیک ملعون قرار پائیں۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۞ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۞

(المائدۃ:۷۸۔۷۹)

''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ بڑا بُرا عمل تھا جو وہ کر رہے تھے''۔

اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس اہم دینی فریضے کی ادائی میں مساجد کا بھی رول ہو اور اس عظیم الشان پلیٹ فارم سے لوگوں کی سیاسی اور فکری تربیت کا عمدہ انتظام

ہو۔ضرورت اسی بات کی ہے کہ اس عظیم منبر سے مسلمانوں کو ان کے دینی' سیاسی اور ملی مسائل سے آگاہ کیا جائے اور ان کے مسائل کا حل پیش کیا جائے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب مصر پر دشمنوں نے حملہ کیا تھا تو وزارت اوقاف کی طرف سے مجھے حکم ملا تھا کہ میں قاہرہ کی ایک بڑی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دوں اور لوگوں میں دشمنوں کیخلاف جذبوں اور حوصلوں کا اضافہ کروں۔ وقت کا شدید تقاضا تھا کہ میں اس منبر کو سیاسی اور جنگی مسائل پر خطبہ دینے کے لیے استعمال کروں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے خاطر خواہ مفید نتائج برآمد ہوئے۔ حالانکہ خود مصری حکومت نے اس سے قبل مجھ پر ہر قسم کی تدریسی وتقریری پابندی لگا رکھی تھی۔

مسجدوں میں ایسے خطبے بھی دیے جا سکتے ہیں جن میں حکومت کی غلط اور غیر مفید پالیسیوں پر تنقید کی جائے اور ارباب حکومت کو ان کی کوتاہیوں سے آگاہ کیا جائے بشرطیکہ ان خطبوں میں نام لے کر کسی خاص شخص کو لعن طعن کرنے سے پرہیز کیا جائے اور ان تمام باتوں سے اجتناب کیا جائے' جو شرعی حدود سے تجاوز کرتی ہوں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ مسجدوں کے خطبے اصلاحِ معاشرہ اور اقامتِ شریعت کے لیے ہوتے ہیں' اس لیے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی کہ برسرِ اقتدار پارٹی یا اپوزیشن پارٹی محض اپنی سیاست چمکانے یا سیاسی پروپیگنڈوں کے لیے مسجدوں کو استعمال کریں۔

جمعہ سے متعلق چند بدعتوں کی توضیح

سوال: بلاشبہ جمعہ کا دن تمام دنوں میں افضل ہے۔ جمعہ کی افضلیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لوگوں نے جمعہ کی عبادتوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی بدعتیں بھی شامل کر لی ہیں' جن کا حضور ﷺ کے زمانے میں رواج نہیں تھا۔ مثلاً جمعے کے دونوں خطبوں سے پہلے یا ان کے بعد ایک خطبہ دینا۔ اس خطبے کی اس طرح پابندی ہوتی ہے گویا یہ خطبہ جمعہ کے فرائض کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح جمعے کے دن پابندی کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر پر قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔ قرآن کی تلاوت ایک نیک عمل ہے' لیکن اس کی اس طرح پابندی کی

جاتی ہے گویا یہ جمعہ کی عبادتوں میں شامل ہے۔ کیا اس طرح کی بدعتوں میں پڑ کر مسلمان گمراہی کا شکار نہیں ہیں؟

جواب: میرے بھائی! ہر وہ عمل جس کی ایجاد حضور ﷺ کے بعد ہوئی ہو' اسے بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ بے شمار ایسے اعمال اور ایسی سرگرمیاں ہیں' جن کا حضور ﷺ کی زندگی میں کوئی وجود نہیں تھا اور ان کی ابتدا حضور ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی لیکن انہیں بدعت میں شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب آبادی میں کثرت کو محسوس کیا تو انہوں نے جمعہ کے دن ایک اور اذان کا اضافہ کر دیا۔ اس سے قبل جمعہ کے دن صرف ایک اذان دی جاتی تھی۔ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے متفقہ طور پر اس اضافی اذان کو قبول کیا اور کسی نے بھی اسے بدعت میں شمار نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کی نماز با جماعت پڑھنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اور کوئی بھی اسے بدعت نہیں کہتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں نے بہت سارے ایسے علوم و فنون ایجاد کیے جن کا حضور ﷺ کی زندگی میں کوئی وجود نہیں تھا اور ان علوم کی تدریس کا انتظام مسجدوں میں کیا جاتا تھا۔ مثلاً علمِ فقہ' علومِ نحو' علمِ صرف اور علمِ بلاغت وغیرہ۔ اور کبھی بھی ان علوم و فنون کو بدعت میں شمار نہیں کیا گیا۔

اس لیے ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ عمل جس کی ایجاد حضور ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی ہو اسے بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ بشرطیکہ یہ عمل اسلام کے مجموعی مزاج' اس کی تعلیمات اور اس کے اغراض و مقاصد سے مختلف اور متعارض نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں انسانوں کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں اور ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور روز بہ روز نئی نئی ترقیاں اور وسائل معرضِ وجود میں آتے رہتے ہیں۔ ان بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ہم بہت ساری ایسی باتوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جن کا حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میں کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ نئی باتیں اگر اسلام کی تعلیمات کیخلاف نہیں ہیں یا اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو

انہیں بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

جمعہ کے دونوں خطبوں سے قبل یا بعد میں ایک خطبہ دینا' ایسا عمل نہیں ہے جسے ہم بدعت یا گمراہی قرار دیں۔ کیونکہ اس خطبہ کی ابتدا کسی نیک مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ مسجد کی حیثیت دینی مرکز کی ہے۔ عہدِ نبوی ﷺ میں مسجد جس طرح عبادت اور دعوتِ دین جیسے بلند واعلیٰ مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اسی طرح کارہائے سیاست کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ اسی مسجد میں حضور ﷺ تقریریں کیا کرتے۔ اسی میں درس و تدریس کا انتظام کرتے۔ جہادی لشکر اسی مسجد سے رخصت کرتے تھے' اسی مسجد میں وفود اور سفراء کا استقبال کرتے اور ان کی باتیں سنتے تھے۔ بعض خوشی کے مواقع پر حضور ﷺ نے اسی مسجد میں حبشیوں کے کھیل تماشے کا انتظام کیا' خود بھی یہ کھیل تماشے دیکھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اپنے کندھے پر بٹھا کر دکھایا اور کافی لطف اندوز ہوئے۔ اسی مسجد میں بعض موقع پر شعری نشست رکھوائی۔ غرض کہ یہ مسجد مختلف نیک مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اگر ان مقاصد کے لیے مسجد کا استعمال شریعت کے خلاف نہیں ہے تو آخر اس اضافی خطبے میں کیا ممانعت ہو سکتی ہے جو جمعہ کے دونوں خطبوں سے قبل یا ان کے بعد دیا جاتا ہے۔ اس خطبے میں بھی اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے متعلق مسائل پر بحث ہوتی ہے جن کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے ہوتا ہے۔ اور لوگوں کو مفید اور کارآمد باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ بعض ممالک وہ ہیں جہاں جمعہ کے خطبے عربی میں دیے جاتے ہیں حالانکہ یہاں کے لوگ عربی نہیں سمجھتے۔ اس لیے ان کی آسانی کے لیے جمعہ کے دونوں خطبوں سے قبل ایک خطبہ ان کی مقامی زبان میں ہوتا ہے' تاکہ وہ بھی خطبوں کو سمجھنے سے محروم نہ رہیں۔ گرچہ افضل طریقہ یہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ بہ ذات خود مقامی زبان میں ہو لیکن اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ جمعہ کے خطبے عربی زبان میں ہوں اور ان سے قبل یا بعد میں ایک خطبہ مقامی زبان میں ہو۔ چونکہ اس خطبہ میں بھی اسلام کی تعلیم ہوتی ہے اس لیے اسے بدعت یا ضلالت قرار دینا سراسر غلط ہوگا۔

چاند کی توثیق کے لیے جدید آلات کا استعمال

سوال: ہر سال رمضان اور عید کے موقع پر یہ افسوسناک صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے کہ چاند دیکھنے کے مسئلے پر ہمارے درمیان اختلافات رونما ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات یہ اختلافات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ ایک ہی شہر کے اندر مسلمان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک کی آج عید ہوتی ہے تو دوسرا گروہ کل عید مناتا ہے۔ اس سے غیر مسلموں کو ہم پر ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقع مل جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم اپنے سارے اختلافات کے باوجود کم از کم رمضان اور عید جیسے موقعوں پر متحد ہو جاتے اور غیر مسلموں کو اپنی قوت واتحاد کا احساس دلاتے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ چاند کے مسئلے کو لے کر بات بسا اوقات اختلافات سے گزر کر عداوت اور مخاصمت تک پہنچ جاتی ہے۔

کیا مسلمانوں کا ہر سال اس طرح اختلاف کرنا قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ مسلم ماہرینِ فلکیات کی خدمت اور مشوروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چاند نکلنے کی تاریخ اور دن کو طے کر لیا جائے۔ آج سائنسی ٹیکنالوجی اس قدر ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ انسان کے قدم نہ صرف یہ کہ چاند تک پہنچ چکے ہیں' بلکہ اسی ٹیکنالوجی کی مدد سے کسی بھی شہر اور علاقہ کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ جانا جاسکتا ہے کہ اس شہر میں چاند کس دن اور کس گھنٹے اور کس منٹ میں نظر آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمِ فلکیات کی مدد سے چاند نکلنے کے مسئلہ کو بہت آسانی کے ساتھ حل کیا جاسکتا ہے اور اس طرح ہم ہر سال رونما ہونے والے اختلافات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: مختلف صحیح احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان اور عید کی آمد کو تین طریقوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ان طریقوں کے بیان سے قبل اس سلسلے میں پائی جانے والی چند احادیث کو پیش کرتا ہوں:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَافْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ فَاِنْ غُبِّيَ عَلَيْكُمْ فَاكْمِلُوا عِدَّةَ

شَعْبَانَ ثَلَاثِيْنَ (بخاری و مسلم)

''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور اسے دیکھ کر رمضان ختم کرو۔ اگر (بادل کی وجہ سے) چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے پورے تیس دن مکمل کر لو (شعبان کو تیس دنوں کا تسلیم کر کے رمضان کی شروعات کی جائے)''

(۲) حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوْا لَهٗ (بخاری و مسلم)

''روزہ نہ رکھو جب تک کہ چاند نہ دیکھ لو۔ اور رمضان نہ ختم کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو' لیکن اگر بدلی رہے تو اندازے اور حساب سے روزے رکھو''۔

ان دونوں صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ رمضان اور عید کی آمد کو مندرجہ ذیل تین طریقوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

(۱) چاند دیکھ کر

(۲) شعبان کے پورے تیس دن مکمل کر کے

(۳) اندازے اور حساب کے ذریعے

جہاں تک چاند دیکھنے کا مسئلہ ہے اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ اس معاملے میں دو اور اس سے زائد لوگوں کی گواہی ضروری ہے یا ایک آدمی کی گواہی کافی ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک ایک شخص کی گواہی کافی ہے۔ بعض کم از کم دو شخصوں کی گواہی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ حنفی مسلک یہ ہے کہ اگر مطلع صاف ہے تو ایک دو آدمی کی گواہی کافی نہیں ہے' بلکہ بہت سارے لوگوں کی گواہی ضروری ہے' کیونکہ مطلع صاف ہونے کی صورت میں ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ صرف ایک دو آدمی ہی چاند دیکھ سکیں اور باقی نہ دیکھ سکیں۔ ہاں اگر مطلع ابر آلود ہے تو ایک دو آدمی کی گواہی کافی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مطلع صاف ہو یا ابر آلود اگر شعبان کی انتیس تاریخ کو کسی نے بھی چاند نہ دیکھا تو ایسی صورت میں شعبان کے تیس دن مکمل کر کے رمضان کا آغاز ہوگا۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ ہم شعبان کی ابتدا اور اس کی تاریخوں کا بھی حساب رکھیں' کیونکہ جب تک ہمیں یہ نہیں معلوم ہوگا کہ آج شعبان کی ۲۸ تاریخ ہے یا ستائیس' اس وقت تک ۲۹ یا تیس تاریخ کا تعین کیسے ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ اُمت مسلمہ کے ذمّے دار حضرات تمام قمری مہینوں کے حساب و کتاب کا اہتمام کریں کیونکہ ہر مہینہ دوسرے مہینے سے جڑا ہوا ہے۔

چاند کے اثبات کا تیسرا طریقہ حدیث میں یوں بیان ہوا ہے ''فَاقْدِرُوْا لَهٗ'' احناف اور جمہور علماء وفقہاء اس جملہ کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں کہ مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں چاند کو تیس دن کا تصوّر کر لیا جائے گا اور شعبان کے تیس دن مکمل ہونے کے بعد رمضان کی شروعات ہوگی۔ لیکن امام ابو العباس بن سریج جو ایک زبردست شافعی فقیہ و عالم ہیں' اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اَکْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ'' شعبان کے پورے تیس دن مکمل کرلو۔ اس حکم کے مخاطب عوام الناس ہیں' جبکہ ''فَاقْدِرُوْا لَهٗ'' کے مخاطب کچھ خاص لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فلکیات کے اعداد و شمار کا علم رکھتے ہیں اور ان اعداد و شمار کی بنا پر وہ چاند کے طلوع ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کچھ یقینی بات کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ ایک عام آدمی جسے فلکیات کا علم نہیں ہے چاند کے طلوع ہونے کا اندازہ کیسے لگا سکتا ہے۔ گویا ''فَاقْدِرُوْا لَهٗ'' کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ اعداد و شمار اور حساب کے ذریعے چاند کے طلوع ہونے کا اندازہ اور تخمینہ لگاؤ۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اور حنبلی مسلک کے علماء کہتے ہیں کہ اعداد و شمار اور حساب کے ذریعے چاند کے طلوع ہونے کا اندازہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے' کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسِبُ (بخاری' مسلم)

''ہم ایسی اُمت ہیں جو ناخواندہ ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب لگانا

جانتے ہیں"۔

حضور ﷺ نے یہ بات چاند کے طلوع کا حساب لگانے کے سلسلے میں فرمائی تھی کہ ہم تو ان پڑھ لوگ ہیں' چاند کے طلوع ہونے کا حساب کتاب لگانا کہاں آتا ہے۔ اس بنا پر حنبلی مسلک ماننے والے کہتے ہیں کہ اگر ہم مسلمانوں کو اس بات کا مکلّف کر دیا جائے کہ ہم اعداد و شمار کے ذریعے چاند کے طلوع ہونے کا اندازہ لگائیں تو یہ بڑی پریشان کن بات ہوگی کیونکہ فلکیات کے اعداد و شمار سے واقف کار حضرات مسلمانوں میں شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں اور وہ بھی صرف بڑے شہروں میں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس حدیث سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ اعداد و شمار کے ذریعے چاند کے طلوع کا اندازہ لگانے سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے' غلط ہے۔ اس حدیث میں فقط اتنی بات ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اُمت ان پڑھ ہے۔ یہ حساب کتاب اور اعداد و شمار سے ناواقف ہے۔ اس لیے اس اُمت سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ چاند کے طلوع ہونے کا ٹھیک اندازہ لگا سکتی ہے۔ اس حدیث میں حساب لگانے اور اعداد و شمار کرنے سے منع نہیں کیا گیا ہے اور نہ اس بات کی ہی ترغیب دی گئی ہے کہ ہم ان پڑھ اُمت ہیں اور ہمیشہ ان پڑھ ہی رہیں۔ چنانچہ اس اُمت میں جہالت اور ناخواندگی کیخلاف آواز اٹھانے والے سب سے پہلے شخص نبی ﷺ ہی تھے اور اسی اسلامی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جلد ہی مسلمانوں میں تعلیم عام ہو گئی۔ وقت کے جید علماء پیدا ہوئے اور وہ دور بھی آیا جب مسلمانوں میں سائنسدان' علماء و مشائخ اور ہر علم کے ماہرین کی اچھی خاصی تعداد پائی جانے لگی۔

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ فلکیات کا علم صرف شاذ و نادر ہی لوگ رکھتے ہیں اور وہ بھی صرف بڑے شہروں میں۔ یہ بات پرانے زمانے میں تو صحیح ہو سکتی تھی لیکن آج کے اس ترقی یافتہ دور میں صحیح نہیں' کیونکہ اب علمِ فلکیات دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ چاند کی گردش اور اس کے مدارج پر نگاہ رکھنے کے لیے بڑی بڑی رصد گاہیں بنائی

گئی ہیں اور فضا میں متعدد سیارچے (Satellite) تیر رہے ہیں‘ جن سے چاند کی گردش کی مکمل خبر رہتی ہے۔ ان تمام ذرائع سے اب اس بات کا صدفی صد یقینی علم رکھنا بہت آسان ہو گیا ہے کہ چاند کسی شہر میں کتنے بج کر کتنے منٹ پر طلوع ہو گا۔ اب علم کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے شہروں کی کوئی تفریق نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ ذرائع مواصلات اتنے تیز ہیں کہ کوئی بھی خبر پل بھر میں ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کے علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ چاند کے طلوع ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں علمِ فلکیات کی خدمت حاصل کی جائے کیونکہ یہ علم صدفی صد صحیح واقفیت فراہم کرسکتا ہے۔ اس طرح سے ہر قسم کے اختلاف سے بچا جاسکتا ہے۔

بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فلکی اعداد و شمار سے مراد وہ جنتریاں یا کیلنڈر ہیں‘ جن میں سال بھر کی تاریخ نمازوں کے اوقات‘ قمری مہینوں کا اندراج اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ یہ جنتریاں ہمارے بازاروں میں بھی کثرت سے فروخت ہوتی ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دن‘ تاریخ اور وقت کے معاملہ میں ان جنتریوں میں بڑا اختلاف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جنتریاں جو معلومات فراہم کرتی ہیں ان کی بنیاد ٹھوس علمی اور سائنسی حقائق پر نہیں ہوتی۔ اس لیے ان جنتریوں پر اعتماد کرنا غلط ہے۔ فلکی اعداد و شمار سے مراد وہ ٹھوس علمی اور سائنسی معلومات ہیں جو فلکی رصد گاہیں (دوربین) سیّارچے (Satellite) اور علمِ فلکیات پیش کرتے ہیں اور جن کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر ہوتی ہے اور جن میں غلطی کا احتمال تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

بعض علماء اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں علمِ فلکیات اور اس کی فراہم کردہ معلومات کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ حضور ﷺ نے ہمیں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے اور روزہ ختم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھیں اور عید منائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمِ فلکیات کی فراہم کردہ معلومات کو نظر انداز کر دینا اور صرف چاند دیکھنے پر اصرار کرنا صحیح بات نہیں ہے‘ کیونکہ:

(۱) یہ بات خلاف عقل ہوتی کہ حضور ﷺ ایسی قوم کو علمِ فلکیات کے ذریعہ اور اعداد و شمار کے ذریعہ چاند کی رویت کا فیصلہ کرنے کا مشورہ دیتے جو ان پڑھ اور ناخواندہ تھی۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے خود ہی اعتراف کیا کہ ہم تو ناخواندہ اُمت ہیں' ہمیں لکھنا اور حساب رکھنا کہاں آتا ہے۔ اس ناخواندہ قوم کو حضور ﷺ نے چاند کی رویت کے لیے ایسے طریقۂ کار کا حکم دیا' جو اس کے بس میں تھا اور جو اس قدیم زمانے میں ہر شخص کے لیے آسان ترین طریقہ تھا اور وہ تھا آنکھوں سے چاند دیکھنا۔ اب اگر اس ترقی یافتہ زمانے میں چاند کا پتا کرنے کے لیے دوسرے یقینی ذرائع میسر ہیں تو ان ذرائع کے استعمال میں کیا قباحت ہوسکتی ہے؟

(۲) دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے چاند دیکھنے کے علاوہ "فاقدروا لہ" کا بھی حکم دیا ہے۔ اس جملہ کا سیدھا سادھا ترجمہ یہ ہے کہ "چاند کا اندازہ کرلو" ظاہر ہے کہ علمِ فلکیات کے اعداد و شمار بھی تو اندازہ کرنے کا ایک یقینی طریقہ ہے۔

(۳) حدیث میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے کا حکم ہے' لیکن اصل مقصد چاند دیکھنا نہیں ہے' بلکہ اصل مقصد صحیح وقت پر روزہ رکھنا ہے۔ اس اصل مقصد کے حصول کے لیے حضور ﷺ نے اس زمانے کے لحاظ سے ایک آسان طریقہ چاند دیکھنا بتایا ہے۔

لیکن اس حدیث میں اس بات کی ممانعت نہیں ہے کہ ہم دوسرے طریقے اختیار نہیں کرسکتے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں اگر اصل مقصد کے حصول کے لیے دوسرے بہتر طریقے میسّر ہیں تو انہیں اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ خاص کر ایسی صورتِ حال میں کہ چاند کا دیکھنا اس دور میں کافی مختلف فیہ مسئلہ بن چکا ہے۔ اس کی وجہ سے بڑے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ اگر علمِ فلکیات کے اعداد و شمار کے ذریعے ان مسائل اور اختلاف کو ختم کیا جاسکتا ہے' تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس طریقۂ کار کو اختیار کریں۔

مختصر یہ کہ میں طویل عرصہ سے اپنے مسلمان بھائیوں سے اپیل کرتا آیا ہوں کہ ہر سال عید اور رمضان کے موقع پر چاند کی وجہ سے ہمارے درمیان جو شدید اختلافات

رونما ہو جاتے ہیں' بلکہ بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے' یہ کافی افسوسناک صورتِ حال ہے اور اسے ختم ہونا چاہئے۔

اگر ہم چاند دیکھنے کے ساتھ ساتھ علمِ فلکیات' رصدگاہوں اور سیٹلائٹ وغیرہ کی مدد حاصل کریں تو صدفی صد یقین کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ چاند کس شہر میں کس وقت طلوع ہوگا اور اس طرح اس جھگڑے پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم غیر مسلموں کے سامنے اپنے اتحاد و اتفاق کا نمونہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔

سارے ملک میں ایک ساتھ رمضان اور عید منائیں۔ اگر سارے ملک میں ایک ساتھ رمضان اور عید کرنا ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ ایک علاقے کی حد تک رمضان اور عید ایک ساتھ ہو۔ کیونکہ یہ صورتِ حال نہایت تکلیف دہ ہے کہ ایک ہی علاقہ اور شہر میں دو الگ الگ دنوں میں عید کی نماز پڑھی جائے اور دو الگ الگ دنوں میں رمضان کا آغاز ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا دین' اسلام اس قسم کے تفرقہ کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

چوتھا باب

عورت اور خاندان

☆ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوانے کی ذمے داری

☆ کیا عورت فتنہ ہے؟

☆ عورتوں پر نظر ڈالنے کے شرعی حدود

☆ عورتوں کو سلام کرنا

☆ عورتوں اور مردوں کے باہمی اختلاط کے شرعی حدود

☆ نامحرم مریض یا مریضہ کی عیادت

☆ عورتوں سے مصافحہ کرنا

☆ عورتوں کا نوکری کرنا

☆ نقاب یا بُرقع

☆ پردے کی حیثیت

☆ مہر کی حکمت وغایت

☆ محبت اور شادی

☆ بیوی کو ڈانٹنا اور زدوکوب کرنا

☆ شوہر اور بیوی کو طلاق کے اختیارات

☆ عورت اور سیاست

☆ عاق کا مسئلہ

۴

حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوانے کی ذمّے داری

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت حوا کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے تھے؟ کیونکہ انہوں نے ہی حضرت آدم علیہ السلام کو ممنوعہ پھل کھانے پر آمادہ کیا تھا۔ کیا ایسا کر کے انہوں نے پوری نسلِ انسانی کو جنت سے محروم نہیں کر دیا؟ عورتوں پر تنقید کرنے والے اور انہیں تمام فسادات اور مصائب کا ذمّے دار سمجھنے والے عام طور پر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات درست ہے؟

جواب: یہ نقطۂ نظر کہ حضرت حوّا بہ الفاظ دیگر عورت تمام نسلِ انسانی کی بدبختی اور بربادی کی ذمہ دار ہے' بلاشبہ غیر اسلامی نقطہ نظر ہے۔ اس نقطۂ نظر کا ماٴخذ تحریف شدہ تورات ہے جس پر یہود و نصاریٰ ایمان رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق ان کے دانشور اور مفکرین لکھتے اور بولتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض نام نہاد مسلم دانشور بھی بلاسوچے سمجھے ان کے راگ میں راگ ملاتے ہیں۔

قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے جنت سے نکالے جانے کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس قصے سے متعلق آیتوں کو یکجا کرنے اور ان کے مطالعے سے درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ممنوعہ درخت کا پھل نہ کھانے کا حکم بیک وقت حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا دونوں کو دیا تھا۔ اللہ کے حکم کے مطابق دونوں ہی اس بات کے مکلّف تھے کہ اس درخت کے قریب نہ جائیں۔ اللہ فرماتا ہے:

وَ قُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ○

(البقرۃ:۳۵)

''اور ہم نے آدمؑ سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بہ فراغت جو چاہو کھاؤ' مگر تم دونوں اس درخت کا رُخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے''۔

(۲) آدم علیہ السلام کو ورغلانے والی حضرت حواؑ نہیں تھیں بلکہ ان دونوں کو بہکانے والا اور جنت سے نکلوانے والا شیطان تھا۔ اس سلسلے میں اللہ کا فرمان ملاحظہ ہو:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ص (البقرۃ:۳۶)

''مگر شیطان نے ان دونوں کو اسی درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹادیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے''۔

سورۂ بقرہ کے علاوہ سورۂ اعراف میں بھی اس واقعے کی تفصیل ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

وَ يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا لَاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ○ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ○ وَقَاسَمَهُمَا اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ○

(الاعراف:۱۹۔۲۱)

''اور اے آدم! تم اور تمہاری بیوی تم دونوں اس جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ۔ لیکن اس درخت کے قریب تم دونوں نہ جانا ورنہ تم دونوں اپنے آپ پر بڑا ظلم کرو گے۔ چنانچہ شیطان نے ان دونوں کو بہلایا پھسلایا

تا کہ ان کی جو شرمگاہیں ڈھکی ہوئی ہیں وہ کھول دے۔ اور اس نے ان دونوں سے کہا کہ تمہارے ربّ نے تم دونوں کو اس درخت سے صرف اس لیے منع کیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہیشگی کی زندگی نہ عطا ہو جائے اور اس نے ان دونوں سے قسمیں کھا کھا کر کہا میں تمہیں بہت خلوص کے ساتھ نصیحت کر رہا ہوں''۔

سورہ طٰہٰ میں بھی اس واقعہ کا تذکرہ ہے اور اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے جو تعبیر اختیار کی ہے' اس کے مطابق بھٹکنے اور گمراہ ہونے کی پہلی ذمّے داری حضرت آدم علیہ السلام پر عائد ہوتی ہے نہ کہ حضرت حوا پر اور یہی وجہ ہے کہ اللہ کی سرزنش اور تنبیہ کا سارا رُخ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ہے نہ کہ حوا کی طرف۔ ملاحظہ ہو:

فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ○ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ○ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ○ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ○ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ○ (طٰہٰ: ۱۱۷-۱۲۱)

''پس ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے' دیکھو یہ تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے' ورنہ تم بڑے بدبخت ہو گے۔ اس جنت میں تمہارے لیے یہ نعمت ہے کہ نہ تمہیں بھوک لگے گی اور نہ ننگے ہو گے۔ نہ پیاس لگے گی اور نہ دھوپ ستائے گی۔ چنانچہ شیطان نے آدم کو بہلایا پھسلایا۔ اس نے کہا: اے آدم! کیا میں ہیشگی والے درخت اور نہ ختم ہونیوالی بادشاہت کا تمہیں پتا نہ بتاؤں۔ چنانچہ ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو ان کی شرمگاہیں کھل گئیں اور یہ دونوں اپنی شرمگاہوں پر

جنت کے پتے ڈالنے لگے۔ آدم علیہ السلام نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی اور گمراہ ہو گیا‘‘۔

مذکورہ آیت میں نافرمانی اور گمراہی کی نسبت واضح طور پر آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے۔

(۳) قرآن نے واضح طور پر صراحت کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کس غرض و غایت کے تحت پیدا کیا ہے۔ اور اس غرض و غایت کی وضاحت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل ہی کر دی گئی تھی۔ اللہ فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ:۳۰)

’’اور یاد کرو جب تمہارے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ تخلیق کرنے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کہ اے رب! تو زمین پر ایسی مخلوق بنا رہا ہے جو فساد پھیلائے گی اور خون بہائے گی۔ ہم تو تیری حمد و تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو‘‘۔

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان عالمِ بالا میں ملاقات ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے گفتگو کے دوران نسلِ انسانی کی بدبختی اور اس کے جنت سے محروم ہو جانے کی ذمہ داری آدم علیہ السلام پر ڈالنی چاہی تو آدم علیہ السلام نے قطع کلام کرتے ہوئے انہیں سمجھایا کہ یہ سب کچھ میری غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا' بلکہ اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے قبل ہی سب کچھ طے کر دیا تھا۔ اور تمہیں تورات میں یہ سب کچھ لکھا ہوا ملے گا۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

اس معصیت کا ذمہ دار حضرت آدم علیہ السلام کو قرار دینا چاہا' حضرت حوا کو نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ تورات میں اس معصیت کا حضرت حوا کی طرف منسوب ہونا اس کی تحریف شدہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ممنوعہ درخت کا پھل کھانا اور اس کی پاداش میں انہیں جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیا جانا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے آدم کی تخلیق سے قبل ہی طے کر رکھا تھا۔ اس لیے تقدیر کے مطابق ان باتوں کا وقوع پذیر ہونا طے شدہ تھا۔

(۴) وہ جنت جس میں آدم علیہ السلام تخلیق کے بعد رکھے گئے تھے اور جس کے درخت کا پھل کھانے کی وجہ سے زمین پر بھیج دیے گئے تھے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ یہ وہی جنت ہو' جو آخرت میں نیک اور صالح بندوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جس جنت میں حضرت آدم علیہ السلام تخلیق کے بعد رکھے گئے تھے وہ اسی زمین کی کوئی جنت ہے اور جنت سے مراد خوبصورت باغ اور سرسبز و شاداب علاقہ ہے' کیونکہ عربی زبان میں جنت خوبصورت باغ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن میں متعدد مقامات پر لفظ جنت کو اسی زمین باغ' کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ قلم کی یہ آیت:

إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ (القلم:۱۷)

''ہم نے ان لوگوں کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا''۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ (الکہف:۳۲)

''ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ ان دو لوگوں کی جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور ان کے گرد کھجور کی درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پھولے

اور پھل دینے میں کوئی کمی نہیں کی‘‘۔

کیا عورت فتنہ ہے؟

سوال: ہمارے معاشرے میں عورت سے متعلق بڑی بدگمانیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں ہر مصیبت اور ہر فساد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ عورت ہی تھی جس نے آدم علیہ السلام کو شجر ممنوعہ کھانے پر آمادہ کرلیا اور اس کی پاداش میں حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکال دیے گئے۔ بعض لوگ عورت کو فتنہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت مکمل فتنہ ہے اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کبھی ضعیف اور گھڑی ہوئی حدیثیں پیش کرتے ہیں اور کبھی ایسی صحیح حدیث پیش کرتے ہیں جسکا مفہوم وہ نہیں ہوتا جیسا وہ سمجھتے ہیں مثلاً یہ حدیث جس میں عورتوں کے فتنہ سے خبردار کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما ترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء

’’میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ نقصان دہ کوئی دوسرا فتنہ نہیں چھوڑا ہے‘‘۔

اس حدیث میں عورتوں کے فتنہ سے کیا مراد ہے؟ یہ لوگ اس طرح کی حدیثیں پیش کر کے عورتوں کو مکمل فتنہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں ان کا رویہ بڑا سخت ہوتا ہے۔ عورتوں کے فتنے سے محفوظ رہنے کے لیے انہوں نے عورتوں پر بڑی سخت قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ ان کے نزدیک عورتوں کا پردہ بھی بہت ہی سخت قسم کا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ عورتوں کی آواز بھی ان کے نزدیک پردہ ہے‘ تاکہ کوئی غیر محرم ان کی آواز نہ سن سکے۔ ان کے نزدیک بہتری اسی میں ہے کہ عورت اپنی موت تک گھر کی چہار دیواری میں مقید رہے۔ جبکہ اسلام نے عورتوں کو جتنی عزت بخشی ہے کسی اور مذہب نے نہیں بخشی ہے۔ عورتوں کے ساتھ انصاف کرنے اور انہیں ان کے مکمل حقوق ادا کرنے کے معاملے میں اسلام کا کردار سب سے نمایاں ہے۔

لیکن اس بات پر صدقِ صدیقین کے باوجود ہم اس بات سے قاصر ہیں کہ عورتوں کے معاملہ میں متشدد اور سخت گیر قسم کے علماء کو قائل کر سکیں۔ اس لیے کہ ہمارا علم کوتاہ ہے۔ آپ سے رہنمائی کی درخواست ہے۔

جواب: حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورتوں کا مسئلہ جس قدر افراط و تفریط کا شکار ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ یہ ایسا حساس اور جذباتی مسئلہ (Issue) بن کررہ گیا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے' سچ کیا ہے اور غلط کیا؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی ایسا دین' مذہب یا فلسفۂ حیات نہیں ہے' جس نے عورت کو اس کا مکمل جائز حق اور عدل وانصاف عطا کیا ہو اور اس کی نسوانیت کی حفاظت کی ہو۔ اسلام نے عورت کو کئی حیثیتوں سے عزت بخشی ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے' ایک صنفِ نازک کی حیثیت سے' ایک ماں کی حیثیت سے' ایک بیوی کی حیثیت سے' ایک بیٹی کی حیثیت سے اور ایک معاشرے کے ایک فردِ کامل کی حیثیت سے۔

انسان کی حیثیت سے عورت کی عزت افزائی اس طرح کی گئی ہے کہ ذمّہ داریوں اور فرائض کے معاملے میں عورت مرد کے برابر ہے۔ دونوں یکساں درجے کے ذمّہ دار ہیں اور یکساں طور پر انعام یا سزا کے حق دار ہیں۔ کسی انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے برابر تھا اور اس حکم کی نافرمانی پر دونوں کو یکساں سزا دی گئی۔ اللہ کا یہ پہلا حکم حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا دونوں کے لیے تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ پہلا حکم کچھ یوں تھا:

اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا لَاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (البقرۃ:۳۵)

''تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو بہ فراغت کھاؤ لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے''۔

ماں کی حیثیت سے اسلام نے عورت کو جو عزت بخشی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اسلام نے ماں کے پیروں تلے جنت قرار دے کر اسے جو بلند مقام عطا کیا ہے' وہ سب پر ظاہر ہے۔ بیوی کی حیثیت سے اس طرح عزت بخشی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي (ترمذی)

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے بہتر ہے۔ اور میں اپنی بیوی کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں''۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ بعض سخت مزاج اور تشدد پسند مسلمان عورتوں کے معاملے میں بڑا ظلم کرتے ہیں۔ انہوں نے عورتوں کو ان حقوق سے بھی محروم کر دیا ہے جنہیں اسلامی شریعت نے انہیں ایک انسان اور ایک عورت کی حیثیت سے عطا کیا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ ساری حق تلفیاں اور زیادتیاں دین اور مذہب کے نام پر ہوتی ہیں' حالانکہ ہمارا دین اس طرح کی حق تلفیوں سے پاک ہے۔ عورتوں کو کم عقل ثابت کرنے کے لیے لوگوں نے حضور ﷺ کی طرف یہ من گھڑت حدیث منسوب کر دی۔ شاوروھن وخالفوھن ''ان عورتوں سے مشورہ کرو لیکن ان کے مشورے پر عمل نہ کرو''۔

یہ واضح طور پر ایک من گھڑت اور بے بنیاد حدیث ہے' کیونکہ خود نبی ﷺ اپنی بیویوں سے مشورہ فرماتے اور ان مشوروں پر عمل بھی کیا کرتے تھے۔ مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور نے اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا اور ان کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے اس پر عمل بھی کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر و برکت عطا کی۔

انہی حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف یہ قول غلط طور پر منسوب کر دیا المراۃ شر کلھا وشر ما فیھا انہ لابد منھا ''عورت مکمل بُرائی ہے اور اس کی سب سے بڑی بُرائی یہ ہے کہ اس کی بُرائی سے مفر نہیں ہے''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اس قول کا انتساب بالکل غلط اور بے بنیاد ہے' کیونکہ یہ

ایک غیر منطقی اور غیر معقول قول ہے۔ اور اس طرح کی واہیات بات حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کہہ ہی نہیں سکتے ہیں' کیونکہ یہ بات قرآن کی تعلیمات کے عین خلاف ہے۔ قرآن نے جہاں واجبات وفرائض کے سلسلے میں مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے وہاں مرد وعورت دونوں یکساں طور پر مخاطب ہیں۔ اسی طرح جزا وسزا کے معاملے میں بھی عورت اور مرد دونوں برابر ہیں۔ نماز پڑھنے کا حکم دونوں کے لیے یکساں طور پر ہے اور نماز نہ پڑھنے کی صورت میں دونوں کو ایک جیسی سزا اور پڑھنے کی صورت میں ایک جیسا انعام ملے گا۔

اسی طرح کی ایک من گھڑت اور بے بنیاد بات یہ ہے کہ عورت کی آواز پردہ ہے اور یہ جائز نہیں ہے کہ شوہر اور محرم کے علاوہ کوئی دوسرا اس کی آواز سنے۔ اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ شوہر اور محرم کے علاوہ کسی اور کے ساتھ بات کرے' کیونکہ اس کی آواز پردہ ہے۔ اس طرح کی بے بنیاد بات کرنے والوں سے میں نے اس کی دلیل پوچھی تو وہ کوئی دلیل نہیں پیش کر سکے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے' بلکہ قرآن وحدیث میں اس کے برعکس بات کہی گئی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے پردہ کی اوٹ میں بات کر سکتے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں پردے کی اوٹ میں رہ کر غیر محرموں سے بات کرتی تھیں اور انہیں مفید مشورے دیتی تھیں۔ مسائل کا حل بتاتی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سناتی تھیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں بلا کسی رکاوٹ کے مردوں کی موجودگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر ان سے مسائل دریافت کرتی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بڑے اطمینان سے جواب دیتے تھے اور کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس بات پر نہیں ٹوکا کہ تم مردوں کی موجودگی میں آکر کیوں باتیں کرتی ہو؟ خلفاءِ راشدین کے زمانے میں بھی عورتوں کی آواز کو پردہ نہیں تصور کیا جاتا تھا چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر

خطبہ دے رہے تھے۔ دورانِ خطبہ کسی عورت نے عمر رضی اللہ عنہ کو کسی بات پر بھری مجلس میں ٹوکا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا۔ اور کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ اس عورت نے بھری مجلس میں بات کیوں کی۔ کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عورت کی آواز کو پردہ نہیں تصور کرتے تھے۔

سورۂ قصص میں اللہ تعالیٰ نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ واقعہ کے درمیان اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی بزرگ (غالباً نبی) کی دو بیٹیوں سے بات کی اور پانی بھرنے میں ان کی مدد کی اور ان کے ساتھ چل کر ان کے گھر بھی گئے۔ اگر عورت کی آواز پردہ ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام کبھی ان لڑکیوں سے باتیں نہ کرتے اور نہ ان بزرگ کی بیٹیاں ان سے بات کرنے کو پسند کرتیں۔

حق بات یہ ہے کہ اسلامی شریعت نے مردوں کو عورتوں سے یا عورتوں کو مردوں سے بات کرنے کی ممانعت نہیں کی ہے۔ ممانعت اس بات کی ہے کہ عورتیں مردوں سے لبھانے والے انداز میں بات کریں۔ مردوں سے بات چیت کرنا منع نہیں ہے' بلکہ پیار بھرے لہجے میں اور لبھانے والے انداز میں بات کرنا منع ہے۔ درج ذیل آیت اسی ممانعت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

(الاحزاب: ۳۲)

''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو' اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ جس کے دل میں کھوٹ ہے کسی لالچ میں پڑ جائے اور بھلی بات کیا کرو''۔

اگر محض بات چیت کرنے کی ممانعت ہوتی تو اللہ تعالیٰ کبھی آیت کے آخر میں ''قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا'' نہ فرماتا جس کے معنیٰ ہیں ''اور بھلے طریقے سے بات کرو'' معلوم

ہوا کہ لبھانے والے انداز میں اور پھوہڑ طریقے سے بات چیت کرنے کی ممانعت ہے۔ اور بھلے طریقے سے بات چیت کرنے کی اجازت ہے۔ اگر عورت کی آواز پردہ ہوتی تو اللہ کبھی بات چیت کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی آواز پردہ نہیں ہے۔

آپ نے جس حدیث کا اپنے سوال میں حوالہ دیا ہے' اس حدیث کو سمجھنے میں بھی لوگوں نے زبردست غلطی کی ہے۔ وہ حدیث ہے:

مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً آخَرَ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ

''میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ ضرر رساں فتنہ نہیں چھوڑا''۔

انہوں نے یہاں لفظِ فتنہ سے یہ مفہوم اخذ کرلیا کہ عورتیں مصیبت اور فتنہ کی جڑ ہیں یا جس طرح حضور ﷺ نے فقر و فاقہ اور بیماری کو فتنہ قرار دے کر ان سے پناہ مانگی ہے' عورتیں بھی کچھ اسی قسم کا فتنہ ہیں۔ حالانکہ حدیث کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ لفظ فتنہ عربی زبان میں آزمائش اور امتحان کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وہ چیز جس کے ذریعے سے کسی کی آزمائش ہو۔ یہ آزمائش کبھی بُری چیزوں کے ذریعے ہوتی ہے اور کبھی بھلی چیزوں کے ذریعے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی پریشانیوں میں مبتلا کر کے آزماتا ہے اور کبھی نعمتیں عطا کر کے آزماتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ (الانبیاء:۳۵)

''اور ہم اچھے اور بُرے دونوں سے تمہاری آزمائشیں کرتے ہیں''۔

اس لیے عربی زبان میں لفظ فتنہ کبھی بُری چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی بھلی چیزوں کے لیے۔ مثلاً مال اور اولاد اللہ کی بڑی نعمتیں ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی فتنہ قرار دیا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ (التغابن:۱۵)

''بلاشبہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد آزمائش کا سامان ہے''۔

یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں ہیں' لیکن اللہ ہی نعمتوں کے ذریعے سے اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے کہ کہیں یہ بندے ان نعمتوں میں مگن ہو کر اپنے ربّ کو بھول تو نہیں جاتے ہیں اور اپنے فرائض کی ادائی میں کوتاہی تو نہیں کرتے ہیں۔ اس مفہوم میں قرآن کی یہ آیت ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (المنافقون:۹)

''اے مومنو! دیکھو تمہاری دولت اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے''۔

انسان جس طرح مال و اولاد کے ذریعے آزمایا جاتا ہے درآں حالے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی نعمتیں ہیں' اسی طرح عورتیں اور بیویاں بھی اللہ کی نعمت ہونے کے باوجود آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ یہ عورتیں فتنہ و فساد کی جڑ نہیں ہیں اور نہ بُرائیوں کا گہوارہ ہیں۔ بلکہ حضور ﷺ کے قول کے مطابق نیک بیویاں اللہ کا بڑا انعام ہیں۔ اور اس انعام میں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے آزمائش رکھی ہے کہ کہیں یہ بندے عورتوں کے چکر میں اپنے ربّ کو فراموش تو نہیں کر بیٹھتے۔ اسی آزمائش کی طرف درج ذیل آیت میں اشارہ ہے:

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (التغابن:۱۴)

''تمہاری بیویوں اور آل اولاد میں بھی تمہارے دشمن ہوتے ہیں' پس ان سے ہوشیار رہو''۔

ایک صحیح حدیث میں نبی ﷺ نے مال و دولت اور عیش و عشرت کی فراوانی سے خبردار کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

وَاللّٰهِ مَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ اَخْشٰى اَنْ تُبْسَطَ الدُّنْيَا

عَلَيْكُمْ كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا فَتُهْلِكُكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ (بخاری ومسلم)

''بہ خدا مجھے تمہارے سلسلے میں فقر و فاقہ کا اندیشہ نہیں ہے۔ مجھے اندیشہ اس بات کا ہے کہ دنیا تم پر وسیع کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر وسیع کر دی گئی تھی اور تم بھی دنیا کمانے کے لیے اسی طرح ایک دوسرے کا مقابلہ کرو گے جیسا ان لوگوں نے کیا۔ پھر یہ دنیا بھی تمہیں ویسے ہی برباد کر دے گی جیسے اس نے ان لوگوں کو برباد کیا تھا''۔

اس حدیث کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ حضور ﷺ غربت اور فقیری کو پسندیدہ اور مرغوب شے سمجھتے تھے اور اس کی طرف اپنی اُمت کو دعوت دے رہے تھے۔ کیونکہ خود حضور ﷺ نے غربت اور فقیری سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ اور یہ بات بھی نہیں ہے کہ حضور ﷺ اپنی اُمت میں خوشحالی اور دولت کی فراوانی کو ناپسندیدہ شے سمجھتے تھے' کیونکہ خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ''نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ'' (مسند احمد) عمدہ مال و دولت صالح شخص کے لیے کیا خوب نعمت ہے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے بھی تھے جن کے پاس دولت کی فراوانی تھی اور اس فراوانی کو حضور ﷺ نے کبھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اس حدیث کا مفہوم صرف یہ ہے کہ فقر و فاقہ کے مقابلہ میں دولت کی فراوانی زیادہ بڑی آزمائش کی چیز ہے اور حضور ﷺ نے اس خطرے سے آگاہ کیا ہے کہ کہیں کوئی شخص دنیا کے عیش و عشرت میں الجھ کر آخرت کی طرف سے غافل نہ ہو جائے۔

عورتوں پر نظر ڈالنے کے شرعی حدود

سوال: شرعی نقطۂ نظر سے مردوں کا عورتوں کی طرف دیکھنے اور عورتوں کا مردوں کی طرف دیکھنے کا کیا حکم ہے؟ خاص کر یہ امر وضاحت طلب ہے کہ عورتیں کس حد تک

مردوں کو دیکھ سکتی ہیں؟ کیونکہ میں نے بعض علماء اور مقررین کو تقریروں میں یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ عورتوں کا مردوں کی طرف دیکھنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ چاہے یہ دیکھنا شہوت کی نظر سے ہو یا بغیر شہوت کے' اس سلسلے میں دلیل کے طور پر وہ مندرجہ ذیل حدیثیں پیش کرتے ہیں:

(۱) نبی ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ عورتوں کے لیے کون سی بات بہتر ہوسکتی ہے؟ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ عورتوں کے لیے بہتر یہ ہے کہ نہ وہ مردوں کو دیکھیں اور نہ مرد انہیں دیکھیں۔ نبی ﷺ نے اس عمدہ جواب پر فاطمہ رضی اللہ عنہا کا محبت اور پیار سے بوسہ لیا اور فرمایا کہ تم بہترین باپ کی بہترین اولاد ہو۔

(۲) اُمّ المومنین اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور میمونہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ اس درمیان عبداللہ ابنِ اُمّ مکتوم ہمارے پاس آئے جو کہ دونوں آنکھوں سے اندھے تھے۔ یہ بات اس زمانے کی ہے جب پردے کا حکم آچکا تھا۔ نبی ﷺ نے ہم دونوں سے کہا کہ تم دونوں ابنِ اُمّ مکتوم سے پردہ کرو۔ ہم نے کہا کہ وہ تو اندھے ہیں۔ نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ پہچان سکتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں تو اندھی نہیں ہو۔ کیا تم انہیں نہیں دیکھ رہی ہو؟ موجودہ زمانے میں زندگی کی مختلف ضرورتوں اور کچھ دوسرے اسباب کی وجہ سے مردوں اور عورتوں کا اِختلاط کافی بڑھ چکا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یہ کیسے ممکن ہے کہ نہ مرد عورت کو دیکھے اور نہ عورت مرد کو دیکھے۔ کیا عملی طور پر یہ بات ممکن ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے غایت درجہ حکمت و مصلحت کے تمام جان دار مخلوق کو جوڑوں میں پیدا کیا ہے' بلکہ کائنات میں پائی جانیوالی تمام چیزوں کو اللہ نے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (الذاریات:۴۹)

''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں۔ شاید کہ تم اس بات سے سبق

لو"۔

اسی قانونِ فطرت کے تحت اللہ تعالیٰ نے ہم انسانوں کو بھی جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے' تا کہ نسلِ انسانی کا سلسلہ یونہی آگے بڑھتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ کشش اور جاذبیت رکھ دی ہے۔ تا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے بے تاب رہیں۔ اگر دونوں میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ کشش نہ ہو تو شوہر اور بیوی کے درمیان کبھی تعلقات قائم نہیں ہو سکتے اور نہ نسلِ انسانی ہی آگے بڑھ سکتی ہے۔ یہی قانونِ فطرت ہے اور قانون فطرت سے بغاوت کسی صورت مناسب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس دن آدم علیہ السلام کی تخلیق کی اسی دن ان کی پسلی سے عورت (حوا) کو بھی بنایا۔ تا کہ وہ آدم کے لیے راحت اور سکون کا ذریعہ بن سکیں۔ اللہ فرماتا ہے:

وَالَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (الاعراف:۱۹۰)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے"۔

پھر یہ دونوں مرد اور عورت کی صورت میں ایک ساتھ جنت میں زندگی گزارنے لگے۔ پھر اللہ کی نافرمانی کی پاداش میں ایک ساتھ جنت سے نکال کر زمین پر بسائے گئے۔ اس زمین پر ان دونوں کے باہمی اختلاط سے نسلِ انسانی کا سلسلہ شروع ہوا اور قیامت تک مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات کے نتیجے میں یہ سلسلہ رواں دواں رہے گا۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے اس قدر ناگزیر ہیں اور ان دونوں کا رشتہ اس قدر گہرا ہے کہ اللہ فرماتا ہے: "بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ" یعنی تم سب (مرد اور عورت) ایک دوسرے کا حصہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کے سارے مسائل اور ذمے داریاں ان دونوں میں مشترک ہیں اور دونوں کو مل کر یہ ذمے داریاں نبھانی ہیں' یہی

قانونِ فطرت ہے۔ اس لیے یہ تصور کرنا کہ مرد اور عورت اس طرح علیحدہ علیحدہ زندگی گزاریں کہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں، ناممکن سی بات ہے۔ یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب انسان قانونِ فطرت سے بغاوت کرتے ہوئے غیر فطری زندگی گزارنا شروع کر دے۔ تمام انسانوں سے رشتہ کاٹ کر پہاڑوں پر بس جائے اور رہبانیت کی زندگی اختیار کر لے، جس سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ رہبانیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ''اللہ نے اس کی اجازت نہیں دی تھی، بلکہ عیسائیوں نے خود ہی اسے ایجاد اور اختیار کیا تھا''۔ چنانچہ آج بھی عیسائیوں میں دیندار لوگوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ شادی کریں اور عورتوں سے قربت اختیار کریں۔ لیکن اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے الگ ہو کر زندگی گزارنا قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ انسانی زندگی کی عمارت دونوں کے مشترکہ تعاون ہی سے کھڑی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ (التوبۃ: ۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں''۔

اس موقع پر دو باتوں کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زنا کار عورت کے لیے کوڑوں کی سزا سے قبل جو سزا بتائی تھی وہ یہ تھی کہ زنا کار عورت کو گھر کے اندر اس طرح قید کر دیا جائے کہ وہ مرتے دم تک گھر سے باہر نہ نکل سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت کا گھر کے اندر قید رہنا اور گھر سے باہر نہ نکل سکنا، اس کے لیے سزا ہے اور عام حالات میں معمول کی زندگی میں اسے اس طرح گھر کے اندر قید رکھنا، اس پر بڑا ظلم ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر مرد اور عورت کے درمیان ایک دوسرے کے لیے بے پناہ کشش اور جاذبیت رکھی ہے۔ یہ بالکل ایک فطری بات ہے اور اللہ کی فطرت میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو پرہیزگار اور پاکباز

ثابت کرنے کے چکر میں یہ کہتا ہے کہ عورتوں میں اس کی دلچسپی بالکل نہیں ہے یا عورتیں اس کے لیے بالکل کشش نہیں رکھتی ہیں' وہ یقیناً جھوٹا ہے۔ کیونکہ اس کا یہ دعویٰ قانونِ فطرت کیخلاف ہے۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں' اب میں آپ کے سوال کے جواب کی طرف آتا ہوں۔

عورت اپنے جسم کے کس کس عضو کو کھلا رکھ سکتی ہے؟ اس سلسلے میں میرا موقف وہی ہے' جو علماء کی اکثریت کا ہے۔ عورت اپنا چہرہ' ہتھیلی اور پیر غیر محرموں کے سامنے بھی کھلا رکھ سکتی ہے' لیکن کیا ان کھلے ہوئے اعضاء کو دیکھنا جائز ہے؟

تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ پہلی نظر جائز ہے۔ اگر غلطی سے اور بغیر کسی ارادے کے ان پر نظر پڑ جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے اور اس بات پر بھی متفق ہیں کہ شہوت اور لذّت کی نظر سے انہیں دیکھنا جائز نہیں ہے' کیونکہ شہوت جذبات کو بھڑکاتی ہے اور گناہ پر اکساتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ "النظرۃ برید الزنا" (نظر' زنا کی پیغام بر ہوتی ہے)۔ اسی طرح علماءِ کرام اس بات پر بھی متفق ہیں کہ ہتھیلی' پیر اور چہرے کے علاوہ عورت کے دوسرے اعضاء مثلاً اس کے بال' گردن' پیٹھ اور پنڈلی (یہ وہ اعضاء ہیں جنہیں عام طور پر آج کل کی عورتیں کھلا رکھتی ہیں) وغیرہ کی طرف غیر محرمَ کے لیے دیکھنا جائز نہیں ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے دو اصولی باتوں کا بیان ضروری ہے۔

پہلی بات یہ کہ ہنگامی حالات میں اور شدید ضرورت کے وقت ناجائز بات بھی جائز ہو جاتی ہے۔ مثلاً بھوک سے جان جانے کا خطرہ ہے تو سور کا گوشت کھانا جائز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح علاج معالجہ کی خاطر یا ولادت کے موقع پر عورت اپنا ستر ڈاکٹر کے سامنے کھول سکتی ہے یا فسادات اور جنگ کے موقع پر عورت کے لیے پردہ کرنا ممکن نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ بے پردہ رہے۔ دوسری یہ کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو جائز چیز

بھی ناجائز ہو جاتی ہے بشرطیکہ یہ اندیشہ محض خیالی اور وہمی نہ ہو جیسا کہ بعض شکی قسم کے لوگوں کو ہر وقت فتنہ کا اندیشہ لاحق رہتا ہے' بلکہ واقعی ایسی صورتِ حال جس میں فتنہ کا اندیشہ ہو۔ اس سلسلے میں سب سے صحیح فیصلہ خود انسان کا اپنا ضمیر کر سکتا ہے کہ کون سے حالات اس کے لیے باعثِ فتنہ ہیں اور کون سے نہیں ہیں۔ ایسے وقت پر ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے ضمیر کی طرف رجوع کرے اور اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرے۔ فتووں کے چکر میں بہت زیادہ نہ رہے۔ (۱)

اس سلسلہ میں علماءِ کرام اس بات پر متفق ہیں کہ مرد کی ستر کی طرف دیکھنا جائز نہیں ہے۔ چاہے شہوت کی نظر سے دیکھا جائے یا بغیر شہوت کے۔ لیکن مرد کی ستر کیا ہے' اس سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک مرد کی ستر ناف سے لے کر گھٹنے تک ہے' لیکن اس رائے کے حق میں وہ جو حدیثیں بہ طورِ دلیل پیش کرتے ہیں ان میں کوئی بھی حدیث صحیح حدیث نہیں ہے۔

بعض علماء کے نزدیک مرد کی ران ستر نہیں ہے اور اس رائے کے حق میں وہ انس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر لوگوں کے سامنے اپنی ران کھولی ہے۔ اگر اس رائے کو اختیار

(۱) یہاں پر ضمیر کی آواز پر عمل کرنے کی بات کہی جا رہی ہے نہ کہ خواہشوں کی آواز پر۔ مسلمان اپنی خواہشوں کے پیچھے نہ بھاگے بلکہ اپنا ضمیر ٹٹولے اور دیکھے کہ اس کا ضمیر کیا کہہ رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان چاہے کتنا بھی بھٹکا ہوا ہو اس کا ضمیر گمراہ اور مردہ نہیں ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کی ترقیوں نے عورتوں کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہر آفس' ہر دفتر اور ہر شعبۂ زندگی میں عورتیں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں اور قطع نظر اس کے کہ یہ بات جائز ہے یا ناجائز' اب صورتِ حال یہ ہے کہ دفتر' دکان اور دوسری جگہوں پر عورتیں اور لڑکیاں موجود ہوتی ہیں اور ایک مسلمان شخص اپنے معمولاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے ان عورتوں سے بات کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بات کرنے کے دوران مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ عورتوں سے منہ پھیر کر بات کی جائے کیونکہ یہ بداخلاقی ہوگی اور یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ بات کے دوران ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا جائے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ ان کے ساتھ نارمل انداز میں گفتگو کی جائے۔ (یہ بات میں نے قرضاوی صاحب کی مختلف تقریروں سے اخذ کی ہے۔ مترجم)

کیا جائے تو کھلاڑیوں کے لیے بڑی سہولت ہو جائے گی جو عام طور پر نیکر پہن کر کھیلتے ہیں' کیونکہ یہی کھیل کا یونیفارم ہوتا ہے۔ البتہ ہم مسلمانوں کو مسلسل اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ کھیلوں کے لیے اپنے خاص یونیفارم قانونی طور پر تسلیم کرواسکیں۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ مرد کی ستر کو دیکھنا جس طرح عورتوں کے لیے جائز نہیں ہے اسی طرح مرد کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ دوسرے مرد کی ستر پر نظر کرے۔ اور جس طرح ایک مرد دوسرے مرد کا سارا جسم ستر کے علاوہ دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ایک عورت بھی ستر کے علاوہ مرد کا سارا جسم دیکھ سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہ دیکھنا شہوت کی نظر سے نہ ہو اور اس دیکھنے میں واقعی کوئی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ یہی بیشتر فقہاء کا موقف ہے اور میرا بھی یہی موقف ہے' کیونکہ بخاری شریف اور مسلم شریف کی ایک صحیح حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ قیس کو عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا تھا اور فرمایا کہ وہ اندھے ہیں۔ تم کپڑے بھی اتارو گی تو وہ تمہیں دیکھ نہیں سکیں گے۔

بخاری اور مسلم شریف کی ایک اور حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے کندھے پر بٹھا کر چند حبشیوں کا کھیل تماشا دکھایا جو مسجدِ نبوی کے اندر اپنے کرتب کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مردوں کو بغیر کسی شہوت کے دیکھا اور حضور ﷺ نے انہیں ایسا کرنے کو کہا۔ اگر عورتوں کے لیے مردوں کو دیکھنا جائز نہ ہوتا تو عورتوں کی طرح مردوں کے لیے بھی پردہ کرنا واجب ہو جاتا۔

آپ نے اپنے سوال میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا والی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے' علمی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور یہ ایک من گھڑت حدیث ہے جسے کسی طور قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ حدیث جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا اور میمونہ رضی اللہ عنہا کو عبداللہ بن اُمّ مکتوم سے پردہ کرنے کا حکم دیا تھا اور انہیں اس

بات سے منع کیا تھا کہ وہ عبداللہ بن مکتوم کو دیکھیں' یہ حدیث ابوداؤد کی حدیث ہے اور اس کی سند میں ایک ایسے راوی ہیں (یعنی نیہان) جو علمِ حدیث کے میدان میں غیر معروف شخصیت ہیں۔ اس لیے بخاری اور مسلم شریف کی وہ صحیح حدیثیں جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے' ان کے مقابلہ میں ابوداؤد کی اس حدیث کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

عورتوں کو سلام کرنا

سوال: ہم کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں ہیں۔ ہمارے اساتذہ کا معمول ہے کہ کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے' ہمیں سلام کرتے ہیں اور ہم ان کو سلام کا جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ ہماری اپنی سمجھ کے مطابق عورتوں کو بھی مردوں کے سلام کا جواب دینا چاہیے۔ لیکن ایک استاد ہماری اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ چنانچہ کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے کبھی ہمیں سلام نہیں کیا اور نہ ہمارے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے عورتوں کو سلام کرنا جائز نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ عورتیں سلام کا جواب دیں' کیونکہ عورتوں کی آواز بھی ستر ہے۔ حالانکہ یہی استاد پڑھاتے وقت ہم سے سوال کرتے ہیں اور ہمارے سوال کا جواب دیتے ہیں اور ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ تو محض سلام کرنے میں انہیں کیا قباحت محسوس ہوتی ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ عورت کی آواز ستر ہے اور مردوں کے درمیان اسے خاموش رہنا چاہیے؟

جواب: قرآن کی جن آیات میں یا حضور ﷺ کی جن احادیث میں سلام کرنے کی تاکید ہے' ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں مرد اور عورت کے درمیان تفریق نہیں کی گئی ہے اور ان میں مخاطب مرد اور عورت دونوں ہی ہیں۔ مثلاً قرآن کی آیت ملاحظہ کیجیے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ (النساء:۸۶)

''اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس کا بہتر سلام کے ذریعے جواب دو یا پھر ویسے ہی سلام سے جواب دو''۔

اس آیت میں مخاطب مرد و عورت دونوں ہی ہیں۔

اسی طرح ایک حدیث ملاحظہ کیجئے:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَنْ تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِنْ فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَكُمْ (مسلم)

''قسم اس کی، جس کے قبضے میں میری جان ہے تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ۔ اور اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں ایسی بات نہ بتاؤں کہ اگر تم اسے کرو گے تو آپس میں محبت بڑھے گی، اپنے درمیان سلام کو رواج دو''۔

اس حدیث میں بھی مخاطب مرد اور عورت دونوں ہیں۔ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس کے مخاطب صرف مرد ہیں عورتیں نہیں ہیں۔ اور نہ قرآن و حدیث میں ہی کوئی ایسی دلیل ملتی ہے کہ مرد عورتوں کو سلام نہیں کر سکتے یا عورتیں مردوں کے سلام کا جواب نہیں دے سکتیں۔ بلکہ اس کے برعکس حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مردوں نے عورتوں کو سلام کیا ہے اور عورتوں نے ان کے سلام کا جواب دیا ہے۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مردوں کا عورتوں کو سلام کرنا اور عورتوں کا جواب دینا، اسلامی آداب میں شامل ہے۔

ذیل میں حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل سے چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

بخاری اور مسلم کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ کی چچازاد بہن حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے گھر تشریف لائیں، اس وقت حضور ﷺ نہا رہے تھے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پردہ کر رکھا تھا۔ اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کو سلام کیا۔ آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ کون آئی ہے؟ اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ میں اُمّ ہانی ہوں۔ آپ ﷺ نے سلام کا

جواب دیتے ہوئے فرمایا: "مَرحَبًا بِاُمِّ هَانِئٍ" (اُمّ ہانی کو خوش آمدید ہو)۔

بخاری شریف میں ایک باب کا عنوان ہے "مردوں کا عورتوں کو سلام کرنا اور عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا" اس عنوان کے ذریعے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں کو جواب دینا چاہتے ہیں جو عورتوں کو سلام کرنا یا ان کا جواب دینا پسند نہیں کرتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی رائے کے حق میں دو حدیثیں پیش کی ہیں۔ پہلی حدیث کی روایت حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت کسی کھجور کے باغ میں ان کے لیے کھانا تیار کر کے رکھتی تھی اور نمازِ جمعہ کے بعد حضرت سہل رضی اللہ عنہ چند صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ ان کے پاس جاتے تھے اور انہیں سلام کرتے تھے اور وہ عورت ان کے سامنے کھانا پیش کرتی تھی۔

دوسری حدیث کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کی ہے۔ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اے عائشہ یہ جبریل آئے ہیں اور تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے سلام کا جواب دیا۔[1]

ترمذی میں ایک حدیث ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ ہم عورتیں ایک جگہ بیٹھی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہمیں سلام کیا۔

روایتوں میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بعض عورتوں کے پاس تشریف لائے اور انہیں سلام کیا اور بتایا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مُسند احمد میں ایک روایت کا تذکرہ کیا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل جب یمن تشریف لے گئے تو ایک عورت ان کے پاس آئی اور انہیں سلام کیا۔

---

[1] اگر کوئی یہ کہے کہ جبرئیل علیہ السلام تو فرشتہ تھے۔ انسان نہیں تھے۔ تو اس سلسلے میں واضح رہے کہ جبرئیل علیہ السلام عام طور پر مرد کی صورت میں تشریف لاتے تھے۔

ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عورتوں کو سلام کیا کرتے تھے اور عورتیں بھی سلام کا جواب دیتی تھیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے۔ اوپر میں نے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں۔

حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عورتوں کو سلام کرنے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے تھے لیکن آج کے بعض علماء حضرات اس سے منع کرتے ہیں۔ انہیں عورتوں کے سلام کرنے میں فتنہ کا اندیشہ اور خوف محسوس ہوتا ہے۔ ان کے مطابق احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ نہ عورتوں کو سلام کیا جائے اور نہ یہ سلام کا جواب دیں۔ احناف کہتے ہیں کہ عورتیں صرف اپنے محرم مردوں کو سلام کر سکتی ہیں۔ بعض علماءِ کرام کے نزدیک صرف بوڑھی عورتوں کو سلام کرنا یا ان کے سلام کا جواب دینا جائز ہے۔ اور ان سب کی صرف ایک ہی دلیل ہے اور وہ ہے فتنہ کا اندیشہ۔ پتہ نہیں اس طرح کے علماءِ کرام عورتوں کے معاملے میں اس قدر حساس اور محتاط کیوں واقع ہوئے ہیں کہ انہیں عورتوں کے ساتھ کسی بھی معاملے میں فتنہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ حالانکہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل ثابت کرتا ہے کہ یہ لوگ عورتوں کے معاملے میں اس طرح کے حساس اور سخت گیر نہیں تھے اور نہ اس قدر احتیاط کے قائل تھے۔ ایک بھی ایسی روایت اور حدیث نہیں ہے، جس میں اس بات کا بیان ہو کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عورتوں کو سلام کرنے میں کوئی حرج محسوس کرتے تھے۔ خاص کر جب کوئی ملاقات کی غرض سے ان کے پاس جاتا یا معلّم اور معالج کی حیثیت سے ان کے پاس جاتا۔ البتہ راہ چلتے کسی عورت کو سلام کرنا، مناسب نہیں ہے اِلاّ یہ کہ اس سے کسی قسم کی قریبی رشتہ داری ہو یا ایسا کوئی قریبی تعلق ہو جیسا کہ استاد اور شاگرد کے درمیان ہوتا ہے۔

آپ نے اپنے سوال میں اپنے ایک استاد کا طرزِ عمل تحریر کیا ہے کہ وہ عورتوں کو سلام کرنا درست نہیں تصوّر کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی استاد پڑھاتے وقت آپ عورتوں سے باتیں کرتے ہیں، آپ کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں اور آپ سے سوال کرتے

ہیں تو محض سلام کرنے میں انہیں کون سی شرعی قباحت محسوس ہوتی ہے۔ جس فتنہ کے خوف سے یہ عورتوں کو سلام کرنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں' کلاس روم کے اندر اس قسم کے فتنہ کی کہاں گنجائش ہوسکتی ہے۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ تو باپ بیٹے یا باپ بیٹی کا رشتہ ہوتا ہے اور پھر کلاس روم کا ماحول انتہائی سنجیدہ اور پروقار ماحول ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی قسم کے فتنہ کا کیوں کر خوف ہوسکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ عورتوں کی آواز ستر ہے اور مردوں کے درمیان انہیں خاموش رہنا چاہیے تاکہ ان کی آواز مردوں کے کان میں نہ پڑے' تو یہ ایک بے بنیاد بات ہے جس کی قرآن وحدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس قرآن وحدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ عورتیں غیر محرم مردوں سے بات کرسکتی ہیں' لیکن ادب و احترام کے ساتھ جیسا کہ پچھلے جواب میں' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈال چکا ہوں۔

عورتوں اور مردوں کے باہمی اِختلاط کے شرعی حدود

سوال: مخلوط طرزِ زندگی (عورتوں اور مردوں کا ایک ساتھ پڑھنا یا کام کرنا یا زندگی کے دوسرے کام انجام دینا) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مردوں اور عورتوں کے اس قسم کے اِختلاط کو علماء حضرات بڑی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ بعض اتنے سخت گیر ہیں کہ عورتوں کے گھر سے نکلنے کو بھی ناپسند کرتے ہیں حتیٰ کہ عورتوں کا مسجد جانا بھی ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

لوعلم رسول اللہ ﷺ ماحدث النساء بعدہ لمنعھن من المساجد

''اگر حضور ﷺ کو علم ہو جاتا کہ ان کے وصال کے بعد عورتوں نے کیا رویہ اختیار کرلیا ہے تو انہیں مسجد جانے سے منع کردیتے''۔

محترم! آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ دورِ حاضر میں گوناگوں انسانی ضروریات کی بنا پر عورتیں گھر سے باہر قدم نکالنے پر مجبور ہیں' کیونکہ مردوں کی طرح انہیں بھی تعلیم حاصل کرنی ہے' بسا اوقات انہیں بھی نوکری کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور انہیں بھی حق حاصل ہے کہ دنیا کی مختلف خوشیوں اور نئی نئی ایجادات سے لطف اندوز ہوں اور یہ سب حاصل کرنے کے لیے تھوڑا یا زیادہ مردوں کے ساتھ اِختلاط ضروری ہے۔ کیونکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رُخ کرنا ضروری ہے جہاں مخلوط تعلیم ہوتی ہے اور کلاس میں عام طور پر مرد اساتذہ پڑھاتے ہیں' اگر نوکری کرنی ہے تو ایسی جگہ نوکری ملنا بہت زیادہ مشکل ہے جہاں صرف عورتیں ہوں۔ اس لیے مجبوراً ایسی جگہ نوکری کرنی پڑتی ہے جہاں ساتھ میں مرد حضرات بھی ہوتے ہیں اور اگر علاج کرانا ہے تو بسا اوقات مرد ڈاکٹر سے علاج کرانا ضروری ہو جاتا ہے۔

کیا اس طرح کا اِختلاط اسلام کی نظر میں جائز ہے؟ اس ترقی یافتہ دور میں اور زندگی کی بے شمار ضرورتوں کے پیشِ نظر عورتوں کے لیے کیسے ممکن ہے کہ مردوں سے علیحدہ ہو کر اور ان سے بے نیاز ہو کر زندگی گزاریں اور گھر کے اندر قید ہو کر رہ جائیں' خواہ اس گھر کے اندر انہیں دنیا بھر کا آرام ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

ایسا کیوں ہے کہ عورتوں کے لیے وہ سب کچھ جائز نہیں ہے جو مردوں کے لیے جائز ہے؟ مرد گھر سے باہر رہ کر کھلی اور تازہ ہوا کا مزا لیتے ہیں اور عورت اس مزے سے محروم کر دی گئی ہے۔ مرد اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے ہیں' جبکہ عورتوں پر بے شمار پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ آخر عورتوں کے سلسلے میں اس قدر خوف اور بدگمانیاں کیوں ہیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی عقل اور سمجھداری عطا کی ہے۔ اگر عورتیں غلطیاں کر سکتی ہیں تو مرد بھی غلطیاں کرتے ہیں۔ پھر سارے مزے صرف مرد کی جھولی میں کیوں ہیں؟

امید ہے کہ آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں گے۔ ہمیں اس سے کوئی

مطلب نہیں ہے کہ فلاں شیخ اور فلاں عالمِ دین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔ ہمیں صرف اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم کرنا ہے۔ اس لیے براہِ مہربانی صرف قرآن وحدیث کی روشنی میں ہمارے سوالوں کا جواب دیں۔

جواب: ہم مسلمانوں کی بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم بیشتر معاملات میں افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ اسلام نے ہمیں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور اسی بنا پر ہمیں ''امت وسط'' (معتدل امت) کا خطاب دیا گیا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ شاذ ونادر ہی ہم اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ بیشتر مسائل میں افراط وتفریط کا شکار ہو چکے ہیں اور یہ افراط وتفریط کا معاملہ سب سے زیادہ عورتوں اور ان کے مسائل میں ہے۔ عورتوں کے معاملے میں ہمارے یہاں عموماً دو قسم کی سوچ پائی جاتی ہے۔

پہلی قسم کی سوچ ان مغرب پرست لوگوں کی ہے جو مغربی تہذیب اور اس کی ہر ہر ادا سے مرعوب ہیں اور اسی لیے وہ اسے مکمل طور پر اختیار کر لینا چاہتے ہیں۔ مغربی تہذیب چوں کہ عورتوں کی مکمل آزادی' عریانیت' بے لگام فیشن اور مردوں سے برابری کی علمبردار ہے اس لیے یہ لوگ بھی اپنی عورتوں کو اسی رنگ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ خواہ اس تہذیب میں اخلاقی دیوالیہ پن اپنے عروج پر ہو۔ یہ لوگ اس بات سے انجان ہیں کہ اس بے لگام آزادی اور جنسی بے راہ روی نے مغربی سماج کو کن خطرناک مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ اب ان کے مفکرین اور مصلحین اس بے قید آزادی پر پابندی لگانے کی باتیں کرنے لگے ہیں۔

اس کے بالکل برعکس دوسری سوچ ان لوگوں کی ہے جو عورتوں اور ان کی نسوانیت کے معاملے میں بڑے حساس اور سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ انہیں عورتوں کی طرف سے ہر وقت فتنوں کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ عورتوں کی ذرا سی بھی آزادی کو گوارا نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے عورتوں کو مختلف سماجی اور مذہبی پابندیوں میں جکڑ رکھا ہے۔ حالانکہ دینِ اسلام کا ان پابندیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اسلام

نے ان پابندیوں کی ہدایت کی ہے۔

یہ دونوں قسم کے لوگ افراط وتفریط کا شکار اور عورت کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات سے دُور ہیں۔ آپ نے اپنے سوال میں جو باتیں پوچھی ہیں آج کے دور میں عورتوں کے یہ حقیقی مسائل ہیں اور ہر عورت کے ذہن میں کم وبیش اسی قسم کے سوالات اٹھتے ہیں' اس لیے ضروری ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا تفصیلی جواب دیا جائے۔

جہاں تک اِختلاط (عورتوں اور مردوں کا ساتھ مل کر کوئی کام انجام دینا) کا تعلق ہے' اس سلسلے میں اسلام کا کوئی عمومی (General) حکم نہیں ہے کہ ہر قسم کے حالات میں اس حکم کو چسپاں کیا جا سکے۔ بلکہ مختلف حالات اور مختلف ماحول کے لحاظ سے اس کا حکم بھی مختلف ہے اور اس حکم سے پہلے مختلف عوامل کی رعایت بھی ناگزیر ہے۔ مثلاً یہ کہ اس اِختلاط کی کس حد تک ضرورت ہے۔ وہ کون سے مقاصد ہیں جن کی تکمیل کے لیے یہ اِختلاط ضروری ہے۔ کیا ماحول اس اِختلاط کا متحمل ہو سکتا ہے اور اس اِختلاط کے منفی اور مثبت اثرات کس حد تک ہو سکتے ہیں؟

اس سلسلے میں سب سے عمدہ اور قابلِ تقلید نمونہ بلاشبہ حضورِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں یہ اِختلاط جائز تھا یا ناجائز' اور اگر جائز تھا تو کس حد تک جائز تھا؟

عورتوں کا گھر کے اندر مقید رہنے اور ہر قسم کے اِختلاط سے دور رہنے کا جو تصوّر آج پایا جاتا ہے وہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں نہیں تھا چنانچہ اس زمانے میں عورتیں نہ گھروں میں قید ہو کر اور نہ مردوں سے بالکل الگ اور علیحدہ ہو کر زندگی گزارتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عورتوں پر بے جا پابندیوں کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب مسلم اُمت قرآن وحدیث کی صحیح تعلیمات سے دور ہونے لگی' تعلیم کے بجائے جہالت پھیلنے لگی اور ترقی کے بجائے پسماندگی غالب آنے لگی۔ جہالت و پسماندگی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

عہدِ نبوی میں عورتوں کی زندگی ہر قسم کے افراط وتفریط سے پاک تھی۔ سارے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی ان کے یہاں اعتدال تھا۔ نہ وہ گھروں میں اس طرح قید تھیں جس طرح بعض نادان قسم کے دین دار لوگ اپنی عورتوں کو رکھتے ہیں اور نہ مغرب کی عورتوں کی طرح سارا وقت گھر سے باہر رہ کر مکمل آزادی کے ساتھ گزارتی تھیں۔ انہیں گھر سے باہر نکلنے کی آزادی تھی لیکن اخلاقی پابندیوں کے ساتھ۔ چنانچہ عہدِ نبوی میں عورتیں مسجد جا کر مردوں کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرتی تھیں اور حضور ﷺ انہیں مسجد آنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے کہ اس زمانے میں مرد پاجامہ نہیں پہنتے تھے بلکہ کھلی ہوئی چادر باندھتے تھے جس کی وجہ سے سجدے کی حالت میں ستر نظر آنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس کے باوجود حضور ﷺ نے عورتوں کو مسجد آنے سے نہیں منع کیا بلکہ انہیں حکم دیا کہ تم مردوں سے الگ ہو کر صف لگاؤ۔ حتیٰ کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی دیوار بھی نہیں کھڑی کی۔ شروع شروع میں مرد اور عورتیں ایک ہی دروازہ سے مسجد کے اندر جاتے تھے جس کی وجہ سے اکثر دروازے پر بھیڑ ہو جاتی تھی۔ چنانچہ نبیؐ نے عورتوں کے لیے علیحدہ دروازہ بنوایا۔ آج بھی اس دروازے کو باب النساء (عورتوں کا دروازہ) کہتے ہیں۔

پنج وقتہ نمازوں کی طرح جمعہ کے دن بھی عورتیں خطبہ سننے کے لیے مسجد جایا کرتی تھیں۔ عید وبقرہ عید کے موقع پر بھی عورتیں عیدگاہ جایا کرتی تھیں اور مردوں کے ساتھ عید کی خوشیوں سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ بلکہ حضور ﷺ کا حکم تھا کہ عید کے دن اپنی عورتوں اور جوان لڑکیوں کو گھروں سے باہر نکالو تاکہ وہ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔ حدیث کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اَنْ نُّخْرِجَ فِي الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰى الْعَوَاتِقَ وَالْحُيَّضَ وَذَوَاتِ الْخُدُوْرِ فَاَمَّا الْحُيَّضُ فَيَعْتَزِلْنَ الصَّلَاةَ وَيَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ

اَحَدُنَا لَایَکُوْنَ لَهَا جِلْبَابٌ قَالَ لِتَلْبِسْهَا اُخْتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا

(مسلم)

''اُمّ عطیہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم عورتوں کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں گھروں سے باہر نکالیں۔ نوجوان لڑکیوں کو' حیض والی عورتوں کو اور پردہ نشین عورتوں کو (بھی) حیض والی عورتیں نماز سے دُور رہیں گی لیکن خوشیوں اور دعاؤں میں شریک ہوں گی۔ میں نے کہا کہ اے حضور ﷺ! کسی عورت کے پاس چادر نہیں ہوتی وہ کیسے نکلے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی کوئی دینی بہن اُسے اپنی چادر دے دے''۔

افسوس کی بات ہے کہ آج کے دور میں چند سخت گیر قسم کے علماء نے اس سنّت نبوی ﷺ کو جان کر فراموش کر دیا ہے۔ حضور ﷺ گھر کی عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر عید و بقرعید کی خوشیوں میں شامل کرنا چاہتے ہیں اور یہ علماء حضرات محض وہمی اندیشوں اور فتنوں کا عذرِ لنگ پیش کر کے عورتوں کو گھر کے اندر بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اسی طرح عہدِ نبوی میں عورتیں گھروں سے باہر نکل کر علم حاصل کرنے کے لیے درس و تدریس کی ان مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں جہاں مرد حضرات بھی موجود ہوتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس مجلس میں عورتیں حضور ﷺ سے ایسے سوالات بھی پوچھتی تھیں' جنہیں بیان کرنے میں عورتیں عام طور پر شرماتی اور جھجکتی ہیں۔ مثلاً حیض' جنابت اور احتلام کے متعلق سوالات اور حضور ﷺ نے نہ کبھی ان عورتوں کو تدریسی مجلسوں میں آنے سے منع کیا اور نہ اس قسم کے سوالات ہی سے روکا۔ بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انصار کی عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ شرم و حیا نے انہیں کبھی علم حاصل کرنے سے نہیں باز رکھا۔

عہدِ نبوی میں گھر سے باہر عورتوں کی سرگرمیاں اور دوڑ بھاگ صرف مسجد اور تعلیم گاہ تک محدود نہیں تھی' بلکہ جہاد اور جنگ کے موقع پر بھی انہوں نے مختلف ذمّے داریاں

نبھائی ہیں۔ مثلاً زخمیوں کو سنبھالنا۔ نرس بن کران کی مرہم پٹی کرنا‘ انہیں کھانا پانی پیش کرنا اوروقت پڑنے پر دشمنوں پر وار کرنا۔ اُمّ عطیہ فرماتی ہیں:

غزوت مع رسول الله سبع غزوات اخلفهم في رحالهم فاصنع لهم الطعام واداوی الجرحى واقوم على المرضى (مسلم)

’’میں نے حضور ﷺ کی معیت میں سات جنگیں لڑی ہیں۔ میں ان کے پیچھے ان کے ساز وسامان کی حفاظت کرتی تھی‘ میں ان کے لیے کھانا بناتی تھی‘ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھی اور مریضوں کی دیکھ بھال کرتی تھی‘‘۔

مسلم شریف ہی کی روایت ہے کہ جنگِ اُحد کے موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا اپنی پیٹھ پر مشکیزہ اٹھائے مجاہدین کو پانی پلانے کا کام انجام دے رہی تھیں۔ احد کے موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی عمر کے لحاظ سے جوانی کے میدان میں قدم رکھ رہی تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کی سرگرمیوں میں صرف ادھیڑ اور بوڑھی عمر کی عورتیں ہی نہیں شریک ہوتی تھیں بلکہ نوجوان لڑکیاں بھی پیش پیش رہتی تھیں۔ جہاد میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں متعدد صحیح روایات ہیں اور ان سب کا یہاں بیان ممکن نہیں ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ میں عورتوں نے صرف اپنے شہر یا شہر سے قریبی علاقے میں رہ کر جہاد میں شرکت نہیں کی بلکہ دور دراز علاقوں میں جا کر بھی جہاد میں شریک ہوئی ہیں۔ بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ عنہ کی بیوی اُمّ حرام رضی اللہ عنہا کے لیے دعا کی تھی کہ سمندر میں سفر کر کے وہ جہاد میں جائیں۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اُمّ حرام جہاد کی خاطر قبرص تشریف لے گئیں‘ وہاں جہاد میں شریک ہوئیں اور وہیں انہوں نے وفات پائی۔

اسی طرح عہدِ نبوی میں عورتیں سماجی کاموں میں بھی مردوں کے ساتھ مل کر اپنے فرائض انجام دیتی تھیں۔ مثلاً سماج میں بُرائیوں کو روکنے اور بھلائیوں کو فروغ دینے کا

فریضہ، جسے اللہ نے مردوں اور عورتوں دونوں پر یکساں طور پر فرض کیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ:۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار اور رفیق ہیں۔ یہ سب مل کر نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں''۔

خلفاءِ راشدین کے عہد میں بھی عورتوں کی سرگرمیاں صرف گھر کی چہار دیواری تک محدود نہیں تھیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک مثال دینا کافی ہوگا، جس سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ اسلام کے درخشاں دور میں عورتیں بھی مردوں کی طرح سماج میں ایک فعّال کردار ادا کرتی تھیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت شفاء بنت عبداللہ کو بازار کا نگراں مقرر کیا تھا۔[1]

قرآن کریم میں جابجا مختلف انبیاء و رسل کے واقعات اور ان کی حیاتِ طیبہ کا ذکر موجود ہے۔ ان میں بعض واقعات عورتوں کے حوالہ سے بھی ہیں۔ ان واقعات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان انبیاء کے زمانے میں عورتوں اور مردوں کے درمیان وہ آہنی پردہ نہیں تھا جسے دورِ حاضر کے مسلم معاشرہ نے کھینچ رکھا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام پوری آزادی کے ساتھ گوشہ تنہائی میں بیٹھی مریم علیہا السلام کے پاس تشریف لے جاتے تھے اور ان سے گفتگو فرماتے تھے۔ یہ واقعہ سورہ آلِ عمران میں موجود ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سبا کی رانی کو اپنے یہاں دعوت دیتے ہیں۔ اسے اپنے محل کی سیر کراتے ہیں، اس سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں۔ سبا کی رانی حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمدہ ضیافت، اچھے اخلاق اور سیاسی رعب و دبدبہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیتی ہے۔ یہ واقعہ

---

[1] یہ ایک طرح کا سرکاری عہدہ تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت اگر باصلاحیت ہے تو شرعی حدود میں رہتے ہوئے سروس کر سکتی ہے۔ عورتوں کو سروس کرنے سے یکلخت روک دینا یا ان کے لیے فتنہ کی بنیاد پر سروس کرنے کو ناجائز قرار دینا مناسب بات نہیں معلوم ہوتی ہے۔

سورۂ نمل میں موجود ہے۔

یہ سارے واقعات اللہ کے برگزیدہ نبیوں کے ہیں اور چونکہ کہیں پر بھی اللہ نے یا اس کے رسول حضرت محمد ﷺ نے ان کے اس عمل پر تنقید نہیں کی ہے' اس لیے ان نبیوں کا عمل ہمارے لیے بھی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (انعام:۹۰)

''یہ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت عطا کی تھی۔ تو تم بھی ان کی راہِ ہدایت کی اتباع کرو''۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان اِختلاط کوئی ناجائز اور گناہ کا کام نہیں ہے۔ اسلام کسی ایسے معاشرہ کا تصور نہیں پیش کرتا ہے جس میں مرد کسی اور وادی میں ہوں اور عورتیں کسی اور وادی میں۔ عورتوں کا دائرۂ کار صرف گھر تک محدود ہو اور مردوں کا دائرۂ کار صرف گھر سے باہر ہو۔

مرد اور عورتیں دونوں معاشرے کا حصہ ہیں اور ان دونوں کو مل کر معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ہے۔ اس لیے یہ اِختلاط نہ صرف یہ کہ جائز ہے' بلکہ بسا اوقات یہ اِختلاط ضروری ہو جاتا ہے جب کوئی عظیم مقصد کا حصول مقصود ہو یا کسی بھلائی اور نیک کام کی انجام دہی میں دونوں کی مشترکہ جدوجہد اور باہمی تعاون کی ضرورت ہو۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس اِختلاط کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان کی حدوں کو ختم کر دیا جائے اور تمام شرعی قواعد وضوابط کو فراموش کر دیا جائے جیسا کہ مغربی ممالک یا غیر مسلم معاشرہ میں ہوتا ہے۔ مسلم معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کو چاہیے کہ شریعت کی حدوں میں رہتے ہوئے معاشرہ کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی و اصلاح کی خاطر مل جل کر کام کریں اور ایک دوسرے کا تعاون کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ان شرعی حدود کی وضاحت کر دی جائے:

(۱) مرد اور عورت دونوں غضِ بصر سے کام لیں۔ ایک دوسرے کی طرف شہوت کی

نگاہ سے نہ دیکھیں۔ اللہ کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ (النور:۳۰)

''مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں''۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور:۳۱)

''اور مومن عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں''۔

(۲) عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ساتر لباس میں ہوں چہرہ اور ہتھیلی کے علاوہ بدن کے سارے اعضاء ڈھکے ہوئے ہوں' لباس نہ تنگ ہو کہ جسم کے نشیب وفراز کا حال معلوم ہو اور نہ باریک اور شفاف ہو کہ بدن نظر آئے اور سینے پر دوپٹہ ہو۔ اللہ نے فرمایا ہے:

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ص (النور:۳۱)

''اور یہ عورتیں اپنی زینت وزیبائش کو ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اس کے جو خود بہ خود ظاہر ہو جائے۔ اور انہیں چاہیے کہ اپنے سینوں پر دوپٹہ ڈال لیں''۔

عورتوں کو ساتر اور شریفانہ لباس پہننے کی ہدایت اس لیے ہے' تاکہ وہ اپنے لباس سے مہذب' شریف اور پروقار نظر آئیں اور اوباش قسم کے لوگ چھیڑ خانی کی جرأت نہ کر سکیں۔ اللہ کا فرمان ہے:

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ (الاحزاب:۵۹)

''اس طریقہ سے یہ عورتیں پہچان لی جائیں گی (یعنی نظر آئے گا کہ یہ

شریف عورتیں ہیں) اور تنگ نہیں کی جائیں گی‘‘۔

(۳) مردوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی آداب (Islamic Manners) کا خیال رکھیں۔

(الف) گفتگو کا انداز شریفانہ ہو اور گفتگو اخلاقی حدود کے اندر رہ کر کی جائے۔ گفتگو میں ادائیں دکھانے اور ناز و نخرے کرنے کا انداز نہ ہو۔ اللہ کا حکم ہے:

اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ (الاحزاب:۳۲)

’’اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو بات کرنے میں نرمی اور گداز نہ پیدا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا شخص تمہارے سلسلے میں کوئی لالچ کر بیٹھے اور بھلے طریقے سے بات کرو‘‘۔

(ب) ان کی چال ڈھال میں حیا اور وقار ہو۔ پھوہڑ پن اور بیباکی نہ ہو۔ اللہ فرماتا ہے:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ (النور:۳۱)

’’اور اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا لوگوں کو علم ہو جائے‘‘۔

(ج) ایسی حرکتیں نہ کریں جن میں ناز و ادا اور لبھانے والا انداز ہو۔ ایسا کرنے والیوں کو حدیث میں ’’مُمِيْلَاتٌ وَمَائِلَاتٌ‘‘ کہہ کر ان کی سرزنش کی گئی ہے۔

(۴) ہر اس چیز سے اجتناب کریں جن میں مردوں کے لیے کشش ہو مثلاً تیز خوشبو یا شوخ رنگ کے کپڑے یا زیب و زینت وغیرہ۔

(۵) تنہائی میں کسی مرد کے ساتھ نہ بیٹھیں، اس طرح کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا نہ ہو۔

(۶) کوشش اس بات کی ہونی چاہئے کہ بلا ضرورت مردوں سے اختلاط نہ ہو۔

مردوں کے ساتھ زیادہ گھلنے ملنے سے لوگ عورتوں کے سلسلے میں باتیں بنانے لگتے ہیں اور انگلیاں اٹھاتے ہیں، عورتوں کو چاہئے کہ لوگوں کو اس بات کا موقع ہی نہ دیں کہ وہ ان پر شک کر سکیں۔

نامحرم مریض یا مریضہ کی عیادت

سوال: میں اسلامی آداب کی پابند عورت ہوں اور ایک سکول میں معلّمہ کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی ہوں۔ سکول میں عورت اور مرد دونوں پڑھاتے ہیں۔ مردوں کے ساتھ کوئی معاملہ ہو تو میں حتی الامکان کوشش کرتی ہوں کہ حسنِ اخلاق سے پیش آؤں اور اسلامی آداب کی خلاف ورزی نہ کروں۔ اسی حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم سب کا معمول یہ ہے کہ شادی بیاہ یا خوشی کے دوسرے مواقع پر ہم ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ایک بات دل میں کھٹکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر کوئی مرد استاد بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور تیمارداری کو جانا ہمارے لیے شرعی اعتبار سے درست ہے یا نہیں؟ اور اگر ہم بیمار ہو جائیں تو مرد حضرات ہماری عیادت یا تیمارداری کو آ سکتے ہیں یا نہیں؟ امید ہے کہ آپ قرآن و سنّت کی روشنی میں جواب دیں گے۔

جواب: مریض کی مزاج پرسی اور اس کی عیادت کو جانا اہم اسلامی آداب میں شامل ہے اور حضور ﷺ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ متعدد احادیث میں حضور ﷺ نے مریض کی عیادت کو ان چند حقوق میں شمار کیا ہے، جو ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے تئیں واجب ہیں۔ مثلاً:

حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ سِتٌّ قِیْلَ وَمَا هُنَّ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ إِذَا لَقِیْتَهُ فَسَلِّمْ عَلَیْهِ وَإِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْ لَهُ وَإِذَا عَطَسَ خشمته وَإِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ وَإِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ

(مسلم، ترمذی)

"ایک مسلم پر دوسرے مسلم کے چھ حقوق واجب ہیں۔ پوچھا گیا کہ وہ کون سے حقوق ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جب تم کسی مسلم سے ملو تو اسے سلام کرو' جب وہ دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرو' جب تم سے مشورہ اور نصیحت کا طالب ہو تو اسے نصیحت کرو' جب چھینکے تو اسکے الحمدللہ کے جواب میں یرحمک اللہ کہو' جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو' اور جب مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جاؤ"۔

دوسری صحیح حدیث ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمَ اِذَا عَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِيْ غُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَرْجِعَ (مسلم)

"ایک مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو جب تک وہ واپس نہ لوٹ جائے جنت میں رہتا ہے"۔

اور صحیح حدیث ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: يَا ابْنَ آدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِيْ' قَالَ يَارَبِّ كَيْفَ اَعُوْدُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنْ عَبْدِيْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ۔ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ عُدْتَّهٗ لَوَجَدْتَنِيْ عِنْدَهٗ (مسلم)

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا' اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو' تو نے میری عیادت کیوں نہیں کی؟ وہ جواب دے گا کہ اے رب العالمین میں تیری عبادت کیسے کر سکتا ہوں تو' تو تمام جہان کا مالک ہے۔ اللہ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تم نے اس کی عیادت نہیں کی۔ کیا تجھے پتہ نہیں ہے کہ اگر تم اس کی عیادت کو جاتے تو مجھے اس کے پاس پاتے"۔

ان کے علاوہ ایسی بے شمار حدیثیں ہیں، جن میں نبی ﷺ نے مریض کی عیادت کی ترغیب دی ہے۔ بلکہ اس کا حکم دیا ہے اور اسے اہم اسلامی آداب میں شمار کیا ہے۔ خود حضور ﷺ نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک یہودی جو آپ ﷺ کو بہت ستایا کرتا تھا۔ بیمار ہو گیا۔ آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ اس یہودی نے آپ ﷺ کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

اس اہم اخلاقی فریضے کی اہمیت اس وقت دو چند ہو جاتی ہے جب مریض سے کسی قسم کا قریبی تعلق ہو۔ مثلاً رشتہ داری ہو، دوستی ہو، پڑوسی ہو یا آفس میں آپ کے ساتھ کام کرتا ہو۔

غور طلب بات یہ ہے کہ تمام احادیث میں عیادت کرنے کے لیے نبی ﷺ نے جس صیغے کا استعمال کیا ہے، اس کے مخاطب مرد اور عورت دونوں ہو سکتے ہیں۔ اور لفظ ''مریض'' استعمال کیا ہے، جس سے مراد مرد مریض بھی ہو سکتا ہے اور عورت مریضہ بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے عیادت کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کو دیا ہے۔ خواہ مریض عورت ہو یا مرد۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مریض چاہے مرد ہو یا عورت، اس کی عیادت کو جانا مرد اور عورت دونوں پر واجب ہے اور دونوں کے حق میں یہ ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔

اپنی بات کی مزید تقویت کے لیے میں حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چند عملی نمونے پیش کرتا ہوں جن سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ مریض خواہ مرد ہو یا عورت، اس کی عیادت کو جانا اسلامی آداب (Islamic Manners) میں سے ہے اور حضور ﷺ اور ان کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے عملی نمونوں سے اس کی تعلیم دی ہے۔

بخاری شریف میں ایک باب کا عنوان ہے ''باب عیادۃ النساء للرجال'' (عورتوں کا مردوں کی عیادت کو جانا)۔ اس عنوان کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چند عملی نمونے پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ

عورتیں مردوں کی عیادت کو جاسکتی ہیں۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت پیش کی ہے کہ حضرت اُمّ الدرداء رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری صحابی کی عیادت کی۔ ایک دوسری روایت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک دن ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بلال رضی اللہ عنہ بیمار ہوگئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والدِ محترم ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بلال رضی اللہ عنہ دونوں کی عیادت کو تشریف لے گئیں اور ان دونوں سے دریافت کیا "کیف تجدك" آپ کی حالت کیسی ہے؟

اسی طرح اُمّ مبشر رضی اللہ عنہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے مرضِ موت میں ان کی عیادت کو تشریف لے گئیں اور ان سے فرمایا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! میرے بیٹے کو سلام کہنا۔

ان تمام روایتوں میں اس بات کا ذکر ہے کہ عورتیں مردوں کی عیادت کو گئیں اور ان روایتوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ عورتیں مردوں کی عیادت کو جاسکتی ہیں، بشرطیکہ اسلامی آداب کا خاص خیال رکھیں۔ مریض سے تنہائی میں نہ ملیں اور نہ بن سنور کر مریض کے پاس جائیں بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ عورتیں گروپ کی شکل میں مریض کی عیادت کو جائیں تاکہ کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔

آپ نے اپنے سوال میں لکھا ہے کہ خوشی کے موقعوں پر آپ ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہوتی ہیں اور مبارکباد پیش کرتی ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ غم اور بیماری کے موقع پر مردوں کے یہاں جانے میں آپ کھٹک محسوس کرتی ہیں؟ حالانکہ خوشی سے زیادہ غم کے موقع پر مزاج پرسی کی ضرورت ہوتی ہے۔

جہاں تک مردوں کا کسی مریض عورت کی عیادت کو جانے کی بات ہے تو یہ بھی شرعاً جائز ہے اور اس سلسلے میں بھی متعدد روایتیں موجود ہیں۔ چنانچہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ضباعۃ بنت الزبیر رضی اللہ عنہ کی عیادت کو تشریف لے گئے اور گفتگو کے دوران ان سے دریافت کیا کہ لَعَلَّكِ اَرَدْتِ الْحَجَّ یعنی (شاید کہ تمہارا حج کا ارادہ ہے؟ جواب میں حضرت ضباعہ نے عرض کیا کہ واللہ لاجد

اِلّا وجعة یعنی بہ خدا بس تھوڑی تکلیف محسوس کر رہی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حج کو جاؤ اور نیت کے دوران یہ شرط باندھ لو کہ اگر بیماری کی وجہ سے حج نہ کر سکی تو مجھ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ اُمّ السائب کی عیادت اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے اور ان سے دریافت کیا کہ اے اُمّ السائب تم کانپ کیوں رہی ہو؟ اُمّ السائب نے جواب دیا کہ بخار آ گیا ہے۔ بُرا ہو اس بخار کا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بخار کو برا بھلا مت کرو کیونکہ اس سے انسان کے گناہ دُھلتے ہیں۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ اُمّ العلاء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں بیمار تھی اور نبی ﷺ میری عیادت کو تشریف لائے۔ بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عیادت کو تشریف لے گئے جبکہ وہ مرض الموت میں مبتلا تھیں اور ان سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت دے دی۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اندر تشریف لے گئے اور ان سے ان کی خیریت دریافت کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اچھی ہی ہوں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان شاء اللہ آپ اچھی ہو جائیں گی۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی بیوی ہیں اور صرف آپ ہی ہیں جو کنوار پن میں حضور ﷺ کی زوجیت میں آئیں اور آپ کی بے گناہی کا اعلان آسمان سے نازل ہوا۔

ان تمام متواتر اور صحیح روایتوں کی روشنی میں یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ مرد حضرات بیمار عورتوں کی عیادت کو جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اسلامی آداب کا خاص خیال رکھا جائے۔ حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عملی نمونوں کو پڑھنے اور سننے کے بعد مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کی عیادت کے لیے جانے کو کیسے ناجائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا محض اس وجہ سے کہ ہمارے معاشرہ کی روایت اس کےخلاف ہے یا ہمارے معاشرہ

مین اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔

عورتوں سے مصافحہ

سوال: عورتوں سے مصافحہ کرنے کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ خاص کر ان عورتوں سے جو ہماری رشتے دار ہیں' لیکن محرم نہیں ہیں مثلاً خالہ زاد یا ماموں زاد بہنیں۔ واضح رہے کہ ہمارے معاشرے میں رشتہ دار عورتوں سے مصافحہ کرنا' ایک عام سی بات ہے۔ خاص کر سفر سے واپسی پر یا عید و بقر عید اور خوشی کے دوسرے مواقع پر۔ اگر کوئی مصافحے سے ہاتھ کھینچ لے اور مصافحہ نہ کرے تو اسے بے ادبی اور بداخلاقی تصوّر کیا جاتا ہے اور بسا اوقات یہ چیز رنجش اور کدورت پیدا کر دیتی ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ مصافحہ کرنے میں شہوت کارفرما ہوتی ہے یا کوئی جنسی میلان ہوتا ہے۔ بس یہ چیز ہمارے معاشرے کا ایک رواج ہے اور کچھ نہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ عورتوں سے مصافحہ کرنا قرآن وسنّت کی نظر میں کیا ناجائز ہے؟ یا محض علماء حضرات نے بغیر کسی دلیل کے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ امید ہے کہ آپ قرآن وحدیث کے حوالے سے ہمارے سوال کا جواب دیں گے۔

جواب: بلاشبہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور چونکہ قرآن وسنّت میں اس سلسلے میں کوئی واضح حکم نہیں ہے' اس لیے کسی یقینی رائے تک پہنچنا نہایت مشکل کام ہے۔ تاہم ایک بالغ نظر فقیہ کی ذمّے داری ہے کہ قرآن وسنّت کی جملہ تعلیمات اور احکام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسی رائے اختیار کرے جس کا مقصد اللہ کو خوش کرنا ہو' انسان کو نہیں۔

آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں دو ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں' جن پر تمام فقہاء متفق ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اگر شہوت اور جنسی لذت کی خاطر عورتوں سے مصافحہ کیا جائے یا اس عمل میں کسی بڑے فتنے کا حقیقی اندیشہ ہو تو یہ عمل شریعت کی نظر میں جائز نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہت بوڑھی عورت یا بہت چھوٹی لڑکی سے مصافحہ کرنا جائز ہے'

کیونکہ اس میں کوئی شہوت یا فتنہ نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت بوڑھے مرد کا کسی بھی عمر کی عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے' کیونکہ یہ بوڑھا کسی بھی جنسی لذت یا شہوت سے خالی ہوتا ہے۔

روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بوڑھی عورتوں سے مصافحہ کیا کرتے تھے۔ یہ بھی روایتوں میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھی عورت کو اپنے یہاں بہ طورِ خادمہ رکھا۔ وہ بوڑھی عورت ان کی خدمت کرتی تھی۔ بسا اوقات انہیں خود سے لپٹاتی تھی اور ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی تھی۔ اور یہ سارا عمل قرآن کے خلاف نہیں تھا کیونکہ قرآن نے بوڑھی عورتوں کو وہ رخصت دی ہے جو جوان عورتوں کو نہیں دی ہے:

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍؕ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ○ (النور:۶۰)

''اور جو عورتیں جوانی سے گزر چکی ہوں۔ جنہیں نکاح کی اُمید نہ ہو وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ زیب و زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ تاہم وہ حیاداری برتیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے''۔

اسی طرح وہ بوڑھے مرد جن کی جنسی حِس ختم ہو چکی ہے یا وہ چھوٹے بچے جن کے اندر جنسی حِس ابھی بیدار نہیں ہوئی ہے' ان کے سامنے عورتوں کو زینت و زیبائش کر کے آنے کی اجازت دی گئی ہے:

اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ص (النور:۳۱)

''یا وہ زیردست مرد جو شہوت نہیں رکھتے ہیں یا وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ

باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے ہیں''۔

یہ وہ صورتیں ہیں جن پر علماءِ کرام متفق ہیں کہ ان صورتوں میں عورتوں سے مصافحہ کرنا جائز ہے۔ان کے علاوہ دوسری صورتوں میں علماءِ کرام کے درمیان اختلاف ہے اورضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں بحث وتحقیق کی جائے۔

وہ فقہاءِ کرام جن کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ عورتیں غیرمحرموں کے سامنے اپنا چہرہ اور ہتھیلی بھی ڈھک کر رکھیں ان کے نزدیک عورتوں سے مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ جب ہتھیلی چھپانا ضروری ہے تو اس کی طرف دیکھنا ہی جائز نہیں ہے اور جب ان کیطرف دیکھنا جائز نہیں ہے تو مصافحہ کرنا بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوسکتا۔کیونکہ مصافحہ کی صورت میں ہاتھ کا ہاتھ سے لمس ہوتا ہے۔لیکن ان فقہاءِ کرام کی تعداد تھوڑی ہے۔ اکثریت ان فقہاءِ کرام کی ہے جو غیرمحرموں کے سامنے چہرہ اور ہاتھ کھولنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک ہاتھ کھولنا تو جائز ہے' لیکن کیا مصافحہ کرنا بھی جائز ہے اگر یہ مصافحہ لذت کی خاطر نہیں' بلکہ سماجی روایات کی وجہ سے کیا جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ مجھے قرآن وسنت میں ابھی تک کوئی ایسی واضح دلیل نہیں ملی ہے جو اس طرح کے مصافحے کو ناجائز قرار دے۔زیادہ سے زیادہ یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ یہ عمل باعثِ فتنہ ہے اور اس فتنے کی وجہ سے اس عمل کو جائز نہیں ہونا چاہئے' لیکن یہ عمل اس وقت باعث فتنہ ہوسکتا ہے جب مصافحہ جنسی لذت کی خاطر کیا جائے اور ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ جنسی لذت کی خاطر مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے۔لیکن اگر مصافحہ جنسی لذت کی خاطر نہیں' بلکہ رسم ورواج کی وجہ سے اور روایتی انداز میں کیا جائے تو اس میں کسی قسم کے فتنہ کی گنجائش نہیں ہوتی ہے تو کیا پھر بھی وہ مصافحہ ناجائز قرار دیا جائے گا؟

بعض علماءِ کرام عورتوں سے مصافحہ کو ناجائز قرار دینے کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ نے مردوں اور عورتوں دونوں سے بیعت کی تھی کیونکہ اللہ نے حضور ﷺ کو اس کا حکم دیا تھا جیسا کہ سورۂ ممتحنہ میں اس کا بیان ہے۔حضور ﷺ

نے مردوں سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی تھی جبکہ عورتوں سے محض زبانی طور پر بیعت کی اور ان سے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نبی ﷺ کا بیعت کے وقت عورتوں سے ہاتھ نہ ملانا اس بات کی واضح دلیل نہیں ہے کہ عورتوں سے مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ نبی ﷺ نے بہت سارے کام محض اس وجہ سے نہیں کیے کہ یہ کام جائز ہونے کے باوجود ذاتی طور پر آپ کو پسند نہیں تھے۔ مثلاً بجو کھانا آپ کو پسند نہیں تھا اور آپ ﷺ اسے نہیں کھاتے تھے' حالانکہ اس کا کھانا حلال ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کچی پیاز اور کچا لہسن نہیں کھاتے تھے' حالانکہ یہ دونوں چیزیں حلال ہیں۔ یہ محض آپ کا ذاتی عمل تھا اور ہم اس بات کے پابند نہیں ہیں کہ ہم بھی ان چیزوں کو ناپسند کر کے نہ کھائیں۔ اسی طرح عورتوں سے بیعت کے وقت ہاتھ ملانا حضور ﷺ کو ناپسند محسوس ہوا اور آپ نے ہاتھ نہیں ملایا' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بھی اس بات کے پابند ہیں کہ ہم اسے ناپسند کریں اور عورتوں سے ہاتھ نہ ملائیں۔ البتہ اگر حضور ﷺ نے اپنے قول سے بھی اسے منع کر دیا ہوتا تو اور بات تھی۔ لیکن حضور ﷺ نے اپنے قول سے منع نہیں کیا ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی تسلیم شدہ اور متفق علیہ نہیں ہے کہ حضور ﷺ نے بیعت کے موقع پر عورتوں سے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ چنانچہ حضرت اُمّ عطیہ انصاریہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے کسی اور بیعت کے موقع پر عورتوں سے ہاتھ ملایا تھا۔ یہ روایت صحیح ابنِ حبان اور طبری میں موجود ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آنحضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر عورتوں سے جو بیعت کی تھی اس میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملایا تھا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قسم کھا کر فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے اس بیعت کے موقع پر عورتوں سے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ البتہ اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا کسی اور بیعت کے متعلق فرماتی ہیں کہ اس موقع پر حضور ﷺ نے بیعت کے وقت عورتوں سے ہاتھ ملایا تھا۔

بعض علماءِ کرام عورتوں سے مصافحہ کو نا جائز قرار دینے کے لیے یہ حدیث بھی بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں:

لَاَنْ يُّطْعَنَ فِیْ رَأْسِ اَحَدِكُمْ بِمِخْيَطٍ مِّنْ حَدِيْدٍ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يَّمَسَّ اِمْرَاَةً لَا تَحِلُّ لَهٗ

''تم میں سے کسی کے سر میں لوہے کی سوئی چبھوئی جائے بہتر ہے اس بات سے کہ وہ کسی ایسی عورت سے ''مس'' ہو جائے جو اس کے لیے حلال نہیں ہے''۔

لیکن یہ حدیث بھی عورتوں سے مصافحہ کو نا جائز قرار دینے کے لیے دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ علماءِ حدیث نے اس حدیث کو صراحت کے ساتھ صحیح نہیں قرار دیا ہے اور اسی وجہ سے قدیم علماء نے اس حدیث کو کبھی بطورِ دلیل نہیں پیش کیا ہے۔ اگر بالفرض اس حدیث کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس حدیث میں جس چیز سے خبردار کیا گیا ہے وہ ہے عورتوں سے ''مس'' کرنا۔ اور ''مس'' کا مفہوم بدن کے کسی حصہ کا محض چھو جانا نہیں ہے' بلکہ قرآن و حدیث میں لفظِ ''مس'' دو معنوں میں استعمال ہوا ہے:

(الف) جماع اور ہم بستری کے معنی میں۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت:

اَنّٰى يَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ (آلِ عمران:۴۷)

''مجھے بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے حالانکہ کسی مرد نے مجھے مس نہیں کیا ہے (میرے ساتھ ہم بستری نہیں کی ہے)''۔

ظاہر ہے کہ صرف چھو جانے سے عورت حاملہ نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے اس آیت میں ''مس'' سے مراد ہے ہم بستری کرنا۔ اور اسی طرح قرآن میں جہاں جہاں لفظِ مس استعمال ہوا ہے وہاں اس کا یہی مفہوم ہے۔

(ب) ہم بستری سے پہلے جو حرکتیں ہوتی ہیں مثلاً بوسہ لینا' گلے لگانا اور جسم سے لگا کر بھینچنا وغیرہ۔ قرآن کے الفاظ ''اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ'' کی تشریح کرتے ہوئے

مفسرین نے یہی مفہوم اخذ کیا ہے۔

الغرض قرآن وحدیث میں کوئی ایسی واضح اور صریح دلیل نہیں ہے جو جسم کے کسی حصے سے محض چھو جانے کو ناجائز قرار دے بلکہ اس کے برعکس ایسی دلیلیں پائی جاتی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ عورت اور مرد کا ہاتھ محض چھو جانا کوئی قابلِ گرفت عمل نہیں ہے۔ بشرطیکہ یہ شہوت اور جنسی لذت کی خاطر نہ ہو اور نہ اس میں کسی قسم کا فتنہ ہو۔ حضور ﷺ کی زندگی پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ کا ہاتھ عورتوں کے ہاتھ میں گیا ہے۔ اگر یہ کام ناجائز ہوتا تو یہ عمل حضور ﷺ سے ہرگز سرزد نہ ہوتا۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اگر مدینہ کی ایک لونڈی بھی حضور ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیتی تو جہاں چاہتی لے جاتی''۔ یہی حدیث مسند احمد میں بھی ہے اور اس کے الفاظ یوں ہیں۔ ''مدینہ کی کوئی لونڈی اگر آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیتی تو آپ ﷺ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتے اور وہ جہاں چاہتی لے جاتی''۔

علامہ حافظ ابنِ حجر بخاری شریف کی مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ حضور ﷺ کے اندر حد درجہ تواضع اور انکساری تھی کہ اگر لونڈی بھی آپ ﷺ کے ہاتھ کو پکڑ کر کہیں لے جانا چاہتی تو آپ تواضعاً اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتے تھے اور اس کے ساتھ چل دیتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کا لونڈی کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے ثابت ہوتا ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کا ہاتھ پکڑنا جائز ہے بشرطیکہ یہ شہوت اور جنسی لذت کی خاطر نہ ہو یا اس میں کسی قسم کا فتنہ نہ ہو۔ اگر یہ کام جنسی لذت کی خاطر ہو یا اس عمل میں کسی فتنہ کا اندیشہ ہو تو پھر یہ عمل ناجائز قرار پائے گا۔

مذکورہ حدیث سے بھی زیادہ واضح اور صریح جو کہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے وہ یہ کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی خالہ اور عبادہ ابن الصامت رضی اللہ عنہ کی بیوی یعنی اُمّ حرام رضی اللہ عنہا کے گھر پر قیلولہ فرمایا اور ان کی

گود میں سر رکھ کر سو گئے اور وہ آپ ﷺ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہیں''۔

حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مہمان اپنے میزبان کے گھر میں اس کی اجازت سے قیلولہ کر سکتا ہے اور یہ کہ عورت اپنے غیر محرم اور اجنبی مہمان کی خدمت کر سکتی ہے۔ اسے کھانا پانی دے سکتی ہے اور اس کے آرام کا انتظام کر سکتی ہے۔

چونکہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی ہے اس لیے عام طور پر یہ حدیث پڑھ کر وہ لوگ بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں جو عورتوں کے معاملے میں ذرا سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ آخر نبی ﷺ نے ایک غیر محرم عورت کی گود میں سر کیسے رکھا اور اپنے بالوں میں ان کی انگلیوں سے کنگھا کروایا اور پھر سو گئے۔ جان چھڑانے کے لیے یہ لوگ یہ تاویل کرتے ہیں کہ اُمّ حرام رضی اللہ عنہا شاید حضور ﷺ کی رضاعی ماں یا خالہ تھیں۔ اور بعض یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ عمل حضور ﷺ کے لیے خاص تھا۔ دوسروں کے لیے یہ عمل جائز نہیں ہے۔ بعض یہ تاویل کرتے ہیں کہ چوں کہ حضور ﷺ کو اپنے جذبات پر بہت زیادہ قابو تھا اس لیے آپ کے لیے یہ عمل جائز تھا۔

یہ تمام تاویلیں ناقابلِ قبول ہیں۔ چنانچہ علامہ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ' قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگ علماء ان تاویلوں کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُمّ حرام رضی اللہ عنہا کا حضور ﷺ کی رضاعی ماں یا خالہ ہونا کسی بھی حوالہ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ عمل حضور ﷺ کے لیے خاص تھا۔ کیونکہ اس عمل کو حضور ﷺ کے ساتھ خاص ثابت کرنے کے لیے کوئی واضح دلیل چاہیے' لیکن اس کے لیے کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس لیے ہم محض اپنی مرضی سے کسی عمل کو حضور ﷺ کے ساتھ خاص نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہنا بھی کافی نہیں ہے کہ حضور ﷺ کو اپنی نفسانی خواہشات پر بہت زیادہ قابو تھا اس لیے یہ عمل آپ ﷺ کے لیے جائز تھا۔ کیونکہ خواہشوں پر قابو پانے کی وجہ سے حضور ﷺ کے لیے یہ عمل جائز تھا تو پھر یہ عمل ان کی

اُمت میں سے ہر اس شخص کے لیے جائز ہونا چاہیے جسے اپنی خواہشات پر قابو ہو۔ اس لیے تاویلوں کے ذریعہ حضور ﷺ کے اس عمل کو جائز قرار دینا' نامناسب اقدام ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم بغیر کسی تاویل کے ہی یہ تسلیم کرلیں کہ چونکہ حضور ﷺ نے اسطرح کا عمل کیا اس لیے یہ عمل جائز ہے۔ بغیر کسی شہوت کے کسی عورت سے مصافحہ کرنے کا جواز ام عطیہ رضی اللہ عنہا والی اس حدیث سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے جس کا تذکرہ ہم اوپر کرآئے ہیں اور جس میں اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کسی بیعت کے موقع پر حضور ﷺ نے عورتوں سے ہاتھ ملایا تھا۔

ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بغیر کسی شہوت اور جنسی لذت کے کسی عورت سے ہاتھ ملانا اور مصافحہ کرنا شرعاً جائز ہے۔ خاص کر ایسی صورتِ حال میں کہ دونوں کے درمیان کوئی قریبی رشتہ داری ہو اور دونوں عرصہ کے بعد ملے ہوں یا عید و بقرعید وغیرہ کا موقع ہو۔

لیکن مناسب یہ ہوگا کہ مصافحہ کا جواز صرف ضرورت کی حد تک محدود ہو۔ اسی وقت مصافحہ کیا جائے جب اس کی شدید ضرورت ہو۔ مثلاً یہ کہ مصافحہ نہ کرنے کی صورت میں کدورت اور دشمنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جیسا کہ آپ نے اپنے سوال میں لکھا ہے اور مناسب یہ ہوگا کہ عورتوں سے مصافحہ کرنے میں پہل نہ کی جائے۔ البتہ اگر ان کیطرف سے پہل ہو تو پھر مصافحہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مصافحے کے جواز کا میرا یہ فتویٰ اس شخص کے لیے ہے جس کے لیے مصافحہ کرنا' ناگزیر ہو جائے' جیسا کہ سوال کرنے والے نے اپنی حالت لکھی ہے اور ایسے شخص کو مصافحہ کرتے ہوئے یہ نہیں محسوس کرنا چاہیے کہ وہ کوئی خلافِ شرع کام کر رہا ہے اور نہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کے اس عمل کو خلافِ شرع قرار دے کیونکہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اجتہادی مسائل میں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے اور میں نے نہایت ایمانداری کے ساتھ اور تمام دلائل کی روشنی میں اجتہاد کر کے

اپنی یہ رائے قائم کی ہے۔

عورتوں کا نوکری کرنا

سوال: عورت گھر سے باہر نکل کر نوکری کرے' اس سلسلے میں اسلامی شریعت کا کیا موقف ہے؟ کیا یہ بات مناسب بلکہ ضروری نہیں معلوم ہوتی کہ عورت ذات بھی اپنے علم و ہنر اور اپنی خدمتوں اور صلاحیتوں کے ذریعے معاشرے کی ترقی و بہبودی میں اپنے حصے کا رول ادا کرے؟ یا یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں محصور ہو کر اپنی تمام صلاحیتیں اور محنتیں گھر کی تعمیر و ترقی پر صرف کر دے۔ ہم نے بہت سنا ہے کہ ہمارے دینِ اسلام نے عورت کو وہ مقام و مرتبہ عطا کیا ہے' جس سے وہ پہلے محروم تھی اور اسلام ہی نے عورت کو وہ انسانی اور بنیادی حقوق عطا کیے' جن کا وہ پہلے تصور نہیں کر سکتی تھی۔ کیا عورت کا نوکری کرنا انسانی اور بنیادی حقوق میں شامل نہیں ہے؟ اس نوکری کے ذریعے اس کی اپنی شخصیت مضبوط ہوتی ہے' خود اعتمادی حاصل ہوتی ہے اور وقت پڑنے پر اسے ہاتھ پھیلانے کی ذلت نہیں اٹھانی پڑتی ہے۔

لیکن جس اسلام نے عورتوں کو اتنی عزت بخشی ہے اس اسلام کے نام پر عورتوں کو نوکری کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ علماء نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایک متقی اور پرہیزگار عورت شرعی حدود میں رہتے ہوئے کیا نوکری کر سکتی ہے؟ اور کون سی نوکری کر سکتی ہے؟ ہم قرآن و سنّت کی روشنی میں اس کا جواب چاہتے ہیں' نہ کہ ان لوگوں کی رائے سننا چاہتے ہیں جو عورتوں کے معاملے میں بڑے سخت گیر ہیں اور جن کے نزدیک عورت کا تعلیم حاصل کرنا بھی ناجائز ہے اور نہ ان لوگوں کی رائے سننا چاہتے ہیں جو عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر شمعِ محفل بنانا چاہتے ہیں۔ ہم تو فقط قرآن و حدیث کی روشنی میں اللہ کا حکم سننا چاہتے ہیں۔

جواب: مرد کی طرح عورت بھی ایک انسان ہے اور دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم اور اٹوٹ حصہ ہیں۔ جس طرح ایک مرد کام کرنے اور عمل کرنے

کا مکلف ہے' اسی طرح ایک عورت بھی کام کرنے اور عمل کرنے کی مکلّف ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ج (آل عمران:۱۹۵)

''پس ان کے ربّ نے ان کی پکار سنی اور فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا' چاہے وہ مرد ہو یا عورت''۔

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ عورت انسانی آبادی کا تقریباً نصف حصہ ہے۔ اگر ہم نے عورتوں کو کام سے روک کر گھروں میں بٹھا دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی آبادی کا پچاس فیصد حصہ ناکارہ پرزوں کی طرح غیر مفید اور برباد ہو جائے گا۔ اور اسلام جیسے مکمل اور سچے دین سے یہ تصوّر ناممکن ہے کہ وہ انسانی آبادی کے نصف حصے کو ناکارہ اور برباد کر دینے کی ترغیب یا حکم دے گا۔ کیا یہ اچھی بات ہوگی کہ عورت دنیا کی تمام لذتوں سے لطف اندوز تو ہو لیکن خود اتنی بے صلاحیت اور ناکارہ ہو کہ دنیا والوں کو اس کی ذات سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ ہو؟ کیا یہ معقول بات ہوگی کہ عورت دُنیوی ترقیوں اور نت نئی ایجادات سے استفادہ تو کرے لیکن ان ترقیوں میں اس کا اپنا کوئی رول نہ ہو؟ یہ کس قدر عظیم اور ناقابلِ تلافی نقصان والی بات ہوگی کہ انسانی آبادی کے نصف حصے کو گھروں میں بٹھا کر ناکارہ بنا دیا جائے۔

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورتوں کو چاہیے کہ گھروں میں بیٹھ کر اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں اور اپنی صلاحیتوں کو زنگ نہ لگنے دیں بلکہ مردوں کی طرح انہیں بھی کام کرنا چاہئے اور معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنے حصے کی صلاحیتیں پیش کرنی چاہئیں۔ تاہم اگر عورت کی جسمانی ساخت اور اس کی جملہ صلاحیتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورت کا سب سے عظیم کام اور اس کی سب سے نمایاں ذمّے داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اس طرح تعلیم و تربیت کرے کہ مستقبل میں یہ بچے معاشرے کی تعمیر و

ترقی میں نمایاں رول ادا کرسکیں۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آج کے بچے مستقبل کے معمار ہیں تو پھر ان کی بہتر اور مکمل تربیت سے زیادہ نفع بخش کام اور کون سا ہوسکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خالقِ کائنات نے بھی عورت کو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اس ذمّے داری کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے۔ مستقبل کا تعلق خواہ دنیاوی بہبود سے ہو یا آخرت کی فلاح و کامرانی سے عورت اگر اپنے بچوں کی اس رُخ پر تربیت کرتی ہے تو گویا اس نے اپنی ذمّہ داری پوری کرلی۔

بچوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ عورت کی ذمّے داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گھر کے ماحول کو پُرسکون اور آرام دہ بنانے کی بھرپور سعی کرے۔ اپنے شوہر اور بچوں کو راحت اور سکون پہنچانے کے لیے کام کرے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گھر سے باہر جاکر نوکری کرنے کی گنجائش عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ شریعت میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے کہ گھر سے باہر نکل کر عورتوں کا نوکری کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ جب شریعت نے یہ چیز حرام نہیں کی ہے تو کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک حلال چیز کو حرام قرار دے۔ ویسے بھی اسلامی فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں اصولی طور پر حلال ہیں' سوائے ان چیزوں کے جنھیں قرآن و حدیث میں واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہو۔ چونکہ گھر سے باہر نکل کر عورتوں کے نوکری کرنے کو قرآن و حدیث میں حرام اور ناجائز نہیں قرار دیا گیا ہے' اس لیے اصولی طور پر یہ چیز جائز اور حلال ہے۔ اس قاعدے کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں کا نوکری کرنا جائز ہے' بلکہ اگر وہ مطلقہ یا بیوہ ہے اور آمدنی کے سارے راستے اس پر بند ہیں تو صرف جائز ہی نہیں' بلکہ ضروری ہے۔ اگر وہ نوکری یا جاب کرکے اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کرسکتی ہے تو اسے چاہیے کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے' دوسروں پر بوجھ بننے کی بجائے ملازمت کرلے۔ تاکہ وہ تمام رسوائیوں سے محفوظ رہے۔ بعض حالات میں شوہر کی موجودگی میں بھی عورت کو نوکری کرنے کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ مثلاً شوہر کی آمدنی

اخراجات کے لیے ناکافی ہو یا عورت کے بوڑھے ماں باپ ہوں اور چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہوں وغیرہ۔ان حالات میں اسے ملازمت کا اختیار ہے۔ اسی طرح کی صورتِ حال کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ملاحظہ ہو:

قَالَتَا لَا نَسْقِىْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ○

(القصص:۲۳)

''انہوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں' جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں''۔

باپ چونکہ بوڑھے تھے اس لیے گھر سے باہر جا کر پانی بھرنے اور دوسرے کام کرنے کی ذمّے داری ان دونوں جوان بیٹیوں پر تھی۔ یہ بوڑھے باپ جیسا کہ دوسرے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے' اللہ کے نبی تھے۔

اسی طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسما رضی اللہ عنہا گھر سے باہر نکل کر اپنے شوہر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھیں' گھوڑوں کی مالش کرتی تھیں' ان کے لیے دانے کوٹتی تھیں اور دُور کسی باغ سے یہ دانے اپنے سر پر اٹھا کر لاتی تھیں۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ اُمت مسلمہ تعلیم اور دوسری ترقیوں کے میدان میں کافی پیچھے رہ گئی ہے' اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہماری مسلم عورتوں میں بھی ڈاکٹر ہوں' نرس ہوں' لیکچرر اور پروفیسر ہوں۔ عورتیں بیمار ہوتی ہیں تو مسلمان لیڈی ڈاکٹر نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً مرد ڈاکٹروں کے پاس علاج کے لیے جانا پڑتا ہے۔ سکول اور کالج میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے غیر مسلم اساتذہ اور لیکچرر ہوتے ہیں' جن سے یہ توقع فضول ہے کہ وہ مسلم لڑکیوں کی تربیت اسلامی انداز میں کریں گے۔ غرض کہ دورِ حاضر میں بہت سارے ایسے پروفیشن (Profession) ہیں' جن میں

مسلم عورتوں کی شدید قلت ہے۔ اس قلت کی وجہ سے مسلم معاشرے کو ناقابلِ تلافی نقصان ہو رہا ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہماری عورتیں بھی ان شعبوں میں آئیں۔ بہرکیف ضرورت اور حالات کے مطابق عورت کا نوکری کرنا' جائز اور حلال ہے' لیکن اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال کرنا ضروری ہے:

(۱) یہ ضروری ہے کہ نوکری میں کوئی ایسا کام نہ ہو جو شرعاً ناجائز اور غلط ہو۔ مثلاً کسی کنوارے لڑکے کے یہاں خادمہ کی نوکری کرنا یا کسی شخص کی پرسنل سیکرٹری بننا کیونکہ تنہائی میں کسی غیر مرد کے ساتھ وقت گزارنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ڈانس اور گانے وغیرہ کی نوکری ہو یا ائیر ہوسٹس کی نوکری کرنا۔ کیونکہ غیر شرعی لباس پہننا اور شراب پیش کرنا اور تنہائی میں غیر مردوں کے ساتھ رہنا' اس نوکری کے لازمی اجزاء ہیں۔ اسی طرح ہر وہ نوکری جس میں کوئی غیر شرعی کام ہو' جائز نہیں ہے۔

(۲) یہ ضروری ہے کہ نوکری کرتے ہوئے عورت تمام اخلاقی اور اسلامی آداب کا خیال رکھے۔

(۳) یہ ضروری ہے کہ اس کی نوکری کرنے سے اس کی دوسری اوّلین اور زیادہ اہم ذمّے داریاں متاثر نہ ہوں۔ مثلاً بچوں کی نگہداشت اور امورِ خانہ داری میں غفلت نہ ہو یا اس کی نوکری کی وجہ سے گھر کا سکون و آرام غارت نہ ہو۔ کیونکہ بچوں کی نگہداشت اور گھر کے ماحول کو پُرسکون بنانا' عورت کی اوّلین ذمّے داری ہے۔

نقاب یا برقع

سوال: مصر کے ایک استاد نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ نقاب کا رواج ایک بدعت ہے' کیونکہ حضور ﷺ کے زمانے میں اس طرح کے نقاب کا رواج نہیں تھا۔ ازہر یونیورسٹی جو کہ ایک دینی ادارہ ہے' یہاں کے ایک عالمِ دین نے بھی اس بات کی تائید کی ہے۔ کیا واقعی موجودہ زمانے کا نقاب ایک بدعت ہے؟ امید ہے کہ آپ تسلی بخش جواب

دیں گے۔

جواب: حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں رائج شدہ نقاب یا برقع کو بدعت کہنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ اسلامی شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے علمی اعتبار سے اس دعویٰ میں کوئی سچائی نہیں ہے بلکہ حقائق کی غلط عکاسی ہے۔

دراصل نقاب کا استعمال بدن کے ساتھ ساتھ چہرے اور ہاتھ چھپانے کے لیے ہوتا ہے ورنہ پردہ بغیر نقاب کے بھی ہوسکتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پردہ میں چہرہ اور ہاتھ چھپانا ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور ہی سے اس بات پر اختلاف رہا ہے کہ چہرہ اور ہاتھ چھپانا بھی ضروری ہے یا نہیں۔ میں پچھلے جواب میں واضح کر چکا ہوں کہ فقہاءِ کرام کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ چہرے اور ہاتھ کو چھپانا ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح علماءِ کرام مندرجہ ذیل آیت میں لفظ ''جلابیب'' کے سلسلے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ اس سے کون سا لباس مراد ہے۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ○ (الاحزاب:۵۹)

''اے نبی! اپنی بیویوں' بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر جلابیب ڈال لیا کریں۔ اس طرح ان کی پہچان واضح رہے گی اور لوگ انہیں تنگ نہیں کریں گے اور اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے''۔

بعض علماءِ کرام کے نزدیک جلابیب وہ لباس ہے جو بدن کے ساتھ چہرہ اور ہاتھ کو بھی چھپائے اور اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جلابیب کے دائرے میں چہرے اور ہاتھ کو چھپانا نہیں آتا۔ میرا موقف یہ ہے کہ پردے میں چہرہ اور ہاتھ چھپانا ضروری نہیں ہے۔

یہی موقف عرب و عجم کے جمہور علماء کا ہے۔ البتہ سعودی عرب اور ہندوستان و پاکستان کے علماء اس موقف سے اختلاف رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پردے میں چہرہ اور ہاتھ چھپانا لازمی ہے۔ سعودی عرب کے علماء میں سرِفہرست مرحوم شیخ عبداللہ بن باز ہیں اور ہندو پاک میں سرِفہرست مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''پردہ'' میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ وہ چہرہ کا چھپانا ضروری تصوّر کرتے تھے کیونکہ عورت کا حسن اس کے چہرے سے مترشح ہوتا ہے اور چہرہ کھلا رکھنا باعثِ فتنہ ہو سکتا ہے۔ اس موقف کے پیشِ نظر نقاب کا استعمال پہلے بھی ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے۔

چونکہ چہرہ چھپانا یا اس کا کھلا رکھنا ایک اختلافی مسئلہ ہے' اس لیے ہر صاحب رائے کو پورا حق ہے کہ وہ اپنے موقف کے مطابق عمل کرے۔ اگر کسی کا موقف یہ ہے کہ چہرہ چھپانا لازمی ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے موقف کے مطابق عمل کرے اور کسی دوسرے شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسے غلط یا گمراہ بدعت قرار دے۔

جو عورتیں چہرہ چھپانے کے حق میں ہیں اور سمجھتی ہیں کہ نقاب لگا کر ہی پردہ کا اہتمام ہو سکتا ہے تو انہیں اس رائے کے اختیار اور اس کے مطابق عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ اگر ہم انہیں اس آزادی سے محروم کر دیں گے تو شریعت کی نظر میں ایک غلط اقدام ہوگا۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی عورت چہرہ چھپانا ضروری نہیں سمجھتی ہے اس کے باوجود محض احتیاطاً اپنا چہرہ چھپاتی ہے اور نقاب لگاتی ہے تو ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اسے اس عمل سے منع کر دیں۔

حیرت ہے ان علماء پر جو نقاب کو بدعت قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں' جبکہ سلفِ صالحین کے زمانے سے ہی اس نقاب کا رواج ہے اور عورتیں شریعت کا حکم سمجھ کر یہ نقاب لگاتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ نقاب کی آڑ میں نقاب لگانے والیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور نقاب کی مخالفت کی جاتی ہے۔ حالانکہ نقاب

بہر حال ایک خالص اسلامی لباس ہے۔ جبکہ ان عورتوں کو کچھ نہیں کہا جاتا ہے جو تنگ اور مختصر کپڑے پہن کر اور چہرے پر ہزار قسم کے میک اپ کر کے کالجوں، یونیورسٹیوں اور بازاروں میں دندناتی پھرتی ہیں۔ اس غیر اسلامی لباس کی انہیں ہمارے معاشرے میں پوری آزادی ہے اور کوئی بھی ان پر تنقید کرنے کی جرأت نہیں کرتا ہے اور اگر جرأت کرے تو دقیانوسی، کٹر پنتھی اور نہ جانے کیا کیا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے غیر شرعی لباس زیب تن کرنے والیوں پر حدیث میں لعنت کی گئی ہے۔

پردے کی حیثیت

سوال: آپ نے نقاب کی حمایت اور اسے بدعت قرار دینے والوں کی مخالفت میں جو کچھ لکھا ہے، اسے ہم نے پڑھا۔ آپ نے واضح کر دیا ہے کہ نقاب کا رواج کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا چلن ہمارے سلفِ صالحین کے زمانے میں بھی تھا، اسے بدعت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسے بدعت قرار دینے والے دراصل چاہتے ہیں کہ ہماری عورتیں بھی بے نقاب ہو کر مغربی عورتوں کی طرح شمعِ محفل بن کر رہ جائیں۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے اور حق و انصاف کی بات کہی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نقاب کو لازمی اور فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے بہ قول عورتوں کا چہرہ کھلا رکھنا حرام ہے۔ یہ لوگ وقتاً فوقتاً ان عورتوں کو اپنی سخت تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں، جو پردہ تو کرتی ہیں، لیکن چہرہ کھلا رکھتی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ایسی عورتیں قرآن و سنت کی خلاف ورزی کر رہی ہیں اور چہرہ کھلا رکھنے کی وجہ سے بڑے گناہ میں مبتلا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں پردہ واجب اور فرض ہے، لیکن نقاب لگانا اور چہرے کو چھپا کر رکھنا ہمارے نزدیک بھی لازمی اور ضروری نہیں ہے۔ ہمارے پاس اتنا علم نہیں ہے کہ ہم ان سخت گیر قسم کے لوگوں کو سمجھا سکیں۔ امید ہے کہ آپ اس موضوع پر بالتفصیل روشنی ڈالیں گے۔ بہ راہ مہربانی آپ یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش نہ کریں کہ ہم آپ کی فلاں فلاں کتاب میں اس موضوع کو پڑھ لیں، کیونکہ بہت کچھ لکھنے کے باوجود بات بحث و مباحثہ کا

موضوع بنی ہوئی ہے۔

جواب: ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب ''اسلام میں حلال وحرام'' اور دوسری کتابوں میں بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے' لیکن ہماری بہنیں اور بیٹیاں چاہتی ہیں کہ میں مزید تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر لکھوں حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اس طرح کے مختلف فیہ مسائل ہمیشہ موضوع بحث بنے رہیں گے' چاہے ان پر ہزاروں کتابیں لکھ دی جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مزاج' عقل اور پسند وناپسند میں مختلف ہوتا ہے۔ بعض لوگ فطری طور پر سخت مزاج ہوتے ہیں' اس لیے دینی مسائل میں سخت موقف اپناتے ہیں اور بعض لوگ نرم مزاج ہوتے ہیں' اس لیے شرعی مسائل میں بھی نرم پہلوؤں کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض لوگ کم عقل اور کوتاہ فہم ہوتے ہیں' اس لیے قرآن وسنت کی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں' جبکہ بعض لوگ دینی مسائل کو سمجھنے میں خداداد صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فقہی مسائل میں اختلاف ہمارے لیے رحمت ہے۔ مسائل میں اختلاف کو دیکھ کر گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس اختلاف سے ہماری شریعت میں وسعت آتی ہے اور مختلف رایوں میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی مسائل میں اختلاف کرتے تھے لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے سینے میں اتنی وسعت رکھتا تھا کہ دوسروں کی رائے اختیار کرنے میں اسے کوئی تأمل نہیں ہوتا تھا اور نہ اس اختلاف کی وجہ سے ان کے درمیان کسی قسم کی کوئی رنجش پیدا ہوتی تھی۔

اس تمہید کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے ہی سے فقہاءِ کرام کی اکثریت کا موقف یہ رہا ہے کہ پردے میں نقاب کا استعمال لازمی اور ضروری نہیں ہے اور یہ کہ چہرہ اور ہاتھ کھلا رکھا جا سکتا ہے۔ ذیل میں' میں ہر مسلک کا موقف مختصراً بیان کرتا ہوں۔

(۱) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

احناف کی مشہور کتاب ''الاختیار لتعلیل المختار'' میں اس موضوع پر یوں بحث کی گئی ہے:

''کسی اجنبی عورت کی طرف دیکھنا جائز نہیں ہے' سوائے اس کے چہرے اور ہاتھ کے۔ بشرطیکہ چہرہ اور ہاتھ دیکھنے میں کوئی جنسی لذت نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پیر بھی کھلا رکھا جا سکتا ہے' کیونکہ کام کاج اور گھریلو مصروفیات کی وجہ سے جس طرح ہاتھ کھلا رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح پیر کا کھلا رکھنا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے''۔

(۲) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

مالکی مسلک کی مشہور کتاب ''اقرب المسالك الی مذهب مالك'' کی عبارت کچھ یوں ہے:

''غیر محرم مرد کے سامنے عورت کا پورا بدن ستر ہے سوائے اس کے چہرے اور ہاتھ کے' کیونکہ یہ دونوں چیزیں ستر میں شامل نہیں ہیں۔ اور ان کا کھلا رکھنا جائز ہے۔ بشرطیکہ شہوت کی نظر نہ ہو''۔

(۳) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

شافعی مسلک کی مشہور کتاب ''المهذب'' میں اس موضوع پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

''آزاد عورت کا پورا بدن ستر ہے سوائے اس کے چہرے اور ہاتھ کے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں عورت کو ہاتھ میں دستانہ اور چہرہ پر نقاب لگانے سے منع فرمایا ہے۔ اگر چہرہ اور ہاتھ بدن کے دوسرے اعضاء کی طرح ستر ہوتا تو بدن کے دوسرے اعضاء کی طرح ان کا چھپانا بھی ضروری ہوتا اور اس لیے بھی کہ کام کاج کی وجہ سے ان کا کھلا رکھنا ضروری ہوتا ہے اور ان کے چھپانے میں زبردست اذیت اور پریشانی ہے''۔

(۴) امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

حنبلی مسلک کی مشہور کتاب ''المغنی'' میں کچھ اس قسم کے الفاظ ہیں:

''حنبلی مسلک میں اس بات پر اختلاف نہیں ہے کہ عورت کے لیے چہرہ اور ہاتھ کھلا رکھنا جائز ہے۔ البتہ ان کے علاوہ کچھ اور کھلا رکھنا جائز نہیں ہے''۔

یہ تو ہوئی چاروں مشہور مسالک کی رائے۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے مشہور اور قابلِ قدر علماء اور فقہاء ہیں، جن کی یہی رائے ہے۔ چنانچہ امام ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ بھی عورت کے ستر سے چہرے اور ہاتھ کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ ان کی کتاب ''المحلی'' میں درج ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''المجموع'' میں اس موضوع پر علماء کی رائے لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، شافعی رحمۃ اللہ علیہ، مالک رحمۃ اللہ علیہ، احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ، ابوثور رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بہت سارے علماء کی رائے یہ ہے کہ عورت کا پورا بدن ستر ہے۔ سوائے اس کے چہرے اور ہاتھ کے۔ یہی مسلک امام داؤد کا ہے۔ یہ تمام علماءِ کرام اپنے مسلک کی حمایت میں جو دلیلیں پیش کرتے ہیں، انہیں میں ذیل میں مختصراً بیان کرتا ہوں:

(۱) قرآن کی آیت وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَاظَھَرَ مِنْھَا (اور وہ اپنی زینت و زیبائش کو کھلا نہ رکھیں مگر وہ جو خود بہ خود ظاہر ہو جائے) کی تفسیر میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اکثریت اِلَّا مَاظَھَرَ مِنْھَا سے مراد چہرہ اور ہاتھ لیتی ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اس موقف کی تائید ابوداؤد کی یہ حدیث کرتی ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائیں۔ ان کے بدن پر باریک اور شفاف کپڑا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نگاہیں پھیر لیں اور فرمایا کہ اے اسماء عورت جب بالغ ہو جائے تو مناسب نہیں ہے کہ اس کے بدن کا کوئی حصہ نظر آئے، سوائے اس کے اور اس کے اور آپ نے چہرے اور ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ اس مفہوم کی دوسری حدیثیں بھی ہیں۔

(۲) سورۂ نور کی آیت وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ''خمار'' سے اپنے سینے کو ڈھک کر رکھیں۔ ''خمار'' وہ دوپٹا ہے جسے عورتیں اپنے سر پر رکھتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ سر کے دوپٹے سے سر کے علاوہ سینے کو بھی ڈھک کر رکھیں۔ اگر چہرہ چھپانا ضروری ہوتا تو انہیں سینہ کے ساتھ چہرہ چھپانے کا بھی حکم دیا جاتا' لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ امام ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں چہرے کا ذکر نہیں کیا ہے' بلکہ صرف سینہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اس بات کی صراحت ہو جاتی ہے کہ چہرہ چھپانا ضروری نہیں ہے۔

(۳) سورۂ نور کی آیت قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ میں اللہ نے مردوں کو حکم دیا ہے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں یعنی خواہ مخواہ عورتوں پر نگاہیں نہ ڈالتے پھریں۔ کسی موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ جب بار بار کسی خوبصورت عورت کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّمَا لَكَ الْاُوْلٰى وَلَيْسَتْ لَكَ الْاٰخِرَةَ (ترمذی) (ایک نظر کے بعد دوسری نظر مت ڈالو کیونکہ پہلی نظر تو جائز ہے' لیکن دوسری نہیں)۔

غور طلب بات یہ ہے کہ عورتیں اگر مکمل برقع پوش ہوں اور ان کے ہاتھ اور چہرے بھی نظر نہ آئیں تو پھر نگاہیں نیچی رکھنے اور ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنے کا حکم کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ نظر بار بار اُدھر اٹھتی ہے جہاں کشش ہوتی ہے۔ اور یہ کشش عورت کے چہرے میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ تم اپنی اس کشش کو چھپا کر رکھو بلکہ مردوں کو حکم دیا کہ نگاہیں نیچی رکھو اور بار بار اس پُرکشش چیز کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں اپنا چہرہ کھلا رکھتی تھیں اسی لیے مردوں کو حکم دیا گیا کہ تم اپنی نگاہیں نیچی رکھو اور بار بار ان کی طرف نہ دیکھو۔ اگر چہرہ چھپانا ضروری ہوتا تو عورتوں کو بھی حکم دیا جاتا کہ اپنے چہرے کو چھپا کر رکھو اور ایسی صورت میں مردوں کو نظر نیچی رکھنے کا حکم نہیں دیا جاتا۔

(۴) اللہ تعالیٰ حضور ﷺ سے فرماتا ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ (الاحزاب:۵۲)

''اس کے بعد تمہارے لیے عورتوں سے شادی کرنا حلال نہیں ہے اور نہ یہ حلال ہے کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آؤ خواہ ان عورتوں کا حسن تمہیں کتنا ہی بھلا کیوں نہ لگے''۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر چہرہ کھلا نہ ہو تو کسی کو کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں عورت خوبصورت ہے یا بدصورت۔ کیونکہ چہرے ہی سے عورت کی خوب صورتی یا بدصورتی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس آیت سے واضح ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں عورتیں چہرہ کھلا رکھتی تھیں اور عین ممکن تھا کہ اپنے حسن کی وجہ سے کوئی عورت حضور ﷺ کو پسند آجائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اب مزید شادی سے حضور ﷺ کو منع کر دیا۔

(۵) دلائل اور حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں عورتیں پردہ کرتی تھیں لیکن نقاب کا استعمال نہیں کرتی تھیں اور چہرہ کھلا رکھتی تھیں۔ مثال کے طور پر چند دلیلیں پیش کر رہا ہوں۔

مسلم شریف کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ کی نظر کسی عورت پر پڑی۔ آپ ﷺ کو وہ عورت اچھی لگی۔ آپ ﷺ اپنی بیوی زینب رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور ان سے اپنی جنسی خواہش پوری کی اور فرمایا:

اِنَّ الْمَرْأَةَ تقبل فِیْ صُوْرَةِ شَیْطَانٍ وَ تدبر فِیْ صُوْرَةِ شَیْطَانٍ فَاِذَا رَاٰی اَحَدُکُمْ اِمْرَاَةً فَاَعْجَبَتْهُ فَلْیَاْتِ اَهْلَهٗ فَاِنَّ ذَاكَ یَرُدُّ مَا فِیْ نَفْسِهٖ (مسلم)

''عورت شیطان کی صورت میں آتی اور جاتی ہے (اسے دیکھ کر آدمی بہکنے کی پوزیشن میں ہو جاتا ہے) پس اگر تم میں سے کوئی کسی عورت کو دیکھے اور

وہ اسے اچھی لگے تو اسے چاہیے کہ اپنی بیوی کے پاس چلا جائے۔ کیونکہ یہ چیز اس کے دل میں جو خواہش ہے اسے ختم کر دے گی''۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جس عورت پر حضور ﷺ کی نظر پڑی تھی اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور اسی وجہ سے وہ حضور ﷺ کو اچھی لگی۔ حضور ﷺ چونکہ انسان تھے اور بشری تقاضے کے تحت ان کے دل میں بھی جنسی خواہشیں پیدا ہوتی تھیں لیکن ایسے موقع پر کوئی غلط قدم اٹھانے کے بجائے حضور ﷺ اپنی بیوی کے پاس چلے آئے اور ان سے اپنی ضرورت پوری کی۔ اور یہی تعلیم آپ نے اپنی اُمت کو بھی دی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جس طرح آپ نے اپنی اُمت کو غلط حرکت کی بجائے اپنی بیوی کے پاس جانے کا حکم دیا ہے' اسی طرح عورتوں کو بھی چہرہ ڈھک کر رکھنے کا حکم دے سکتے تھے۔ لیکن حضور ﷺ نے کبھی کوئی ایسا حکم نہیں دیا۔

اسی طرح ایک حدیث بخاری اور مسلم کی ہے جس کی روایت حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ کرتے ہیں کہ ایک عورت حضور ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ خود کو آپ کے حوالہ کر دوں (آپ سے شادی کر لوں) آپ ﷺ نے عورت کی طرف نظر اٹھائی اور دیر تک اسے دیکھتے رہے' پھر نظر گھمالی۔ عورت نے سمجھ لیا کہ حضور ﷺ کو اس میں اور اس کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ بیٹھی رہی۔ حضور ﷺ کے پاس کچھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی تشریف فرما تھے۔ ایک صحابی نے حضور ﷺ سے کہا کہ اگر آپ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو میری شادی کرا دیجئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ مسلم عورت حضور ﷺ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے پاس آ کر بیٹھی اور اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ جبھی تو آپ ﷺ اس کی طرف دیر تک دیکھتے رہے۔ اس کا چہرہ کھلا ہونے کی وجہ سے کسی اور صحابی کو وہ عورت پسند آ گئی اور انہوں نے شادی کی درخواست کر ڈالی۔

سنن نسائی کی ایک حدیث ہے جس کی روایت حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر قبیلہ خثعم کی ایک عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ سوال کرنے آئی۔ ابنِ عباسؓ کے بھائی فضل ابنِ عباس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ وہ اس عورت کی طرف بار بار مڑکر دیکھنے لگے کیونکہ وہ خوبصورت تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فضل ابنِ عباسؓ کا چہرہ دوسری طرف کر دیتے تھے۔

اگر چہرہ چھپانا ضروری ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس عورت کو بھرے مجمع میں چہرہ کھلا رکھنے پر یقیناً تنبیہ کرتے اور خاص کر ایسی حالت میں کہ لوگ اس کے حسن کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ سنن ترمذی میں یہی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے مذکور ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی گردن دوسری طرف موڑ دی۔ ان کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ نے فضل رضی اللہ عنہ کی گردن دوسری طرف کیوں گھمائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ میں نے ایک نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکی کو اس حالت میں دیکھا کہ شیطان انہیں بہکانے میں مصروف تھا۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر چہرہ کھلا رکھنا جائز نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس عورت کو اس کے کھلے چہرے پر ضرور تنبیہ کرتے۔ خاص کر ایسی حالت میں کہ شیطان ان دونوں کو بہکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو چہرہ ڈھکنے کی بجائے صرف فضل ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اپنا رخ دوسری طرف کرلیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کام کی وجہ سے عورت سے بات کرنا ضروری ہو اور شیطان کے بہکانے کا خوف نہ ہو تو اس کی طرف دیکھنا بھی جائز ہے۔

ایسی ہی ایک حدیث بخاری شریف میں ہے جس کی روایت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کرتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید کی نماز کے لیے گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے خطبے سے قبل نماز پڑھائی۔ پھر عورتوں کی طرف تشریف لے گئے اور انہیں نصیحتیں کیں اور فرمایا کہ عورتو! تم صدقہ دیا کرو کیونکہ تم میں اکثریت جہنم کی ایندھن ہے۔ جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی یہ بات سن کر ایک معزز عورت کھڑی ہوئی اور اس کے دونوں گال سرخی مائل کالے ہو رہے تھے۔ اس نے دریافت کیا کہ اے رسول اللہ! ہم میں اکثریت جہنم کی ایندھن کیوں بنے گی؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ''اس لیے کہ تم بہت زیادہ شکایتیں کرتی ہو اور اپنے شوہر کی نافرمانی کرتی ہو۔ چنانچہ عورتوں نے صدقہ کرنا شروع کیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنا کپڑا پھیلائے ہوئے تھے' عورتیں اپنے کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں اُتار اُتار کر اس میں رکھنے لگیں''۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ جبھی تو حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو سکا کہ اس عورت کے دونوں گال سرخی مائل کالے تھے۔

بخاری اور مسلم کی ایک حدیث ہے جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ہم عورتیں چادر اوڑھ کر فجر کی نماز حضور ﷺ کے ساتھ مسجدِ نبوی میں باجماعت ادا کرتیں۔ پھر نماز سے فراغت کے بعد اپنے گھروں کو واپس آ جاتیں۔ تاریکی کی وجہ سے ہمیں کوئی پہچان نہیں پاتا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تاریکی نہ ہوتی تو انہیں پہچان لیا جاتا اور معلوم ہو جاتا کہ کون کون سی عورتیں ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی عورت کو اسی وقت پہچانا جا سکتا ہے جب کہ اس کا چہرہ کھلا ہوا ہو۔

یہ تمام حدیثیں ثابت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں عورتیں اپنا چہرہ کھلا رکھتی تھیں اور حضور ﷺ نے کبھی انہیں چہرہ چھپانے کا حکم نہیں دیا اور نہ چہرہ کھلا رکھنے پر کبھی ان کی سرزنش کی۔

(۶) صرف یہی نہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں چہرے پر نقاب لگانے کا رواج نہیں تھا بلکہ چہرے پر نقاب لگانے والیوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ

ابوداؤد کی روایت ہے، جس کے راوی حضرت قیس بن شماس رضی اللہ عنہ ہیں کہ ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ وہ اپنے مقتول بیٹے کے بارے میں دریافت کرنے آئی تھی۔ ایک صحابی نے حیرت سے کہا کہ تم چہرے پر نقاب لگا کر اپنے بیٹے کے بارے میں دریافت کرنے آئی ہو؟ اس عورت نے جواب دیا کہ میں نے اپنا بیٹا ضرور کھویا ہے، لیکن اپنی شرم نہیں کھوئی ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث ''کتاب الجہاد'' میں بیان کی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کے نقاب لگانے پر تعجب تھا، کیونکہ یہ چیز معاشرے کے رواج سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس تعجب کے اظہار پر عورت نے یہ نہیں جواب دیا کہ تم لوگ تعجب کیوں کرتے ہو، میں نے تو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق یہ نقاب لگایا ہے، بلکہ اس نے یہ جواب دیا کہ شرم وحیا کی وجہ سے اس نے چہرہ پر نقاب ڈال لیا ہے۔ اگر نقاب لگانا اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہوتا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کبھی اس کے نقاب لگانے پر نہ تو تعجب کرتے اور نہ اس عورت سے ایسا سوال کرتے۔

(۷) اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے وقت عورت کی اپنی شخصیت جانی پہچانی رہے۔ خرید وفروخت اور دوسرے لین دین کے معاملات میں یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ ہو رہا ہو، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ عورت کون ہے۔ اسی لیے تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ عدالت میں گواہی کے موقع پر عورت کا چہرہ کھلا رہنا ضروری ہے، تا کہ لوگ جان سکیں کہ گواہی دینے والی عورت کون ہے؟

ان لوگوں کے دلائل جو چہرہ پر نقاب ڈالنے کو لازمی قرار دیتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ تلاشِ بسیار کے باوجود چہرے پر نقاب ڈالنے کو لازمی قرار دینے کے لیے مجھے قرآن وحدیث سے کوئی ایسی دلیل نہ مل سکی جو صریح اور دوٹوک کہی جا سکے اور یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ان علماء کی تعداد نہایت کم ہے جو چہرے پر نقاب کو لازمی

قرار دیتے ہیں۔ یہ علماء اپنی رائے کے حق میں جو دلیلیں پیش کرتے ہیں' ان کا بیان حسبِ ذیل ہے:

(۱) يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ط ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ط

(الاحزاب'۵۹)

''اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے' تا کہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں''۔

اس آیت میں ''جلابیب'' کی تشریح کرتے ہوئے یہ علماء فرماتے ہیں کہ 'جلباب' اسے کہتے ہیں جس سے پورا بدن حتیٰ کہ ہاتھ اور چہرہ بھی ڈھک جائے اور صرف آنکھ کھلی ہو۔

لیکن جلابیب کی یہ تشریح خود ان کی اپنی تشریح ہے۔ قرآن وسنّت میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ چہرے پر نقاب ڈالنا ضروری ہے۔

(۲) سورۂ نور کی آیت وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا میں اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کی تفسیر کرتے ہوئے یہ علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عورت کا اوپری کپڑا ہے۔ عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں۔ سوائے اس کے جو خود بہ خود ظاہر ہو جاتا ہے یعنی ان کا اوپری لباس' کیوں کہ اسے چھپانا ممکن نہیں ہے۔

لیکن ان کی یہ تفسیر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی ہے کیونکہ سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا اضافہ کر کے اللہ تعالیٰ نے پردے کے حکم میں کچھ تخفیف اور آسانی عطا کرنی چاہی ہے۔ اب اگر اس سے مراد عورت کا اوپری کپڑا مراد لیا جائے تو اس میں عورتوں کے لیے کوئی آسانی نہ ہوئی اور یہ بات اللہ کے منشا کیخلاف ہے۔ اور میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور علماءِ کرام کی اکثریت اِلَّا

مَاظَهَرَ مِنْهَا سے چہرہ اور ہاتھ مراد لیتی ہے۔

(۳) سورۂ احزاب کی آیت وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (اور جب ان سے کوئی شے مانگو تو پردے کی اوٹ سے مانگو) کی تفسیر کرتے ہوئے یہ علماء فرماتے ہیں کہ پردے کی اوٹ میں رہ کر مانگنے کا مقصد اور منشا یہ ہے کہ عورت کا مکمل جسم حتیٰ کہ چہرہ اور ہاتھ بھی نہ نظر آئے۔

یہ دلیل اس لیے مناسب نہیں ہے کہ یہ حکم حضور ﷺ کی بیویوں کے لیے خاص تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس پورے سیاق وسباق کی ابتدا یوں کی ہے۔ یٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (اے نبی کی بیویو! تم کسی عام عورت کی طرح نہیں ہو) تمہارا رتبہ اور مقام عام عورتوں کی طرح نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاص مقام کی وجہ سے ان کے لیے کچھ خاص احکام تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنا زیادہ وقت گھر پر گزاریں۔ انہیں حضور ﷺ کی وفات کے بعد دوسری شادی کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں مسلمانوں کی ماؤں کا درجہ عطا کیا گیا۔ ان ہی خاص احکام میں سے ایک خاص حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ حضور ﷺ کی بیویوں سے کچھ مانگو تو پردے کی اوٹ میں رہ کر مانگو۔

(۴) بخاری شریف کی حدیث ہے لَاتَنْتَقِبُ الْمَرْاَةُ الْمُحْرِمَةُ وَلَاتَلْبَسُ الْقُفَّازَيْنِ ''احرام کی حالت میں عورت نہ نقاب لگائے گی اور نہ دستانے پہنے گی''۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اس زمانے میں عورتیں چہرہ پر نقاب اور ہاتھوں میں دستانے استعمال کرتی تھیں۔ اور احرام کی حالت میں ان کے استعمال سے روک دیا گیا۔

لیکن اس حدیث کو بطورِ دلیل پیش کرنا مناسب نہیں ہے' کیونکہ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ اس زمانے میں عورتیں چہرے پر نقاب اور ہاتھوں میں دستانے پہنتی تھیں پھر بھی اس حدیث میں حضور ﷺ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے کہ عورتوں کے لیے ان دونوں کا استعمال ضروری اور لازمی ہے۔

(۵) ترمذی کی حدیث ہے اَلْمَرْأَةُ كُلُّهَا عَوْرَةٌ ''عورت مکمل ستر ہے''۔

اس حدیث سے یہ علماء یہ مفہوم اخذ کرتے ہیں کہ چوں کہ عورت کا مکمل جسم ستر میں داخل ہے اس لیے چہرہ اور ہاتھ سمیت مکمل جسم کو ڈھکنا لازمی ہے۔ حالانکہ حدیث کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ اس حدیث کا یہ منشا نہیں ہے کہ عورت کا مکمل جسم ستر ہے اس لیے اسے مکمل طور پر چھپانا ضروری ہے' بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کا جسم اپنی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے سرتاپا کشش ہوتا ہے۔ اس حدیث میں عورت کے پورے جسم کو ''عورت'' کہا گیا ہے۔ عورت (ستر) کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اسے چھپانا ضروری ہے ورنہ اِحرام کی حالت میں عورتوں کو چہرہ کھلا رکھنے کا حکم نہیں دیا جاتا کیونکہ جو چیز ستر ہوتی ہے اسے کسی بھی حالت میں کھولنا جائز نہیں ہے۔

(۶) چہرے پر نقاب ڈالنے کو لازمی قرار دینے کے لیے یہ علماء حضرات جس بات کو کثرت کے ساتھ بہ طورِ دلیل پیش کرتے ہیں وہ یہ کہ عورت کا سارا حسن اور ساری کشش اس کے چہرے میں ہوتی ہے۔ چہرہ کھلا رہے تو باعثِ فتنہ ہوتا ہے۔ اس فتنہ کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ چہرہ ڈھکا رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس فتنہ کے وہم اور خوف کی وجہ سے سخت گیر قسم کے علماء نے معاشرے میں بہت ساری ایسی چیزوں کو ناجائز قرار دیا ہے' جو اصلاً جائز اور حلال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حد درجہ رحمت کی بنا پر ان چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اور ان کا حلال ہونا قرآن وحدیث سے ثابت بھی ہے' لیکن بعض فتنہ پھیلنے کے خوف سے اور احتیاط کے نام پر بعض علماءِ کرام نے ان حلال چیزوں پر پابندی لگا دی ہے۔ مثال کے طور پر علماء نے فتنے کے خوف سے عورتوں کو مسجد میں جا کر نماز باجماعت ادا کرنے سے منع کر دیا حالانکہ حضور ﷺ کا حکم ہے کہ لَاتَمْنَعُوا اِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ (اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے نہ روکو) اس کے باوجود ان علماء نے محض خیالی فتنہ کے ڈر سے انہیں مسجد جانے سے روک دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری عورتیں نماز سے دور ہونے

لگیں۔ ان ہی علماء نے فتنہ کے خوف سے عورتوں کو سکول اور کالج جانے اور تعلیم حاصل کرنے سے منع کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری عورتیں جاہل اور ناکارہ ہو گئیں۔ اب ان علماء کو ہوش آیا ہے تو انہوں نے عورتوں کو سکول اور کالج جانے کی اجازت دے دی۔ اگر پہلے ہی عورتوں پر تعلیم کا دروازہ نہ بند کر دیا گیا ہوتا تو اتنی کثرت سے ہماری عورتیں جاہل اور غیر مفید نہ رہتیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فتنے کی روک تھام ضروری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فتنے کی روک تھام کی وجہ سے جائز باتیں ناجائز کر دی جائیں۔ فتنے کی روک تھام کے لیے اللہ کے وہ احکام اور اسلامی آداب کافی ہیں جن کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے۔ اپنی طرف سے مزید اور نئی بندشیں لگانا اللہ کی مرضی و منشا کے خلاف بھی ہے اور ہمارے معاشرے کے لیے مہلک اور نقصان دہ بھی۔

یہ ہیں وہ دلائل جنہیں نقاب کو لازمی قرار دینے والے علماء پیش کرتے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی بھی دلیل اتنی مضبوط اور اتنی واضح نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر نقاب کو واجب قرار دیا جا سکے۔ فقہ کا اصول ہے کہ کسی چیز کو واجب قرار دینے کے لیے قرآن و سنّت کی واضح اور صریح دلیل ضروری ہے۔ ان کے مقابلہ میں ان علماء کے دلائل زیادہ مضبوط اور واضح ہیں جو نقاب کو لازمی نہیں قرار دیتے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اس لیے میرا اپنا موقف بھی وہی ہے جو جمہور علماء کا ہے۔ وہ یہ کہ چہرے پر نقاب ڈالنا ضروری اور واجب نہیں ہے۔ اپنے اس موقف کی تائید میں، میں مزید دلائل پیش کرتا ہوں۔

(۱) کسی امر کو اس وقت تک واجب العمل نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک اس کے حق میں قرآن یا حدیث کی واضح اور صریح دلیل نہ ہو۔ محض شک کی بنیاد پر یا اندیشے اور احتیاط کے نام پر کسی شے کو نہ تو واجب قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی حلال چیز کو حرام قرار دیا جا سکتا ہے۔ فقہ کا اصول ہے کہ واجب صرف وہی چیزیں ہیں جنہیں اللہ اور اس کے

رسول ﷺ نے واجب کیا ہے اور حرام وہی چیزیں ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف کسی چیز کو واجب یا حرام قرار دینے میں عجلت اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ قرآن وسنت سے ثابت ہونے کے بعد ہی واجب یا حرام قرار دیتے تھے۔

اسلامی فقہ کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اصلاً تمام چیزیں حلال ہیں سوائے ان چیزوں کے جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی چیز کے حلال ہونے کے لیے دلیل پیش کرنا ضروری نہیں ہے' کیونکہ اصلاً یہ چیز حلال ہے۔ بلکہ اس کے لیے دلیل پیش کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک چہرے پر نقاب لگانے کا مسئلہ ہے' اس سلسلے میں قرآن وسنت میں کوئی ایسی واضح دلیل نہیں ہے جو اسے واجب قرار دے۔ محض احتیاط اور اندیشے کی وجہ سے اسے واجب قرار دینا یا کسی حلال چیز کو ناجائز قرار دینا اللہ کی منشا اور اصولِ فقہ دونوں کے خلاف ہے۔ لوگوں نے جب جائز اور حلال کھانوں کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا تو اللہ نے ان کی اس طرح سرزنش کی تھی:

قُلْ آللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ○ (یونس:۵۹)

''کہو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے یا تم اللہ پر بہتان تراشی کررہے ہو''۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عورتوں کی شخصیت اور ان کے امیج (Image) کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کریں۔ معاشرے میں انہیں ان کا جائز مقام دلائیں اور انکے تعلیمی اور معاشرتی معیار کو بلند کریں۔ تاکہ ایک طرف عورتیں ہمارے معاشرے کے لیے مفید اور کارآمد بن سکیں اور دوسری طرف دشمنانِ اسلام کو اسلام پر کیچڑ اچھالنے کا موقع نہ مل سکے۔

(۲) پرانے زمانے کے مقابلے میں آج کے ترقی یافتہ دور میں روزمرہ کی بنیادی ضرورتیں بہت زیادہ بڑھ چکی ہیں اور ہماری عورتیں بھی اس بات پر مجبور ہیں کہ گھروں

سے نکل کر اپنی ضروریات کی تکمیل کریں۔ ایسی حالت میں انہیں نقاب کا پابند کر کے مزید مشقتوں اور زحمتوں میں مبتلا کرنا مناسب نہیں ہے اور یہ بات اللہ کی منشا کے بھی خلاف ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دین میں زحمت و مشقت نہیں رکھی ہے' بلکہ حتی الامکان ہمارے لیے آسانیاں رکھی ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج ۷۸)

''اور اس دین میں تمہارے لیے کوئی مشقت نہیں رکھی ہے''۔

دوسری جگہ اللہ فرماتا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے۔ تنگی اور پریشانی نہیں چاہتا ہے''۔

اور حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

بُعِثْتُ بِحَنِيْفِيَّةٍ سَمْحَةٍ (مسند احمد)

''میں ایسے دین کے ساتھ بھیجا گیا ہوں جو عقیدہ میں پاک اور خالص ہے اور معاملات میں نرم ہے''۔

جو لوگ چہرہ پر نقاب کے سختی سے قائل ہیں اور وقتاً فوقتاً ان پردہ دار خواتین پر تنقید کرتے رہتے ہیں' جو چہرے پر نقاب نہیں لگاتی ہیں ان سے میری گزارش ہے کہ وہ ان خواتین پر تنقید کی بجائے ایسی مسلم عورتوں کی اصلاح کی جانب دھیان دیں' جو سرے سے پردہ ہی نہیں کرتی ہیں اور نت نئے فیشن کر کے بے حجابانہ گھروں سے باہر وقت گزارتی ہیں۔

آخر میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں:

(۱) چہرہ اور ہاتھ پیر کھلا رکھنا جائز ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چہرے پر مختلف قسم کے میک اپ کر کے اور ہاتھ پیر کے ناخنوں کو نیل پالش سے مزین کر کے غیر محرم مردوں کے سامنے جانے کی بھی اجازت ہے۔ اجازت صرف اس

بات کی ہے کہ غیر محرموں کے سامنے چہرہ اور ہاتھ کھلا رکھا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر بہت ہلکی سی زیبائش کر لی جائے مثلاً آنکھوں میں سرمہ لگا لیا جائے یا ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھی پہن لی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ غرض کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتیں گھر سے باہر نکلتے وقت شرعی لباس میں رہیں' شریفانہ انداز اپنائیں اور الٹے سیدھے میک اپ اور فیشن کے ذریعے غیروں کو لبھانے والا انداز نہ اختیار کریں۔

(۲) میں اگر یہ کہتا ہوں کہ چہرے پر نقاب لگانا ضروری نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو عورتیں چہرہ پر نقاب لگانا چاہتی ہیں' انہیں میں نقاب لگانے سے منع کر رہا ہوں۔ وہ اگر نقاب لگانا چاہتی ہیں تو شوق سے لگائیں۔ انہیں اس کا پورا حق حاصل ہے۔

(۳) چہرے پر نقاب لگانا ضروری نہیں ہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مردوں کو اس بات کی اجازت مل گئی کہ وہ عورتوں کے چہروں کو تکا کریں۔ کیونکہ بہر حال مردوں کو اس بات کا حکم ہے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں' اپنی نگاہیں عورتوں پر نہ ڈالیں۔ البتہ عورتوں سے معاملات کے دوران کسی ضرورت کے تحت انہیں دیکھنا ضروری ہو تو ان پر نظر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ یہ نظر شہوت اور ہوس بھری نہ ہو۔

مہر کی حکمت و غایت

سوال: مغربی تہذیب اور مغربی افکار و نظریات سے متاثر بعض خواتین نے مہر کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مہر لینا عورتوں کی سراسر بے عزتی اور ذلت ہے۔ کیونکہ ان کے دعوے کے مطابق مہر گویا عورت کی عزت اور اس کے جسم کی قیمت اور معاوضہ ہے' جو مرد عورت کو ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ طوائف کا جسم قیمت کے بدلے خریدا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام مہر کو اس زاویے سے نہیں دیکھتا ہے اور اسے عورتوں

کا حق قرار دیتا ہے‘ لیکن یہ خواتین اپنے موقف پر مصر ہیں۔ گزارش ہے کہ مہر کی حکمت اور غرض و غایت واضح کریں۔

جواب: بلاشبہ جہالت اور کم علمی ایک بڑا مرض ہے اور اس سے بھی بڑا مرض یہ ہے کہ جاہل اپنے آپ کو عالم تصوّر کرے۔ ہمارے معاشرے میں کچھ ایسے نام نہاد روشن خیال لوگ پائے جاتے ہیں‘ جنہوں نے دُنیوی علوم تو حاصل کر رکھے ہیں‘ لیکن قرآن و سنّت اور شریعت کے سلسلے میں ان کا علم صفر ہے۔ اس کے باوجود دینی معاملات و مسائل میں وہ اپنی جاہلانہ رائے دینے سے گریز نہیں کرتے۔ حد تو یہ ہے کہ قرآن و سنّت کا علم نہ ہونے کے باوجود اپنی رائے کو برحق اور قرآن و سنّت کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو فقط نام کے مسلمان ہیں اور ان کے کام غیر مسلموں جیسے ہیں۔ چونکہ اسلام اور اسلامی احکام میں انہیں کوئی خاص دلچسپی اور رغبت نہیں ہے اس لیے غیر مسلموں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے یہ لوگ بہت سارے شرعی احکام کو بدل دینا چاہتے ہیں‘ بلکہ سرے سے ان کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ یہ لوگ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب کی چکا چوند کی وجہ سے اگر انہیں قرآن و سنّت کے بعض احکام درست نہیں معلوم ہوتے تو انہیں چاہیے کہ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قرآن و سنّت سے اپنی برأت کا اعلان کر دیں اور لوگوں کو بتا دیں کہ اسلام سے انکا کوئی واسطہ نہیں ہے‘ تا کہ مسلم قوم ان کے تئیں دھوکے میں نہ رہے۔

مہر کی حیثیت قرآن و سنّت سے ثابت ہے اور اس پر تمام اُمت کا مکمل اتفاق ہے۔ مہر ایک ایسی حقیقت ہے‘ جسے سب جانتے اور قبول کرتے ہیں۔ البتہ اس کی حکمت و مصلحت سے بعض لوگ ناواقف ہیں‘ اس لیے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) مہر عورت کے لیے باعث ذلت نہیں‘ بلکہ اس کے برعکس باعث عزت و شرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں پر فرض کیا ہے کہ نکاح کے وقت عورتوں کو مہر ادا کریں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت ایک پسندیدہ چیز ہے‘ جسے پانے کے لیے مرد کوشاں اور

سرگرداں رہتا ہے اور اپنی اس پسندیدہ چیز کو حاصل کرنے کے لیے اپنی دولت اور پیسے خرچ کرتا ہے۔ یہ تو عورت کے لیے بہت عزت کی بات ہے کہ وہ مرد کی مرغوب و پسندیدہ چیز ہے۔ عورت کے لیے ذلت کی بات یہ ہے کہ مرد کو حاصل کرنے کے لیے پیسے خرچ کرے۔ بعض ملکوں مثلاً ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں مرد نہیں' بلکہ عورت اپنے شوہر کو حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتی ہے۔ جہیز کے نام پر مرد منہ مانگی قیمت وصول کرتا ہے۔ عورت مرد کو حاصل کرنے کے لیے پیسے خرچ کرے یہ چیز اس کے لیے باعث رسوائی و ذلت ہے۔

(۲) مہر کی ادائی محض اظہارِ الفت و محبت کے لیے ہوتی ہے۔ یہ عورت کے جسم کی قیمت اور معاوضہ نہیں ہے۔ اس کی حیثیت تحفہ (Gift) کی ہے جو مرد اپنی خوشی سے اپنی جانِ عزیز کو عطا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ فرماتا ہے:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء:۴)

''اور عورتوں کو ان کے مہر بطورِ عطیہ عطا کرو''۔

اس آیت میں مہر کو عطیہ اور تحفہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) مہر فرض کر کے ہمیں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ شادی بیاہ کوئی کھیل نہیں' بلکہ ایک سنجیدہ عمل ہے۔ انسان اپنے روزمرہ کے کاموں میں بہت ساری کارروائیوں کے لیے فیس ادا کرتا ہے۔ تاکہ اسے ان کارروائیوں کی اہمیت کا احساس رہے۔ اسی طرح شادی بیاہ ایک اہم اور سنجیدہ کارروائی ہے' جس میں فیس کی ادائی لازمی ہے' تاکہ اس کی اہمیت کا پاس ولحاظ رہے۔

(۴) چونکہ فیملی کی سطح پر اللہ تعالیٰ نے شوہر کو گھر کا نگہبان اور ذمہ دار مقرر کیا ہے اور بیوی پر اسے ایک درجہ فضیلت عطا کی ہے' اس لیے مرد کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ گھر کے نان ونفقہ کا ذمے دار بھی وہی ہو اور اپنی دولت کا ایک حصہ مہر کے طور پر اپنی بیوی کو عطا کرے' کیونکہ اس شادی کی وجہ سے بیوی پر اسے فضیلت عطا کی گئی ہے۔

مہر کی ان حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ ساتھ مہر سے متعلق چند باتوں کا ذہن نشین کرنا بھی ضروری ہے:

۱- مہر کی ادائی فرض ہے' لیکن اسلام نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ مہر کی رقم میں مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا جائے اور اسے کم سے کم رکھا جائے تاکہ مردوں کے لیے یہ چیز باعث مشقت نہ بن جائے۔ حضور ﷺ کا ارشاد اَكْثَرُهُنَّ بَرَكَةً اَقَلُّهُنَّ صَدَاقًا (عورتوں میں سب سے بابرکت وہ ہیں جن کا مہر سب سے کم ہے) سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

خود نبی اکرم ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کو محض چند درہم مہر ادا کیے۔ اپنی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے موقع پر جو قلیل مہر مقرر کیا تھا وہ محض ایک زرہ پر مشتمل تھا۔ بلکہ نبی ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی شادیوں کے موقع پر یہ مہر مقرر کیا کہ وہ اپنی بیویوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔

(۲) مغرب زدہ لوگوں کی یہ سوچ غلط ہے کہ مہر عورت کے جسم اور جنسی لذت کا معاوضہ ہے' کیونکہ شادی کے بعد صرف شوہر اپنی بیوی سے جنسی لذت نہیں اٹھاتا ہے' بلکہ بیوی بھی اپنے شوہر کے جسم سے جنسی لذت اٹھاتی ہے۔ شادی کے بعد دونوں ہی ایک دوسرے سے جنسی لذت اٹھاتے ہیں' لیکن مہر صرف مرد ادا کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہر جنسی لذت کا معاوضہ نہیں ہے۔

(۳) یہ سوچنا غلط ہے کہ شادی کا مقصد صرف جنسی لذت کا حصول ہے۔ جنسی لذت کا حصول شادی کے بہت سارے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔ اس لیے مہر کو اس نظر سے دیکھنا کہ یہ چیز جنسی لذت کا معاوضہ ہے' ایک غلط سوچ ہے۔ شادی کا مقصد جہاں جنسی لذت کا حصول ہے وہیں اس کے دوسرے مقاصد بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ○

(الروم:۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور اس نے تمہارے درمیان محبت و رحمت کا جذبہ پیدا کیا۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں''۔

البتہ اسلام جنسی لذت کے حصول کو ایک گندا اور گھناؤنا عمل نہیں قرار دیتا ہے۔ بلکہ اسلام کی نظر میں حلال طریقہ سے جنسی لذت حاصل کرنا بھی ایک کارِ ثواب ہے جیسا کہ بعض حدیثوں میں حضور ﷺ نے اس کی وضاحت کی ہے۔

محبت اور شادی

سوال: مجھے ایک ایسے لڑکے سے محبت ہوگئی ہے' جو دین دار و با اخلاق ہے اور اس کے اندر ہر وہ خوبی ہے جس کی ایک لڑکی تمنا کر سکتی ہے۔ ہم محبت میں اتنی دور چلے گئے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہماری محبت بالکل پاک ہے اور پچھلے چھ سالوں میں ہم نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی' جو قابلِ گرفت ہو اور جس پر ہمیں ندامت ہو۔ ہمیں اس کا انتظار تھا کہ لڑکا برسرِ روزگار ہو تو ہماری شادی ہو سکے کہ اچانک ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ لڑکے کے برسرِ روزگار ہوتے ہی اس کے گھر والوں نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کر دیا کہ ان کا خاندان میرے خاندان کے مقابلے میں کم حیثیت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ میں اس کے بغیر زندگی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔ کسی اور کے ساتھ شادی کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ کیا اس طرح سے میرا کسی کی محبت میں گرفتار ہو جانا' اسلام کی نظر میں گناہ ہے؟ اور کیا اسلامی شریعت میں ہماری مشکل کا کوئی حل ہے؟

جواب: میں بار ہا کہہ چکا ہوں کہ میں دورِ حاضر کے اس چلن سے بالکل متفق نہیں ہوں کہ پہلے محبت کی جائے پھر شادی کی جائے۔ یہ وہ راستہ ہے جس کی ابتدا بھی نامناسب ہوتی ہے اور جس کا انجام بھی اکثر و بیشتر غیر اطمینان بخش ہوتا ہے۔ مثلاً وہ محبت جو ٹیلیفون پر گفت و شنید سے شروع ہوتی ہے' یا وہ محبت جو جوانی کے جوش میں لڑکیوں کے پیچھے چکر لگانے سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ایسی محبت ہوتی ہے جس میں عقل اور سوجھ بوجھ کا عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ محض جذباتیت ہوتی ہے۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ ایسے لڑکے لڑکیوں میں محبت ہو جاتی ہے جن کے درمیان سماجی تفاوت ہوتا ہے یا خاندانی چپقلش ہوتی ہے یا کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو ان کی شادی کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس محبت کی ابتدا جذباتیت سے ہوتی ہے' اس لیے یہ لڑکے اور لڑکیاں غلطیاں اور گناہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس لیے کہ بہرحال وہ انسان ہیں' فرشتے نہیں ہیں۔

میری نظر میں شادی کا افضل اور مناسب ترین طریقہ یہ ہے کہ طرفین خوب سوچ سمجھ کر' ایک دوسرے کے بارے میں مکمل واقفیت حاصل کر کے شادی کا فیصلہ کریں۔ شادی کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کا اطمینان کر لیا جائے کہ فی الحال ایسی کوئی بات تو نہیں ہے جو آگے چل کر اس شادی کو ناکام یا شادی شدہ زندگی کو جہنم بنا دے۔ مثلاً طرفین کے درمیان کفو یعنی برابری نہ ہو یا کسی قسم کی قانونی رکاوٹ ہو وغیرہ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ طرفین ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ ایسے موقع پر مناسب یہ ہوگا کہ لڑکا اس طرح سے لڑکی کو دیکھے کہ لڑکی کو اس کی خبر نہ ہو' تاکہ رشتہ طے نہ ہونے کی صورت میں لڑکی کے جذبات مجروح نہ ہوں اور مناسب یہ ہے کہ لڑکے والے یہ رشتہ لے کر لڑکی کے گھر والوں کے پاس جائیں اور نہایت اطمینان اور تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے اس معاملے کو طے کریں۔

اگر کوئی ایسی صورتِ حال ہوتی ہے جس کا تذکرہ سوال میں ہے' طرفین کے درمیان خود بہ خود محبت ہو جاتی ہے اور یہ دونوں شادی کے لیے مناسب وقت کا انتظار

کرتے ہیں اور انتظار کی اس مدت میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتے ہیں تو ایسی صورتِ حال میں گھر والوں کو چاہیے کہ اس معاملہ کو سنجیدگی سے لیں اور دو پیار کرنے والوں کو محض چھوٹے چھوٹے اسباب کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا نہ کریں اور ان کی شادی کریں۔ جیسا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لَمْ يُرَ لِلْمُتَحَابَيْنِ مِثْلُ النِّكَاحِ (ابنِ ماجہ)

"دو محبت کرنے والوں کے لیے شادی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے"۔

ذرا اس حدیث کے پس منظر پر غور کیجیے۔ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پاس ایک یتیم بچی ہے جس سے شادی کے خواہشمند دو شخص ہیں۔ ان میں سے ایک غریب ہے اور دوسرا امیر۔ لیکن یہ یتیم بچی غریب شخص سے محبت کرتی ہے اور اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس بات پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ دو پیار کرنے والوں کے لیے شادی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ دو پیار کرنے والوں کے درمیان غریبی اور امیری کو نہ آنے دیا جائے اور ان کی مرضی کے مطابق ان کی شادی کر دی جائے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام ایک عملی (Practical) دین ہے۔ کسی سے محبت ہو جانا ایک فطری بات ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ کوئی گناہ نہیں ہے نہ اسلام اس فطری جذبہ کی روک تھام چاہتا ہے۔ بلکہ اسلام اس بات پر ابھارتا ہے کہ اس فطری جذبہ کو شرعی اور قانونی حیثیت عطا کر دی جائے۔ ان دونوں کو گناہوں میں ملوث نہ ہونے دیا جائے بلکہ ان کی شادی کر دی جائے۔ بشرطیکہ اس شادی میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والدین جھوٹی شان کی وجہ سے یا حسب نسب کے چکر میں پڑ کر یا محبت کو غیر اسلامی عمل سمجھ کر دو محبت کرنیوالوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خود بھی مصیبت میں پڑتے ہیں اور اپنے بچوں کی زندگیاں بھی تباہ کر ڈالتے ہیں۔ بعض بچے ذرا تیز قسم کے ہوتے ہیں تو وہ والدین سے بغاوت کر کے اپنی الگ دنیا بسا لیتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ جھوٹی شان اور حسب و نسب کو معیار

بنانے کی بجائے دین دار اور با اخلاق ہونے کو معیار بنایا جائے۔ دین اور اخلاق کے معیار پر اترنے والے رشتہ کو ٹھکرانا یقیناً بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

اِذَا اَتَاکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ خُلُقَهٗ وَ دِیْنَهٗ فَزَوِّجُوْهُ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَکُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ (ترمذی، ابنِ ماجہ)

"جب تمہارے پاس ایسا رشتہ آئے جس کے اخلاق اور دینداری سے تم مطمئن ہو تو اسے شادی کے لیے منتخب کرلو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں زبردست فتنہ وفساد پھیل جائے گا"۔

بیوی کو ڈانٹنا اور زدوکوب کرنا

سوال: کسی عورت کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے شوہر کی بدسلوکیوں کا شکار ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بعض شوہر ایسے ہیں جو اپنی بیویوں کو ڈانٹتے، گالم گلوچ کرتے اور بعض تو اپنے بچوں کے سامنے بیویوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔ اس موقع پر عورت جس رسوائی اور بے بسی کا احساس کرتی ہے کوئی دوسرا اسے محسوس نہیں کرسکتا۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر جو فضیلت عطا کی ہے تو کیا اس فضیلت کی بنیاد پر انہیں یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو ڈانٹیں ماریں اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کریں؟ براہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جس قدر عزت واحترام عطا کیا ہے اور جتنا عدل وانصاف کیا ہے کسی دوسرے مذہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اسلام نے عورت کو تمام حیثیتوں میں اسکے مکمل حقوق عطا کیے ہیں۔ خواہ اس کے یہ حقوق ماں کی حیثیت سے ہوں، بیوی کی حیثیت سے ہوں، بہن کی حیثیت سے ہوں، بیٹی کی حیثیت سے ہوں یا ایک انسان کی حیثیت سے ہوں۔ اسلام نے ان تمام جاہلی رسم و

رواج کو یکلخت کالعدم قرار دیا جن کی بنیاد پر عورتوں پر ظلم ہوتا تھا۔

قرآن مجید میں مرد و عورت کے تعلقات کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے نہایت بلیغ تعبیر استعمال کی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرة:۱۸۷)

''وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے وہ سب کچھ ہیں جو لباس کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ مثلاً پردہ پوشی' ذریعۂ زینت و زیبائش' سردی و گرمی سے حفاظت اور باعثِ عزت و وقار' اللہ کے فرمان کے مطابق مرد و عورت دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لباس کا کام دینا چاہئے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مرد و عورت میں سے ہر ایک دوسرے کا فطری طور پر محتاج ہے۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ یہی اللہ کا بنایا ہوا قانونِ فطرت ہے۔ انسانوں کے لیے بھی اور تمام کائنات کی مخلوقات کے لیے بھی۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ (الذاریات:۴۹)

''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو''۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کی تخلیق کی تو جنت میں انہیں اکیلا و تنہا نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان کے سکون و آرام کے لیے اور ان کی تنہائیوں کو دُور کرنے کے لیے ایک عورت یعنی حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا کیا۔ اس بات سے اسلام کا یہ موقف واضح ہو جاتا ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے ''فریق مخالف'' کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ دونوں مل جل کر ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسی مفہوم میں اللہ کا یہ فرمان ہے: بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ (تم ایک دوسرے کا حصہ ہو) تم دونوں کے درمیان

تعاون اور اتحاد کا جذبہ ہونا چاہئے نہ کہ نفرت، دشمنی اور ایک دوسرے کی مخالفت کا۔

اسلام کی ان بنیادی تعلیمات پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیویوں کے ساتھ ناروا سلوک کرنا۔ انہیں ڈانٹنا، مارنا اور گالم گلوچ کرنا، اسلام کی تعلیمات کیخلاف ہے۔ اسلام تو ایسا مذہب ہے جو جانوروں کو گالی دینے سے بھی منع کرتا ہے۔ کجا کہ انسانوں کو گالی دی جائے اور وہ بھی اپنی شریکِ حیات کو۔ حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے اپنی اونٹنی کو گالی دی اور اسے لعن طعن کیا۔ نبی ﷺ نے اس عورت کو سخت تنبیہ کی اور اس غلطی کی پاداش میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو حکم دیا کہ اس عورت کی اونٹنی لے لو اور اسے آزاد چھوڑ دو، تاکہ کوئی اسے استعمال نہ کرے۔ غور کریں کہ نبی ﷺ نے ایک جانور کو گالی دینے اور لعن طعن کرنے سے سخت منع فرمایا ہے تو اپنی شریکِ حیات کو لعن طعن کرنا، گالی دینا اور اس سے بھی بڑھ کر اسے مارنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ یہ باتیں سراسر قرآن و سنّت کی تعلیمات کیخلاف ہیں۔ قرآن نے صرف ایک صورت میں عورت کو مارنے کی اجازت دی ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر سے بغاوت پر اتر آئے۔ ایسی صورت میں بھی پہلی ہی شکایت میں مارنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ حکم ہے کہ پہلے بیوی کو نصیحت کی جائے۔ نصیحت سے نہ مانے تو حکم ہے کہ اس کا بستر الگ کر دیا جائے اور اس پر بھی نہ مانے تو اسے مارنے اور اس پر سختی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ (النساء: ۳۴)

''وہ بیویاں جن کی بغاوت کا تمہیں اندیشہ ہو تو تم انہیں نصیحت کرو اور بستر سے انہیں الگ کر دو اور انہیں مارو۔ پس اگر وہ مان جائیں تو پھر انہیں ستانے کا کوئی بہانہ نہ تلاش کرو''۔

اس آیت کے آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ اطاعت گزار اور فرماں بردار بیوی کو ستانے اور پریشان کرنے

کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جائیں۔ جو حضرات خواہ مخواہ اپنی نیک بیویوں پر گرجتے برستے رہتے ہیں اور انہیں تنگ کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ہزار بار غور کریں۔

مذکورہ صورتِ حال میں مارنے کی اجازت کے باوجود حضور ﷺ نے فرمایا کہ وَلَنْ يَّضْرِبَ خِيَارُكُمْ (شرفاء اپنی بیویوں کو نہیں مارتے ہیں) شرفاء اپنی بیویوں کو مارنے کے بجائے پیار محبت اور نرمی سے سمجھاتے ہیں اور اس کی بہترین مثال حضور ﷺ کی حیات طیبہ ہے۔ آپ ﷺ اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ (ترمذی)

''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہے۔ اور میں اپنی بیویوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں''۔

حضور ﷺ کی سیرت کا علم رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی عورت بلکہ کسی بھی انسان یا جانور پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کسی عالی مرتبہ اور وسیع الظرف انسان کو زیب نہیں دیتا کہ اپنے ماتحت رہنے والوں کو مارے پیٹے اور ان کے ساتھ برا سلوک کرے۔ کسی مرد کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے کہ رات میں اپنی بیوی سے جنسی لذت حاصل کرے اور دن میں اسے مار پیٹ اور گالم گلوچ کے ذریعے اذیت پہنچائے۔ یہ کام تو کوئی رذیل اور بد اخلاق شخص ہی کر سکتا ہے۔ جبھی تو آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ شرفاء اپنی بیویوں کو نہیں مارتے ہیں۔ گویا اپنی بیوی کو مارنے والے لوگ رذیل ہوتے ہیں۔ البتہ اگر کبھی انتہائی غصے کی حالت میں یا غلطی سے کسی مرد نے اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھا دیا یا گالم گلوچ کیا تو اسے چاہیے کہ اپنی بیوی کو منانے اور خوش کرنے کی کوشش کرے۔

یہ وہ اسلامی تعلیمات ہیں جن پر عمل کر کے گھر کے ماحول کو پُرسکون اور خوشگوار بنایا جا سکتا ہے اور ان پر عمل نہ کیا جائے تو شوہر اور بیوی کے ساتھ ساتھ بچوں کا مستقبل بھی تباہ ہو جاتا ہے۔

شوہر اور بیوی کو طلاق کے اختیارات

سوال: مغربی افکار سے متاثر بعض افراد یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے صرف مردوں کو طلاق کا حق دے کر عورتوں کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق مرد جب چاہے اور جیسے چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے اور بے چاری بیوی کے لیے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہوتی ہے کہ معاشرے میں مطلقہ ہو کر زندگی گزارے۔ جبکہ بیوی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے شوہر کو طلاق دے سکے' خواہ شوہر کی طرف سے وہ کتنی ہی اذیت میں مبتلا ہو۔ وہ تو محض طلاق کی درخواست کر سکتی ہے۔ اب شوہر کی مرضی ہے کہ اس درخواست کو قبول کرے یا رد کر دے۔ اسلام نے طلاق کے معاملے میں ان دونوں کو برابر اختیارات کیوں نہیں بخشے ہیں؟

جواب: اسی طرح کی غلط بیانی اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر کے بعض لوگ اسلامی شریعت کی بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔ اسلامی شریعت پر اعتراض کرنے سے پہلے انہیں چاہئے تھا کہ اسلامی شریعت سے خاطر خواہ واقفیت حاصل کریں۔ اگر انہیں اس کی واقفیت نہیں ہے تو انہیں چاہئے کہ قرآن وسنت کا مطالعہ کریں تا کہ اسلامی شریعت کا صحیح صحیح علم ہو سکے۔ مصیبت یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ قرآن وحدیث کا مطالعہ کم کرتے ہیں اور سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے یا کسی مسلمان کے غلط رویے کو دیکھ کر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہی اسلامی شریعت ہے اور پھر اسلامی شریعت پر الٹے سیدھے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔

اس اعتراض سے پہلے انہیں چاہئے تھا کہ شادی اور طلاق سے متعلق قرآن و حدیث کے احکام کا مطالعہ کر لیتے اور جان لیتے کہ اس سلسلے میں اسلام کا کیا موقف ہے۔

اسلام کی نظر میں شادی ایک مضبوط اور مستحکم بندھن ہے اور اس بندھن کی بنیاد

باہمی الفت و محبت پر ہونی چاہئے تاکہ ایک دوسرے کے تعاون سے پُرسکون زندگی گزاریں۔

یہ وہ مضبوط رشتہ ہے جو دو خاندانوں کی مستقل دوڑ بھاگ، گفت و شنید، شادی کی تقریبات، مہر کی ادائی اور نہ جانے کن کن مرحلوں کے بعد وجود میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر مضبوط رشتے کو توڑ دینا کوئی قابلِ تعریف بات ہے اور نہ کوئی آسان بات کہ جب جی چاہا اسے ختم کر دیا۔ نہ تو شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر اس رشتہ کو ختم کر دے اور نہ بیوی ہی کو اس کا حق دیا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ اسلامی شریعت نے طلاق کے معاملے میں مردوں کو پوری آزادی عطا کر رکھی ہے کہ جب چاہے اور جیسے چاہے طلاق کا وار کر دے، بالکل غلط بات ہے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جسے اسلامی شریعت کا علم نہیں ہے۔

اسلامی شریعت نے مرد کو طلاق کا حق ضرور دیا ہے، لیکن اس کے استعمال کی پوری آزادی نہیں دی ہے۔ اس حق کو استعمال کرنے سے پہلے چند شرائط کا پورا کرنا لازمی ہے۔ مثلاً:

(۱) طلاق دینے سے پہلے اس رشتہ کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جائے۔ جب تمام تدبیریں ناکام ہو جائیں اور تمام راستے بند ہو جائیں تب طلاق کے بارے میں سوچا جائے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے شوہر کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ ناپسندیدگی کے باوجود آدمی اپنی بیوی کو طلاق نہ دے، بلکہ اس پر راضی بہ رضا رہنے کی کوشش کرے۔ اللہ فرماتا ہے:

فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ (النساء:۱۹)

"اگر تم انہیں ناپسند کرو تو عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس

میں تمہارے لیے بہت بھلائی رکھ دے"۔

آنحضور ﷺ نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ بیوی کی بُرائیوں پر نہیں اس کی اچھائیوں پر نظر رہے۔ لایفرك مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ سَخِطَ مِنهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنهَا آخَرَ "مومن مرد کو اپنی مومن بیوی سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی بیوی کی کوئی بات ناگوار گزرتی ہو تو اس کے اندر دوسری عادتیں ہیں جو اسے اچھی لگتی ہوں"۔

(۳) طلاق دینے کے لیے طلاق کا مصمم ارادہ کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے نہایت غصے کی حالت میں دی ہوئی طلاق یا کسی کے دباؤ میں آکر دی گئی طلاق، طلاق شمار نہیں ہوگی۔ کیونکہ ایسی حالت میں طلاق کا با مقصد ارادہ نہیں ہوتا ہے۔

(۴) مصمم ارادے کے باوجود طلاق صرف اسی حالت میں جائز ہے جب عورت حیض کی حالت میں نہ ہو بلکہ ایسی پاکی کی حالت میں ہو جس میں ان دونوں کے درمیان جنسی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں۔

(۵) طلاق کی اجازت صرف شدید ضرورت کے وقت دی گئی ہے، جسے ہم مجبوری کی حالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ اَلطَّلَاقُ (اللہ کی نظر میں حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے) ایک دوسری جگہ فرمایا: لَاتُطَلِّقُوا النِّسَاءَ مِنْ غَيْرِ رِيْبَةٍ (بلاوجہ عورتوں کو طلاق نہ دو) اسی لیے اسلامی شریعت کی نظر میں بغیر کسی سبب کے دی ہوئی طلاق مکروہ اور حرام ہے۔ کیونکہ بلاوجہ بسے بسائے گھر کو اجاڑ دینا اتنا ہی بڑا گناہ ہے جیسے مال و دولت کو بلاوجہ برباد کرنا۔

ان تمام شرطوں کو پورا کرنے کے بعد ہی اسلام نے مرد کو اجازت دی ہے کہ وہ طلاق دے سکتا ہے۔ طلاق دینے کے بعد اسلام نے مرد کو اس بات کا پابند بنا دیا ہے کہ اگر اُس نے مہر کی رقم ادا نہیں کی ہے تو فوراً اس کی ادائی کرے، عدت کی مدت میں اپنی مطلقہ بیوی کا سارا خرچ برداشت کرے اور اگر بچے ہیں تو اس وقت تک ان کی مالی

کفالت کرے جب تک وہ بڑے نہ ہو جائیں۔ بعض علماءِ کرام مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے نزدیک یہ بھی واجب ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو طلاق کے عوض کچھ مال و دولت عطا کرے، کیونکہ اللہ کا فرمان ہے:

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَي الْمُتَّقِيْنَ ۝ (البقرۃ:۲۴۱)

''اور اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر''۔

مومن مردوں پر واجب ہے کہ اپنی مطلقہ بیویوں کو کچھ مال و دولت عطا کریں اور اس مال و دولت کی مقدار شوہر کی مالی حیثیت کے مطابق مقرر کی جائے گی۔ کیونکہ اللہ کا فرمان ہے:

عَلَي الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَي الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ (البقرۃ:۲۳۶)

''مالدار پر اس کی مالداری کے مطابق فرض ہے اور تنگ دست پر اس کی تنگ دستی کے مطابق''۔

اس تفصیل اور توضیح کے بعد یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ اسلام نے طلاق کے سلسلے میں عورتوں کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور مردوں کو مکمل آزادی دی ہے کہ وہ جب اور جیسے چاہیں اس حق کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اسلام نے مردوں کو طلاق کی اجازت صرف ناگزیر حالات میں دی ہے۔ اگر مردوں کو طلاق کے حق سے بالکل محروم کر دیا جاتا تو یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوتی، کیونکہ شادی شدہ زندگی میں بسا اوقات ایسے لمحے آتے ہیں جب بیوی سے نباہ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور زندگی عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو اس بات کا حق دیا ہے کہ اپنی زندگی کو تباہ و برباد کرنے سے بچا لیں اور خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام نے یہ حق صرف مردوں کو عطا کیا ہو اور عورتوں کو اس حق سے محروم کر دیا ہو؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ ذرا غور کریں کہ جس شریعت نے عورتوں کو اس بات کا

مکمل حق دیا ہے کہ ان کی شادی ان کی مرضی کے بغیر نہ ہو۔ وہ شریعت عورتوں کو اس بات پر کیسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارتی چلی جائیں، جسے وہ سخت ناپسند کرتی ہوں اور جس کے ساتھ نباہ کرنا ناممکن ہو گیا ہو۔ بلاشبہ جس شریعت نے عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق شادی کرنے کا پورا حق دیا ہے اسی نے انہیں اس بات کا بھی پورا حق دیا ہے کہ اپنی غیر مطمئن شادی شدہ زندگی سے اپنی مرضی کے مطابق نکل سکیں۔ اس حق کو شریعت کی اصطلاح میں خُلع کہتے ہیں۔ البتہ جس طرح شریعت نے مردوں کو طلاق کا حق صرف ناگزیر حالات میں عطا کیا ہے اور مردوں کو حکم دیا ہے کہ طلاق دینے سے قبل خوب غور کر لیں، جلد بازی میں فیصلہ نہ کریں، اسی طرح عورتوں کو بھی صرف ناگزیر حالات میں خُلع کی اجازت ہے اور انہیں بھی حکم ہے کہ خُلع کے مطالبہ سے قبل اس پر خوب غور کر لیں اور جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ ابوداؤد کی روایت ہے:

ایما امراۃ سالت زوجھا الطلاق من غیر ماباس بہ فحرام علیھا رائحۃ الجنۃ (ابوداؤد) ''جو عورت اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ بغیر کسی شدید حاجت کے کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے''۔

خُلع کا طریقہ یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اور مہر کی رقم واپس کرنے کے لیے تیار ہو۔ اگر شوہر طلاق دینے پر رضامندی نہ ظاہر کرے تو عورت اپنا معاملہ، اپنے اور اپنے شوہر کے گھر والوں کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ سب مل کر شوہر کو طلاق دینے پر راضی کریں۔ اگر شوہر پھر بھی تیار نہ ہو تو عورت اپنا معاملہ عدالت میں پیش کرے تاکہ عدالت ان کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ کر دے، جسے قانون کی زبان میں ''فسخ'' کہتے ہیں۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ مجھے اپنے شوہر کے دین واخلاق سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ البتہ مجھے اپنا شوہر ہی ناپسند ہے اور میں علیحدگی چاہتی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

دریافت کیا کہ کیا تم مہر میں لیا ہوا باغ واپس لوٹانے کو راضی ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ بالکل راضی ہوں۔ انہوں نے باغ واپس کر دیا اور نبی ﷺ نے دونوں کے درمیان علیحدگی کرادی۔

عورت کو اس سے زیادہ انصاف اور کیا چاہئے کہ مرد طلاق دیتا ہے تو اسے مہر کی رقم واپس نہیں ملتی ہے' بلکہ مزید کچھ روپے پیسے عورت کو دیتا ہے۔ لیکن عورت جب خُلع کا مطالبہ کرتی ہے تو اسے اپنی جیب سے کچھ نہیں دینا ہوتا ہے' بلکہ مرد سے وصول کی ہوئی مہر کی رقم مرد کو واپس کرنی ہوتی ہے۔ وہ حضرات جو طلاق کے معاملے میں اسلامی شریعت پر اعتراض کرتے ہیں' انہیں چاہئے کہ اس مسئلے پر انصاف کے ساتھ غور کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک کو کوئی نام نہاد حق دلانے کے چکر میں دوسرے کی حق تلفی ہو رہی ہو۔ عام طور پر یہ لوگ عورتوں کے لیے کچھ زیادہ ہی نرم گوشہ رکھتے ہیں اور عورتوں کو حق دلانے کے معاملے میں اتنے جوشیلے ہو جاتے ہیں کہ انہیں احساس ہی نہیں ہوتا ہے کہ اس طرح وہ مردوں کے ساتھ حق تلفی کر رہے ہیں۔ اسلام کا قانون ایسا نہیں ہے کہ ایک کے ساتھ انصاف ہو اور دوسرے کے ساتھ ظلم۔ اگر انہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ طلاق کے معاملے میں مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ اختیارات دیے گئے ہیں تو انہیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں پر کچھ زیادہ ذمّے داریاں بھی رکھی گئی ہیں۔ مردوں پر نان ونفقہ کی ذمّے داری ہے' مہر کی ذمّے داری ہے۔ بیوی اور بچوں کی کفالت کی ذمّے داری ہے۔ اور طلاق کی صورت میں مزید رقم ادا کرنے کی ذمّے داری ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہوگا کہ مردوں پر ذمّے داریاں تو زیادہ ہوں لیکن اختیارات کم ہوں۔ اور عورتوں پر ذمّے داریاں تو کم ہوں لیکن اختیارات زیادہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا قانون بالکل حق اور انصاف پر مبنی ہے' لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ کھلے ذہن کے ساتھ اس معاملہ پر غور وخوض کیا جائے۔

عورت اور سیاست

سوال: کیا اسلام نے عورتوں کو تمام سیاسی حقوق مثلاً الیکشن لڑنے' ووٹ ڈالنے' پارلیمنٹ' اسمبلی یا کونسل کی ممبر بننے اور اس طرح کی دوسری سیاسی سرگرمیوں سے محروم کر دیا ہے۔ کیا اسلام کی نظر میں عورتوں کے لیے اس طرح کی سیاسی سرگرمیاں ناجائز ہیں؟ یا مردوں کی طرح انہیں بھی یہ حقوق حاصل ہیں؟ ویسے عام طور پر ہمارے معاشرے میں یہ ذہن بنا ہوا ہے کہ اس طرح کی سیاسی سرگرمیاں عورتوں کے لیے بالکل حرام ہیں۔ ہمیں اپنے سوال کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب چاہیے۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ اس سلسلے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کیا حکم ہے؟

جواب: حرام وحلال اور جائز وناجائز کے سلسلے میں اسلامی شریعت کی دو اصولی باتیں ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئیں:

(۱) پہلی بات یہ کہ اصولی طور پر دنیا کی ہر چیز حلال ہے سوائے اس کے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہو۔ کسی حلال چیز کو حلال ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصولی طور پر تمام چیزیں حلال ہیں۔ البتہ کسی چیز کو حرام ثابت کرنے کے لیے قرآن وحدیث کی واضح اور صریح دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث کی واضح اور صریح دلیل کے بغیر کسی بھی چیز کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حرام وہی چیز ہے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہو اور اس کی صراحت قرآن وحدیث میں موجود ہو۔ کسی بندے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی سمجھ اور دانش کے مطابق کسی چیز کو حرام قرار دے۔

اسلامی شریعت کے ان اصولوں کی روشنی میں آپ کے سوال کے سلسلے میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کیا قرآن وحدیث میں کوئی ایسی واضح اور صریح دلیل موجود ہے' جو عورتوں

کو سیاسی حقوق اور سرگرمیوں سے محروم کر دے۔ آپ پورے قرآن کو خوب سمجھ کر پڑھ جایئے اور تمام صحیح حدیثوں کا تفصیلی مطالعہ کر جایئے' مجھے یقین کامل ہے کہ قرآن و حدیث میں آپ کو ایک بھی ایسی دلیل نہیں ملے گی جس کی بنیاد پر عورتوں کو ان کے سیاسی حقوق سے محروم کیا جا سکے۔ بلکہ اس کے برعکس آپ اگر قرآن و حدیث کی عمومی تعلیمات پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عورتوں کو ان کے سیاسی حقوق سے محروم کر دینا نہ صرف یہ کہ اسلامی تعلیمات کیخلاف ہے' بلکہ مسلم معاشرے پر اس کے بُرے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

اگر آپ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مردوں کو فرائض و واجبات ادا کرنے کا مکلف بنایا ہے' اسی طرح عورتیں بھی فرائض و واجبات ادا کرنے کی مکلّف ہیں۔ اس معاملے میں دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ مردوں کی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے کہ پانچ وقت کی نماز ادا کریں' روزہ رکھیں' اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کریں' حرام چیزوں سے اجتناب کریں' حلال رزق کھائیں' بھلائیوں کا حکم دیں اور بُرائیوں سے روکیں وغیرہ وغیرہ۔ ان فرائض و واجبات میں مرد اور عورت برابر برابر کے شریک ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمایا ہے: بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (تم دونوں ایک دوسرے کا حصہ اور شریک ہو) اور حضور ﷺ نے فرمایا ہے: اِنَّمَا النِّسَآءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ (عورتیں مردوں کی شریک ہیں) اور قرآن نے جہاں جہاں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اے لوگو! اے ایمان والو) کہہ کر مخاطب کیا ہے' وہاں مردوں کی طرح عورتیں بھی مخاطب ہیں۔ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

قرآن نے مردوں اور عورتوں کو بیک وقت یہ حکم دیا ہے کہ دونوں مل جل کر معاشرے کی اصلاح کریں۔ بُرائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور نیکیوں کو عام کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ

(التوبۃ:۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار اور رفیق ہیں۔ یہ سب مل کر بھلائی کا حکم دیتے ہیں' بُرائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر اللہ یقیناً رحم فرمائے گا''۔

اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافق مرد اور منافق عورتوں کی صفت بیان کی ہے کہ منافق مرد منافق عورتیں بھی مل جل کر معاشرے میں فساد اور برائیاں پھیلانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے مومن عورتوں کو بھی چاہئے کہ مومن مردوں کے ساتھ مل کر معاشرے میں اصلاح اور بھلائی کے کام میں لگ جائیں۔ تاریخی حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد کی عورتوں نے بھی اپنی ان ذمے داریوں کو بخوبی انجام دیا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ حضور ﷺ کی حمایت اور موافقت میں سب سے پہلی آواز جو بلند ہوئی تھی وہ ان کی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی آواز تھی۔ اسلام کی سربلندی کی راہ میں سب سے پہلی شہید ہونیوالی خاتون حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ متعدد صحابیات نے جنگوں اور غزوات میں شرکت کی اور وقت پڑنے پر تلوار بھی اٹھائی اور جنگ میں مشرکین و کفار کو قتل کیا۔ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں جو ہجرت ہوتی تھی اس میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔

آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ بعض ایسے فرائض ہیں جو صرف عورتوں کے لیے خاص ہیں اور بعض ایسے ہیں جو صرف مردوں کے لیے خاص ہیں۔ لیکن عورتوں کے

ساتھ صرف وہی فرائض خاص ہیں جنہیں اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے صرف عورتیں ہی انجام دے سکتی ہیں مثلاً حیض ونفاس یا حمل اور ولادت سے متعلق فرائض واحکام اور مردوں کے ساتھ صرف وہی فرائض خاص ہیں، جنہیں اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے صرف مرد ہی انجام دے سکتے ہیں۔ مثلاً نان ونفقہ کی ذمہ داری وغیرہ۔ جو فرائض عورتوں کے ساتھ خاص ہیں اور وہ فرائض جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں ان سب کی تفصیل قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ اب کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اور اپنی سمجھ کے مطابق عورتوں یا مردوں کے لیے کسی فرض کو خاص کر دے۔ چونکہ سیاسی حقوق سے متعلق فرائض واحکام قرآن وحدیث میں صرف مردوں کے ساتھ خاص نہیں کیے گئے ہیں، اس لیے ہمارے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ ہم ان سیاسی حقوق کو مردوں کے ساتھ خاص کر کے عورتوں کو ان سے محروم کر دیں اور ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ کسی چیز کو حرام قرار دینے کے لیے قرآن وحدیث میں کوئی بھی صریح اور واضح دلیل نہیں ہے۔ البتہ چند ضعیف احادیث ہیں، لیکن ان کی بنیاد پر ایک حلال چیز کو حرام نہیں کیا جا سکتا۔ خاص کر ایسے معاملے میں جس کا تعلق پورے معاشرے کے نفع ونقصان سے ہو۔ یہ بڑے ستم کی بات ہوگی کہ کسی ضعیف حدیث پر عمل کر کے پورے مسلم معاشرے کو نقصان پہنچایا جائے۔ ضعیف حدیث کے علاوہ چند قرآنی آیات اور صحیح حدیثیں ہیں، لیکن ان کی تفسیر اور تشریح میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لیے مختلف فیہ تفسیر کے ذریعہ کسی شے کو حرام قرار دینا کسی صورت مناسب بات نہیں ہے۔

کسی چیز کو حرام وحلال قرار دینے کے لیے قرآن وحدیث کی واضح اور صریح دلیل کے علاوہ ایک اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہے زمانے کے حالات اور ماحول کی رعایت۔ چنانچہ فقہاءِ کرام اس بات پر متفق ہیں کہ زمانے کے بدلنے، حالات کے مختلف ہونے اور ماحول کے بدلنے سے فتوے بھی بدل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کا زمانہ آج کی اکیسویں صدی سے بالکل مختلف تھا۔ دونوں زمانوں کے

حالات مختلف ہیں۔ اسی طرح ایک مسلم ملک کا جو ماحول ہوتا ہے کسی کافر ملک کے ماحول سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ حالات کی ان تبدیلیوں سے فتوے بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس بات پر خود حضور ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بھی عمل رہا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے نبوت کے آغاز میں ماحول اور ضروریات کے لحاظ سے ایک حکم دیا اور جب ہجرت کے بعد اسلام طاقتور ہو گیا تو آپ ﷺ نے پہلے حکم سے بالکل مختلف حکم صادر فرمایا۔ یہی رویہ صحابۂ کرام کا بھی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اسلامی شریعت اسی وجہ سے سب سے عمدہ اور بہترین شریعت ہے کہ اس میں اس بات کی گنجائش ہے کہ زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے احکام تبدیل ہو سکیں۔

ایک اور بات ذہن میں رکھنی چاہئے۔ وہ یہ کہ دورِ حاضر کے سیکولر حضرات عورتوں کے مسائل میں خصوصی دلچسپی اور جوش و ولولہ دکھانے لگے ہیں۔ انہیں ذرا بھی عورتوں کی حق تلفی کا علم ہوتا ہے تو اپنے سارے ہتھیار لے کر میدان میں کود پڑتے ہیں اور حق تلفی کرنے والوں کے خلاف برسر پیکار ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض مسلم برادریوں نے اپنی عورتوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں اور حق تلفیاں کی ہیں۔ انہیں مختلف فتنوں کے ڈر سے تعلیم میں پیچھے رکھا۔ انہیں گھر کے اندر قید کر دیا اور ان پر بے جا پابندیاں عائد کر دیں۔ جب یہ سیکولر حضرات ان مسلم عورتوں کی یہ زبوں حالی اور پسماندگی دیکھتے ہیں تو انہیں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف زہر اگلنے کا بڑا اچھا موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اسلام عورتوں کا دشمن ہے۔

اس لیے میں اپنی اُمت کے عالموں اور دانشوروں سے گزارش کروں گا کہ وہ اس معاملہ کو سنجیدگی سے لیں۔ جو غلطیاں پہلے ہو چکی ہیں ان کی تلافی کریں۔ کئی ایسے میدان ہیں جن کے بارے میں قرآن و حدیث کا صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی عورتوں کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں ایک سیاست کا میدان بھی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس سلسلے میں قرآن و سنّت کا صحیح حکم معلوم کریں تاکہ دوبارہ ایسی غلطی نہ ہو۔

جس سے ہماری اُمت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے اور ہم سوائے پچھتانے کے اور کچھ نہ کر سکیں۔

آپ یقین کریں کہ قرآن اور صحیح حدیثوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو عورتوں کو سیاسی حقوق استعمال کرنے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکتی ہو۔ آج کا جو سیاسی سسٹم ہے اس میں عورتیں ووٹ دینے کا حق استعمال کر سکتی ہیں، پارلیمنٹ، اسمبلی اور شوریٰ کی ممبر بن سکتی ہیں[۱] اور حکومت کو سیاسی مشورے دے سکتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ عام طور پر مسلمانوں کا ذہن میری اس رائے کو قبول نہیں کرے گا کیونکہ عورت کا سیاست میں حصہ لینا، ان کے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کسی بھی معاملے کو حرام اور گناہ قرار دینے کے لیے قرآن و حدیث کی واضح اور صریح دلیل ضروری ہے۔ محض اس وجہ سے کوئی چیز حرام کی جا سکتی کہ ہمارا ذہن اسے قبول نہیں کر رہا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ ہمارے علماء عورتوں کو سیاسی حقوق سے محروم کرنے کے لیے کون سے دلائل پیش کرتے ہیں اور کیا واقعی یہ دلائل قابلِ قبول ہیں؟

(۱) ان کی پہلی دلیل قرآن کا یہ حکم ہے وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (اور اپنے گھروں ہی میں رہا کرو) اس آیت کی روشنی میں عورتوں کا بلاوجہ گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورتوں کو سیاسی حقوق سے محروم کرنے کے لیے یہ دلیل ناقابلِ قبول ہے اس لیے کہ:

(الف) سیاق و سباق سے واضح ہے کہ اس حکم کی مخاطب عام عورتیں نہیں، بلکہ صرف حضور ﷺ کی بیویاں ہیں۔ اسی سیاق و سباق کی ابتدا میں اللہ ان سے فرماتا ہے

---

[۱] اس سلسلے میں ایران کی پارلیمنٹ ایک روشن مثال ہے، جہاں عورتیں پردے میں رہتے ہوئے اور مکمل اسلامی آداب کا لحاظ کرتے ہوئے پارلیمنٹ کی ممبر بنی ہوئی ہیں۔ اور ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنے حصہ کا کردار ادا کر رہی ہیں۔

کہ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (اے نبی کی بیویو! تم کسی عام عورت کی طرح نہیں ہو) اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی بیویوں کو جو رتبہ ومنزلت حاصل ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ان کا رہن سہن عام عورتوں کی طرح نہ ہو۔ اسی بنا پر انہیں حکم دیا گیا کہ ان کا زیادہ وقت گھروں میں گزرے۔

(ب) اس حکم کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنگِ جمل کے موقع پر گھر سے باہر بلکہ مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئیں اور انہوں نے پوری فوج کی قیادت کی۔ معلوم ہوا کہ دینی واجبات کی ادائی کی خاطر گھر سے باہر نکلنا بھی ایک دینی فریضہ ہے۔

(ج) اس حکم کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے اندر مقید رہتی ہیں۔ علماء نے انہیں مختلف ضروریات کی تکمیل کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے اور عورتیں ان ضروریات کی تکمیل کے لیے نکلتی ہیں۔ پھر آخر سیاسی واجبات کی ادائی کے لیے انہیں گھر سے نکلنے سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے۔

(د) گھر کے اندر ہی رہنا اور گھر سے باہر قدم نہ نکالنا تو ایک سزا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زنا کار عورت کے لیے تجویز کیا تھا۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے سورۂ نساء کے حوالے سے عرض کر چکے ہیں۔ اگر ہم نے تمام عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت سے محروم کر دیا تو گویا ہم انہیں زنا کار عورت کی سزا دے رہے ہیں۔

(ہ) صورتِ حال یہ ہے کہ سیاسی میدان سے دیندار قسم کی عورتیں غائب ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ وہ عورتیں اس میدان میں ہیں جنہیں اسلام اور مسلمانوں کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کی دنیادار عورتیں پارلیمنٹ میں جا کر اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتیں بلکہ اس کے برعکس وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیا اب بھی ہمیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ پارلیمنٹ میں ہماری دین دار اور پرہیزگار قسم کی عورتیں بھی ہونی چاہئیں تاکہ وہ ایک طرف مسلم عورتوں کے مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کر سکیں اور دوسری

طرف پوری مسلم اُمت کے مفاد میں کام کرسکیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک مسلم عورت اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لیے گھر سے باہر نکل سکتی ہے' بازار جا سکتی ہے اور سفر کر سکتی ہے تو پوری مسلم قوم کے مفاد کے لیے گھر سے باہر کیوں نہیں نکل سکتی؟

(۲) بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں میں مسلم عورتوں کی شرکت کی وجہ سے مختلف فتنے جنم لے سکتے ہیں۔ مثلاً بے پردگی' مردوں سے اختلاط اور کبھی مردوں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا وغیرہ۔ چونکہ یہ چیزیں حرام ہیں' اس لیے سیاسی سرگرمیاں بھی حرام ہیں۔

یہ دلیل بھی کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ یہ تو محض اندیشے اور حد درجہ احتیاط والی بات ہوئی اور تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ اندیشوں اور حد درجہ احتیاط کے چکر میں پڑ کر مسلم اُمت نے اپنا بڑا نقصان کیا ہے۔ اس طرح کے اندیشے فتنوں کو دبانے کے بجائے انہیں ابھارتے ہیں۔

اگر ہم اپنی عورتوں کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دیں گے تو مسلمانوں کا بہت سارا قیمتی ووٹ ضائع ہو جائے گا' جو اگر استعمال ہوتا تو شاید پارلیمنٹ میں کوئی اچھا مسلمان منتخب ہو کر جاتا اور مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا۔ اسی طرح اگر ہم اپنی عورتوں کو الیکشن لڑنے اور پارلیمنٹ کی ممبر بننے سے روک دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں وہ عورتیں جائیں گی جنہیں دین اور مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور وہ عورتوں کے لیے ایسے قوانین نافذ کرنے کی کوشش کریں گی' جو اسلام کے خلاف ہیں۔ کیا آپ یہ ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ پارلیمنٹ میں ہمارے مرد اور ہماری عورتیں جائیں تاکہ وہ ہمارے مفاد کے لیے کام کرسکیں۔

جہاں تک فتنوں' بے پردگی اور مردوں کے ساتھ اختلاط کی بات ہے تو میں بھی ان کے حق میں نہیں ہوں لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ پردے میں رہ کر اور دوسرے اسلامی آداب کا خیال رکھتے ہوئے ہماری عورتیں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ خصوصاً وہ

عورتیں جو پختہ عمر کو پہنچ چکی ہیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے فارغ ہو چکی ہیں اور پڑھی لکھی ہونے کے باوجود گھروں میں خالی بیٹھ کر اپنا قیمتی وقت برباد کر رہی ہیں۔ یہ عورتیں اگر مسلمانوں کے مفاد کے لیے سیاست کے میدان میں آتی ہیں تو اس سے ایک طرف یہ فائدہ ہوگا کہ ہماری عورتوں کے مسائل اسلامی قوانین کی روشنی میں حل کیے جا سکیں گے اور دوسری طرف یہ فائدہ ہوگا کہ اس طرح ہماری عورتوں کا امیج (Image) بہتر ہوگا جو کہ فی الحال کافی خراب ہے۔

(۳) ان کی تیسری دلیل بخاری شریف کی یہ حدیث ہے: لَنْ یَّفْلَحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَاَۃً ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے عورت کو اپنا حکمراں بنایا''۔

اس حدیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ عورت کو حکمراں بنانے والی قوم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے عورتوں کو کسی قسم کا سیاسی منصب عطا کرنا جائز نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر ''قوامیت'' عطا کی ہے نہ کہ عورتوں کو مردوں پر۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ ط (النسآء:۳۴)

''مرد نگہبان ہیں عورتوں پر اس لیے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور اس لیے کہ یہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں (یعنی نان و نفقہ کی ذمے داری مردوں پر ہے)''۔

عورتوں کو کسی قسم کا سیاسی منصب عطا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں مردوں پر قوامیت عطا ہوگئی اور یہ بات اللہ کے منشا کےخلاف ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ عورتوں کو سیاسی حقوق سے محروم کرنے کے لیے مذکورہ حدیث اور مذکورہ آیت کو بطور دلیل پیش کرنا سراسر غلط ہے' کیونکہ ان دونوں میں عورتوں کو سیاسی حقوق سے محروم کرنے کی کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کی جس قوامیت کا تذکرہ کیا ہے وہ محض خانگی زندگی تک محدود ہے۔ مرد صرف اپنی فیملی اور گھر کے حدود میں نگہبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک عورت گھر کی نگہبان نہیں ہوسکتی اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی کہ مرد ہی پر نان ونفقہ کی ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نان ونفقہ کی ذمّے داری والی بات صرف گھر ہی تک محدود ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کی جس قوامیت کا اللہ نے ذکر کیا ہے' وہ صرف گھر تک محدود ہے۔ مرد اپنے گھر کے حدود میں قوام ہوتا ہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرد اپنی قوامیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی من مانی کرتا پھرے۔ کیونکہ قرآن کی دوسری آیتوں اور حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے ثابت ہے کہ اس قوامیت کے باوجود شوہر کو گھریلو معاملات میں اپنی بیوی سے مشورے کی تائید کی گئی ہے اس لیے اس آیت سے یہ ثابت کرنا بالکل غلط ہے کہ عورتوں کو سیاسی منصب عطا کرنا جائز نہیں ہے۔

رہی وہ حدیث جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ عورتوں کو حکمراں بنانے والی قوم کامیاب نہیں ہوسکتی' تو اس میں جس چیز سے خبردار کیا گیا ہے۔ وہ ہے عورتوں کی ''ولایت'' ایسی حکمرانی جس میں حکمراں تمام سیاہ وسپید کا مالک ہوتا ہے اور جسے ہم مطلق العنان حکمراں کہتے ہیں۔ حدیث کا سیاق وسباق یہ ہے کہ کسریٰ کی موت کے بعد اہلِ فارس نے اس کی بیٹی کو اپنا حکمراں بنا لیا تھا۔ اہلِ فارس کے کسریٰ کس قسم کے مطلق العنان حکمراں ہوا کرتے تھے' سبھی جانتے ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو قوم اس طرح کی مطلق العنانی عورتوں کو سونپے گی وہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔

آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دورِ حاضر میں جبکہ جمہوریت کا دور دورہ ہے کوئی صدر یا وزیراعظم یا کسی قسم کا سیاسی اہلکار نہ مطلق العنان ہوتا ہے اور نہ ہی ملک کا سیاہ وسپید اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ صدر ہو یا وزیراعظم حکومت چلانے کے لیے یہ سب اپنے وزراء اور عوام سے باہمی مشورے کرتے ہیں۔ حکومت پر فائز لوگوں کو ہر آن مخالف

سیاسی پارٹی کی مخالفت کا سامنا ہوتا ہے۔یعنی دورِ حاضر میں بڑے سے بڑا سیاسی منصب مطلق العنانیت نہیں عطا کرتا ہے۔اس لیے اس حدیث کی بنیاد پر عورتوں کو سیاسی حقوق سے محروم کر دینا صحیح نہیں ہے۔

علاوہ ازیں بعض علماءِ کرام اس حدیث کو صرف کسریٰ کی بیٹی کے ساتھ خاص مانتے ہیں۔حضور ﷺ نے یہ بات صرف اہلِ فارس اور کسریٰ کی بیٹی کے سلسلے میں فرمائی ہے۔ یہ کوئی عمومی بات نہیں ہے کہ جب جب عورتیں حکمراں بنیں گی۔تب تب قوم تباہ و برباد ہوگی۔اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں بے شمار ایسی حکمراں عورتوں کے واقعات درج ہیں جنہوں نے مردوں سے زیادہ حسن وخوبی سے حکومت کی اور اپنی قوم کو فلاح و بہبود سے ہمکنار کیا۔اگر حضور ﷺ نے ساری حکمراں عورتوں کے لیے یہ بات کہی ہوتی تو تاریخ میں اس طرح کی کامیاب حکمراں عورتوں کے واقعات درج نہیں ہوتے۔قرآن نے بھی ایک ایسی حکمراں عورت یعنی ملکۂ سبا بلقیس کا واقعہ تعریف وتوصیف کے انداز میں بیان کیا ہے۔ملکۂ سبا بلقیس نے کمال حکمت و دانائی کے ساتھ حکومت کی اور سلیمان علیہ السلام کے ساتھ دانشورانہ معاملہ کیا حتیٰ کہ اس نے اسلام قبول کرلیا اور اپنی قوم کو تباہی و بربادی سے بچالیا۔یہ حکمراں عورت اپنی قوم کے لیے باعث تباہی نہیں، بلکہ باعثِ فلاح ثابت ہوئی۔

ان دلیلوں کے علاوہ کچھ عقلی دلیلیں بھی پیش کی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ عورتوں کے اندر جذباتیت زیادہ ہوتی ہے اس لیے وہ کسی اہم سیاسی منصب کے لیے موزوں نہیں ہو سکتیں۔عورتیں صرف انہی کاموں کے لیے موزوں ہیں جو عورتوں سے متعلق ہیں مثلاً بچے پیدا کرنا، ان کی پرورش کرنا اور امورِ خانہ داری سنبھالنا وغیرہ۔اس طرح کی دلیل پیش کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ ایسی جذباتیت صرف عورتوں میں نہیں، بلکہ بہت سارے مردوں میں بھی ہوتی ہے۔مرد بھی جذباتی ہوتے ہیں اور جذباتی انداز میں فیصلے کرتے ہیں اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

آپ نے دیکھ لیا کہ عورتوں کو سیاسی سرگرمیوں سے روکنے کے لیے ایک بھی ایسی دلیل نہیں ہے جسے واضح اور دوٹوک کہا جاسکے۔ بلکہ یہ بات اسلام کی عمومی تعلیمات کے خلاف ہے کہ عورتوں کو سیاسی سرگرمیوں سے کلیتہً روک دیا جائے بلکہ میں تو کہوں گا کہ عورتوں کی سیاسی سرگرمیوں کو ناجائز قرار دینے کے لیے قرآن وحدیث میں کسی دلیل کا نہ ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے لیے سیاسی سرگرمیاں جائز ہیں' کیونکہ اگر یہ بات ناجائز ہوتی تو قرآن وحدیث میں اس کا ذکر لازماً ہوتا۔

آج کے جمہوری دور میں کسی وزیراعظم' وزیر' پارلیمانی ممبر یا کسی بھی منصب پر فائز شخص کی ذمّے داریوں کا ایک بڑا حصہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے کاموں کی نگرانی کی جائے' عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جائے۔ معاشرے میں جرائم اور فسادات کی روک تھام کی جائے اور اربابِ حکومت کو حکومت چلانے کے لیے مفید مشورے دیے جائیں۔ اور یہ سارے کام اور ذمّے داریاں وہی ہیں جنہیں قرآن اپنی زبان میں ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کہتا ہے۔ اور حدیث میں ان کے لیے اس طرح کے الفاظ ہیں ''اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ'' (دین نام ہے لوگوں کے لیے خیرخواہی کا) ان ذمّے داریوں کو انجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یکساں طور پر مردوں اور عورتوں دونوں کو مخاطب کیا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ:۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار اور رفیق ہیں۔ یہ سب مل کر بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں''۔

اور تاریخ گواہ ہے کہ حضور ﷺ اور خلفاءِ راشدین کے عہد میں مردوں اور عورتوں دونوں نے مل کر یہ ذمّے داریاں نبھائی ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی ﷺ نے اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے سیاسی مشورے کیے اور آپ ﷺ نے ان مشوروں پر عمل کیا اور اس کے اچھے نتائج سامنے آئے۔ یہ واقعہ بھی سب جانتے ہیں کہ مسجد میں عمر رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے

تھے۔ کسی غلطی پر ایک عورت نے بھرے مجمع میں عمر رضی اللہ عنہ کو ٹوکا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور فرمایا: ''اَصَابَتِ الْمَرْأَةُ وَاَخْطَأَ عُمَرُ'' (عورت نے صحیح کہا اور عمر سے غلطی ہوگئی) اس طرح کی بیشمار مثالیں تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔

جب انفرادی طور پر عورت کو سیاسی مشورے دینے اور سیاسی محاسبہ کا حق حاصل ہے تو اجتماعی معاملات میں اسے اس حق سے محروم کر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ عورت اگر باصلاحیت ہے اور اس قابل ہے کہ معاشرہ میں لوگوں کی خیر خواہی کے لیے بہتر طریقہ سے اپنی ذمّے داریاں نبھا سکتی ہے تو اسے اس کا موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچا سکے اور وہ اس بات کی حقدار ہے کہ اسے کوئی سیاسی یا غیر سیاسی منصب عطا کیا جائے۔ چنانچہ ان ہی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خاتون حضرت الشفاء بنت عبداللہ العدویہ کو بازار کا نگران اور محاسب مقرر کیا تھا۔ دورِ حاضر کے لحاظ سے اس منصب کو ایک اعلیٰ عوامی منصب کے طور پر تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ اگر ہم نے کسی عورت کی صلاحیتوں کو لوگوں کے فائدے کے لیے استعمال نہیں کیا اور یہ عورت یوں ہی گھر میں بیٹھ کر اپنا قیمتی وقت برباد کرتی رہی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اس عورت کی خداداد صلاحیتوں کو ضائع کر دیا اور یہ بات کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی ہے۔

سب سے زیادہ خطرناک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ دیندار اور باصلاحیت خواتین کو ہم ہر قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی منصب کو حاصل کرنے سے روک دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان مناصب پر غیر دیندار اور مغرب پرست عورتیں فائز ہو جاتی ہیں جن کے کام کرنے کا ڈھنگ بالکل غیر اسلامی ہوتا ہے اور پالیسیوں کے نفاذ میں انہیں اسلامی احکام کا ذرہ برابر خیال نہیں ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ان مناصب پر ہماری دیندار اور باصلاحیت عورتیں فائز ہوتیں تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں کام کرتیں اور ایسے قوانین بناتیں جن سے اسلام کی اشاعت میں مدد ملتی۔

عاق کا مسئلہ

سوال: ایک عورت نے اپنے بیٹے کی نافرمانیوں سے تنگ آ کر اسے عاق کر دیا۔ اسے اپنی تمام جائیداد سے محروم کر دیا اور تمام جائیداد اپنی دو بیٹیوں کے نام کر دی۔ ان بیٹیوں نے کسی عالمِ دین سے اس معاملے میں شریعت کا حکم معلوم کیا تو عالمِ دین نے فرمایا کہ عورت نے اپنے لڑکے کو تمام جائیداد سے محروم کر کے اس پر ظلم کیا ہے اور اس کی حق تلفی کی ہے، جس کی سزا اسے آخرت میں بھگتنی ہوگی۔ اب یہ دونوں بیٹیاں پریشان ہیں کہ اپنی مرحومہ ماں کے اس گناہ کا کفارہ کس طرح ادا کیا جائے، اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی مطلوب ہے۔

جواب: بلاشبہ والدین اور خاص کر ماں کی نافرمانی شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے۔ یہ بات کسی مزید وضاحت کی محتاج نہیں ہے، کیونکہ والدین کے بے پناہ حقوق سے ہر کوئی بخوبی واقف ہے۔ بچے کی نافرمانی اور گمراہی جب حد سے تجاوز کر جائے تو اللہ تعالیٰ نے والدین کو یہ حق عطا کیا ہے کہ وہ اپنے بچے کو عاق کر دیں۔ لیکن اس کے باوجود والدین میں سے کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی بچے کو اپنی جائیداد اور وراثت سے محروم کر دے۔ وارثوں کی نامزدگی اور وراثت کی تقسیم تو اللہ کی جانب سے ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ اور حکم ہے اور کسی بندے کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس فیصلہ کو بدل سکے اور اس حکم کی نافرمانی کرے۔ اللہ اس سلسلے میں حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (النساء:۱۱)

”اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے سلسلے میں وصیت کرتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہونا چاہئے“۔

اسلامی شریعت نے صرف ایک صورت میں وارث کو اس کی وراثت سے محروم کیا ہے اور وہ یہ کہ وراثت جلد از جلد پانے کی غرض سے وارث اپنے مورث کو قتل کر ڈالے۔

آپ نے اپنے سوال میں جس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اس میں بچہ اپنی ماں کو قتل نہیں کرتا ہے' صرف اس کی نافرمانی کرتا ہے' اس لیے ماں یا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بچے کو وراثت سے محروم کردے۔

وصیت کے سلسلے میں چند باتوں کا دھیان ضروری ہے:

(۱) ایک تہائی سے زیادہ وصیت کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ رسول ﷺ کا فرمان ہے:

اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيْرٌ (بخاری و مسلم)

''ایک تہائی وصیت کرو اور ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے''۔

(۲) کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے۔ وصیت اس شخص کے لیے کرنی چاہئے جسے وراثت میں سے کچھ نہ مل رہا ہو' کیونکہ حضور ﷺ کا حکم ہے:

لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ (دارقطنی)

''کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے''۔

مذکورہ واقعہ میں اس عورت نے دونوں غلطیاں کر ڈالیں۔ پہلی غلطی اس نے یہ کی کہ اپنی جائیداد کا ایک تہائی نہیں' بلکہ پوری جائیداد کی وصیت کر ڈالی اور دوسری غلطی اس نے یہ کی کہ وارثین یعنی اپنی بیٹیوں کے حق میں وصیت کر ڈالی۔ چونکہ یہ وصیت شریعت کے مطابق نہیں ہے اس لیے اس وصیت کا نفاذ نہیں ہوگا۔

(۳) کوئی وارث اگر اپنی مرضی سے اپنے حق وراثت سے دستبردار ہونا چاہے اور اپنا حق کسی اور کو دینا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک وارث دوسرے وارث کے حق میں بھی دست بردار ہو سکتا ہے۔

مذکورہ واقعہ میں بیٹا اگر اپنی مرضی سے اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے' لیکن اگر وہ اپنا حق لینے کے لیے مصر ہے تو بیٹیوں پر فرض ہے کہ اس جائیداد میں سے اپنے بھائی کو اس کا حق ادا کردیں۔

اس کے باوجود کہ ماں نے غیر شرعی وصیت کر کے اپنے بیٹے پر ظلم کیا ہے' لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ مرنے کے بعد آخرت میں ماں کو اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔ کیونکہ سزا دینا یا نہ دینا مکمل طور پر اللہ کی مرضی پر منحصر ہے اور اس لیے بھی کہ نیکیاں بُرائیوں کو دھو ڈالتی ہیں جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے:

إِنَّ الْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ ۚ (ہود:۱۱۴)

''بلاشبہ نیکیاں بُرائیوں کو مٹاتی ہیں''۔

ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی دوسری نیکیوں کے عوض اس کے گناہوں کو معاف کر دے۔ ہم کسی بھی شخص کے سلسلے میں پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ شخص قیامت میں عذاب میں ڈالا جائے گا۔ لیکن کسی کی حق تلفی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی سزا سے بچنا بہت مشکل ہے۔

بہرحال ان بیٹیوں کو چاہیے کہ اس جائیداد میں سے اپنے بھائی کا حق ادا کر دیں اور اپنی مرحومہ ماں کے حق میں دعا و استغفار کرتی رہا کریں۔

پانچواں باب

اجتماعی و معاشی مسائل

☆ بنک کا قرض

☆ تجارتی انعامات

☆ بنکوں میں کرنسی کی خرید وفروخت

☆ نفع کی شرح

☆ ہنسی مذاق

☆ شطرنج

☆ گانا اور موسیقی

☆ طیاروں اور اشخاص کا اغوا

۵

بنک کا قرض

سوال: میں سِول انجینئر ہوں اور امریکہ میں رہتا ہوں۔ کچھ دنوں پہلے میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے سِول انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک نہایت سنہرا موقع میسر ہوا ہے۔ وہ یہ کہ ایک امریکی سِول انجینئر نے میرے ساتھ مل کر ایک بڑی کمپنی کھولنے کی پیشکش کی ہے۔ اس مقصد کے لیے بنک سے قرض لینا ہمارے لیے نہایت ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بنک سے قرض لینا جائز نہیں ہے' کیونکہ اس پر سود ادا کرنا ہوتا ہے' لیکن اس طرح کی بڑی کمپنی کھولنے کے لیے بنک سے قرض لینے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے۔ میں یہ موقع کسی بھی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتا کیونکہ میں عرصے سے کسی ایسی بڑی کمپنی کا خواب دیکھ رہا تھا۔ میں دولت کمانا اور ترقی کرنا چاہتا ہوں صرف اس لیے نہیں کہ مجھے دولت کی خواہش ہے' بلکہ اس لیے بھی کہ اپنی غریب مسلم اُمت کے کچھ کام آسکوں اور اس لیے بھی کہ میرے ترقی کرنے سے اُمتِ مسلمہ کا امیج (Image) کچھ نہ کچھ بہتر ہوگا۔ میں نے قرض حاصل کرنے کے لیے اسلامی بنکوں کو خطوط لکھے لیکن بہت انتظار کے باوجود ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں موصول ہوا۔ صرف ایک اسلامی بنک نے چار مہینے کے طویل انتظار کے بعد جواب دیا لیکن ایسا جواب جسے مایوس کن کہا جا سکتا ہے۔ آپ بتائیے میں کیا کروں؟ کیا ایسی صورت میں' میں بنک سے قرض لے سکتا ہوں؟

جواب: مال و دولت کمانا اور اس کے لیے دوڑ دھوپ کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے' کیونکہ اسلام کی نظر میں مالدار ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے ناپسندیدگی کی نظر سے

دیکھا جائے۔ اسلام کی نظر میں مال و دولت کوئی بُری شی نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی نظر میں مال و دولت کی حیثیت ایک نعمت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے یہ نعمت عطا کی گویا اس پر بڑا احسان کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى ۝ (الضحیٰ:۸)

''اور اس نے تمہیں تنگ دست پایا تو تمہیں مالداری عطا کی''۔

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ اپنی دعاؤں میں ہدایت و پاک بازی کے ساتھ ساتھ مالداری کی بھی دعا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰى ''اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت' تقویٰ' پاک دامنی اور مالداری کا سوال کرتا ہوں''۔ (مسلم)

حضور ﷺ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا تھا:

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ (مسند احمد)

''اچھا مال کسی اچھے شخص کے ہاتھ میں کیا ہی عمدہ چیز ہے''۔

غرض کہ مال و دولت کمانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ لیکن چند ایسے حقائق ہیں جن کا بیان ناگزیر ہے۔

(۱) روپے پیسے گرچہ بُری شے نہیں ہے' لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ فتنہ اور سامان آزمائش بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن:۱۵)

''بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں''۔

مال و دولت اس وقت فتنہ ہے جب انسان اس کی حرص میں مبتلا ہو کر اپنی آخرت سے لاپرواہ ہو جائے اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو جائے۔ اللہ فرماتا ہے:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ (العلق:۶'۷)

''ہرگز نہیں انسان سرکشی کرتا ہے' اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے''۔

(۲) روپے پیسے سے مالدار ہو جانا ہی اصل مالداری نہیں ہے' کیونکہ بسا اوقات انسان کروڑوں کا مالک ہو کر بھی دل کا فقیر ہوتا ہے۔ اصل مالدار وہ ہے جو دل کا مالدار ہے۔ حدیث شریف ہے:

لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعِرَضِ اِنَّمَا الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ (بخاری ومسلم)

''مالداری یہ نہیں ہے کہ سامانِ زیست زیادہ مل جائے' مالداری یہ ہے کہ دل مالدار ہو''۔

ایک مشہور عربی کہاوت ہے: قَلِيْلٌ يَكْفِيْكَ خَيْرٌ مِّنْ كَثِيْرٍ يُلْهِيْكَ ''تھوڑی دولت جو تمہارے لیے کافی ہو بہتر ہے اس کثیر دولت سے جو تمہیں غافل کر دے''۔

(۳) بعض لوگ اپنے دل میں ارادہ کرتے ہیں' بلکہ اللہ سے پکا عہد کرتے ہیں کہ جب انہیں مال و دولت حاصل ہوگا تو وہ فلاں اور فلاں نیکی کا کام کریں گے۔ لیکن جب انہیں دولت نصیب ہو جاتی ہے تو وہ اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا بھول جاتے ہیں اور یہ منافقین کی حرکت ہے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ○ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ○ (التوبۃ:۷۵٬۷۶)

''اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اس نے ہمیں اپنے فضل سے نوازا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور نیک بن جائیں گے۔ مگر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نوازا تو یہ بخیل بن گئے اور اپنی بات سے پھر گئے''۔

(۴) یہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ بہت جلد مالدار بن جانا چاہتا ہے۔ مالدار بننے

میں جلد بازی کی وجہ سے اکثر انسان اپنا رہا سہا بھی گنوا بیٹھتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ مالدار بننے کی خواہش میں حلال وحرام کی فکر نہیں کرتے ہیں۔ مال و دولت ایک نعمت ہے اور ضروری ہے کہ اس نعمت کو حلال طریقہ سے کمایا جائے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ اپنے سوال کا جواب تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ بہت جلد مالدار بن جانے کی فکر میں ایسا راستہ اختیار کر رہے ہیں، جس کے بارے میں سارے علماء متفق ہیں کہ وہ حرام ہے۔ بنک سے قرض لینا اور اس پر سود ادا کرنا۔ آپ یہ دلیل پیش کر رہے ہیں کہ اس کے علاوہ آپ کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی مجبوری کی حالت نہیں ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے حرام چیزیں مثلاً سوٗر کا گوشت وغیرہ کو حلال قرار دیا ہے۔ مجبوری کی حالت یہ ہے کہ جس میں سارے راستے بند ہو گئے ہوں اور بس یہی ایک مجبوری کا راستہ کھلا ہو۔ بنک سے قرض لے کر مالدار بننا تو ایسی کوئی مجبوری کی حالت نہیں ہے کہ مال کمانے کے دوسرے راستے آپ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔ آپ کے لیے بہتر ہوگا کہ آپ ایک دم سے مالدار بن جانے کی بجائے نارمل انداز میں بتدریج پیسہ کمانے کی کوشش کریں۔ بتدریج آگے بڑھنے اور نارمل انداز میں محنت کرنے سے آپ بہت سارے خطرات اور نقصانات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ورنہ راتوں رات مالدار بن جانے کی خواہش میں اپنا رہا سہا بھی گنوا سکتے ہیں۔ اس طرح دنیا بھی برباد ہوگی اور آخرت کا بھی نقصان ہوگا۔

تجارتی انعامات

سوال: بعض کمپنیاں اور دکانیں اپنی تجارت کو فروغ دینے کی خاطر خریداروں کو مفت انعام پیش کرتی ہیں۔ یہ مفت انعام کبھی سامان کی شکل میں ہوتا ہے۔ مثلاً کار، فرج، ٹی وی وغیرہ اور کبھی روپے پیسے کی شکل میں۔ عام طور پر یہ انعام قرعہ اندازی کے ذریعے خریداروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کیا اس مفت انعام کا لینا جائز ہے؟ قرعہ اندازی کے

ذریعے انعام پیش کرنے کی وجہ سے' کیا یہ طریقہ کار جوا اور لاٹری سے مشابہ نہیں ہے؟

جواب: کافی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تجارت کو فروغ دینے کی خاطر اس طرح کے مفت انعام پیش کرنا خواہ سامان کی شکل میں ہو یا روپے پیسے کی شکل میں' جائز ہے اور یہ چیز جوا یا لاٹری میں شمار نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ جوا اور لاٹری میں یہ ہوتا ہے کہ بہت سارے لوگوں کا پیسہ یکجا کر کے کچھ لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ بہت سارے لوگوں کے نقصان کی وجہ سے کچھ لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے' جبکہ اس طرح کے مفت انعام میں یہ صورتِ حال نہیں ہوتی ہے۔ دکاندار اپنی خوشی سے اور اپنی جیب سے کچھ انعام خریداروں کے درمیان تقسیم کرتا ہے۔ جہاں تک قرعہ اندازی کا مسئلہ ہے تو شرعی لحاظ سے قرعہ اندازی میں کوئی قباحت نہیں ہے' بلکہ قرعہ اندازی کا طریقہ کار حدیث سے ہی ثابت ہے۔

یہ مفت انعام دکاندار اگر اپنی جیب سے نہیں' بلکہ سامان کی تھوڑی قیمت بڑھا کر اور خریداروں سے یہ قیمت وصول کر کے اس زائد قیمت سے خریدا ہوا انعام خریداروں میں مفت تقسیم کرتا ہے تو یہ چیز جوا اور لاٹری کے زمرے میں شامل ہو جائے گی۔

تاہم اگر دکاندار اپنی جیب سے اور اپنی خوشی سے یہ مفت انعام لوگوں میں تقسیم کرتا ہے پھر بھی یہ طریقہ کار میری نظر میں بہت پسندیدہ نہیں ہے۔

بنکوں میں کرنسی کی خرید و فروخت

سوال: اسلامی بنکوں میں بین الاقوامی سکوں (Foreign Currency) کے لین دین کا جو طریقہ رائج ہے کیا یہ طریقہ شریعت کی نظر میں جائز ہے؟ پہلے میں اس طریقے کی وضاحت کر دوں تاکہ جواب دینے میں آپ کو آسانی ہو۔

(۱) کوئی بھی اسلامی بنک سب سے پہلے اس فارن کرنسی کا انتخاب کرتا ہے' جسے وہ

خریدنا یا بیچنا چاہتا ہے۔ یہ انتخاب عالمی منڈیوں سے جڑے ہوئے نیٹ ورک کو دیکھ کر عمل میں آتا ہے۔ فرض کرلیں کہ اسلامی بنک نے خریدنے کے لیے امریکی ڈالر کا انتخاب کیا۔

(۲) فرض کرلیں کہ اسلامی بنک برطانیہ میں واقع برٹش بنک سے ڈالر خریدنا چاہتا ہے۔ ڈالر خریدنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ برٹش بنک کو کوئی دوسری فارن کرنسی فروخت کرے۔ فرض کرلیں کہ ڈالر خریدنے کے لیے اسلامی بنک برٹش بنک کو جرمن مارک فروخت کرتا ہے۔ اگر ایک ڈالر تین جرمن مارک کے برابر ہے تو اسلامی بنک برٹش بنک سے ایک کروڑ ڈالر خریدنے کے لیے اسے تین کروڑ جرمن مارک فروخت کرتا ہے۔

(۳) کرنسی کے انتخاب کے بعد اسلامی بنک برٹش بنک کو اس بنک کے بارے میں مطلع کرتا ہے، جس سے اس کا ہمیشہ لین دین رہتا ہے (مثلاً امریکہ میں واقع بنک آف امریکہ) تاکہ برٹش بنک ایک کروڑ امریکی ڈالر کی رقم بنک آف امریکہ میں اسلامی بنک کے نام جمع کرادے۔ اسی طرح برٹش بنک اسلامی بنک کو اس بنک کا نام بتاتا ہے جس سے اس کا لین دین رہتا ہے (مثلاً جرمنی میں واقع فرنکفرٹ بنک) تاکہ اسلامی بنک تین کروڑ جرمن مارک فرنکفرٹ بنک میں برٹش بنک کے نام سے جمع کرا دے۔

(۴) اس کے بعد دونوں بنک ایک دوسرے کے نام سے مذکورہ بنکوں میں مذکورہ رقم جمع کرادیتے ہیں اور اس طرح خرید وفروخت کا عمل پورا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ خرید وفروخت کا یہ عمل کبھی منٹوں میں پورا ہو جاتا ہے اور کبھی چند گھنٹوں میں، لیکن زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹوں کے اندر اندر۔ کیوں کہ اس کے بعد یہ خرید وفروخت نقد (Cash) نہیں کہلاتا ہے، بلکہ ادھار (Credit) کہلاتا ہے۔ کرنسیوں کی اس طرح خرید وفروخت کیا شرعاً ناجائز ہے؟

جواب: آپ کے سوال کا میں نہایت مختصر جواب پیش کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ مختصر جواب آپ کے لیے کافی اور تسلی بخش ہوگا۔

کرنسیوں کی خرید و فروخت میں شرعی اصول یہ ہے کہ یہ لین دین نقد (Cash) ہو جیسا کہ مختلف صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ ادھار (Credit) کا معاملہ کرنسیوں کے لین دین میں جائز نہیں ہے' کیونکہ کرنسیوں کی قیمتیں مسلسل گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور کوئی ضروری نہیں ہے کہ آج جو کرنسی جس قیمت پر خریدی جا رہی ہے کل بھی اس کرنسی کی وہی قیمت ہو۔

رہی یہ بات کہ نقد لین دین کی کون کون سی صورتیں جائز ہو سکتی ہیں تو یہ معاملہ شریعت نے عرفِ عام پر چھوڑ دیا ہے۔ عرفِ عام میں نقد لین دین کی جو شکل رائج ہوگی وہ شرعاً جائز ہوگی۔

دورِ حاضر میں کرنسیوں کا نقد لین دین بنکوں کے واسطے سے ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے سوال میں واضح کیا ہے' اس لیے شرعاً یہ طریقہ جائز ہے۔ البتہ اسلامی بنک خریدی ہوئی کرنسی اس وقت تک فروخت نہیں کر سکتا جب تک اس کرنسی پر اس کا قبضہ نہ ہو جائے' یعنی یہ کرنسی اس کی تحویل میں نہ آ جائے۔

نفع کی شرح

سوال: کیا شریعت نے تجارت میں نفع (Profit) کی کوئی حد مقرر کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کس حد تک منافع لیا جا سکتا ہے؟ یا شریعت نے اس معاملے میں تاجر کو پوری آزادی عطا کر رکھی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق منافع کی شرح مقرر کر لے؟ امید ہے کہ آپ قرآن و سنّت کی روشنی میں جواب دیں گے۔

جواب: بلاشبہ شریعت کی نظر میں دولت کمانے اور منافع حاصل کرنے کے لیے تجارت ایک بہترین اور معزز پیشہ ہے۔ قرآن کی متعدد آیتوں اور صحیح حدیثوں

میں تجارت کا تذکرہ اچھے پیرایے میں ہوا ہے' بلکہ قرآن کی مختلف آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے منافع (Profit) کو 'فضل اللہ' (اللہ کا فضل) قرار دیا ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

(الجمعہ: ۹)

''پس جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو''۔

وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (المزمل: ۲۰)

''اور کچھ دوسرے ہیں جو زمین میں سفر کرتے ہیں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہوئے''۔

حج جیسی عظیم عبادت کے دوران بھی اللہ نے اس فضل کو کمانے سے منع نہیں کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ط (البقرۃ: ۱۹۸)

''تمہارے لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی حج کے دوران بھی)''

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

أَلَا مَنْ وَّلِيَ يَتِيْمًا لَهُ مَالٌ فَلْيَتَّجِرْ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكْهُ حَتّٰى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ (ترمذی)

''سنو جب کوئی شخص کسی ایسے یتیم کا سرپرست بنایا جائے جس کے پاس مال و دولت ہے تو اسے چاہیے کہ اس مال میں تجارت کرے اور اسے یونہی بغیر تجارت کے نہ چھوڑ دے کیونکہ اس طرح چھوڑنے سے اس کا سارا مال زکوٰۃ کھا جائے گی''۔

کسی مال میں تجارت نہ کی جائے اور ہر سال اس میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے تو

دھیرے دھیرے یہ مال بغیر کسی منافع کے ختم ہو جائے گا۔ یہ حدیث تجارت کے سلسلے میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ یہ کہ کسی بھی تجارت کا کم از کم یہ مقصد ہونا چاہئے کہ اس سے نفع حاصل کیا جائے تا کہ اس نفع سے انسان کی ضرورتیں پوری ہوں۔ نان ونفقہ کا انتظام ہو جائے اور اس نفع کی وجہ سے اصل سرمایہ میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے نہ کہ زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے دھیرے دھیرے یہ اصل سرمایہ بھی ختم ہو جائے۔

قرآن وسنت کے تفصیلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے منافع کی کوئی شرح متعین نہیں کی ہے۔ نہ دس فیصد' نہ بیس فیصد اور نہ اس سے زیادہ یا کم۔ شاید اس کی حکمت ومصلحت یہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر علاقے کے لیے منافع کی ایک ہی شرح متعین کرنا عدل وانصاف کے منافی ہے' کیونکہ کچھ سامانِ تجارت ایسے ہوتے ہیں جن کی کھپت (Consuming) بہت تیز ہوتی ہے اور ان کی فروخت جلد جلد ہوتی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں۔ کچھ سامانِ تجارت ایسے ہوتے ہیں جن کی کھپت بہت سست اور کبھی کبھی ہوتی ہے۔ مثلاً کار' فرنیچر اور کپڑے وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں طرح کے سامانِ تجارت میں منافع کی شرح ایک جیسی نہیں ہوسکتی۔ جس سامانِ تجارت کی کھپت جلد اور تیز ہوتی ہے ان میں منافع کی شرح کم ہونی چاہئے جبکہ دوسری قسم کے سامانِ تجارت میں یہ شرح زیادہ ہوسکتی ہے۔

سامانِ تجارت کبھی نقد بیچے جاتے ہیں اور کبھی ادھار۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں منافع کی شرح ایک جیسی نہیں ہوسکتی۔ نقد خرید وفروخت میں منافع کی شرح ادھار کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔

بعض دکاندار چھوٹے ہوتے ہیں اور کم سرمایے سے تجارت کرتے ہیں' جبکہ بڑے دکاندار بڑے سرمایہ سے تجارت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بڑا سرمایہ دار بہت کم منافع لے کر بھی فائدے میں رہے گا' جبکہ چھوٹا دکاندار کم منافع لے کر اپنی تجارت کو فروغ نہیں

دے سکتا۔اس لیے ضروری ہے کہ وہ زیادہ نفع لے۔

کچھ سامانِ تجارت ایسے ہوتے ہیں جن کا شمار ضروری اور بنیادی اشیاءِ صرف (Essential Goods) اور کچھ سامانِ تجارت ایسے ہوتے ہیں جن کا شمار سامانِ تعیش (Luxury Goods) میں ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ ان دونوں قسم کے سامانِ تجارت میں منافع کی شرح ایک جیسی نہیں ہوسکتی۔ بنیادی اشیاء غریب لوگ بھی خریدتے ہیں' اس لیے ان میں منافع کی شرح بہت کم ہونی چاہیے' جبکہ سامانِ تعیش میں منافع کی شرح زیادہ بھی کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ضروری اور بنیادی اشیاءِ صرف مثلاً غلہ وغیرہ کی ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار دیا ہے' کیونکہ ذخیرہ اندوزی کے ذریعے ان میں بہت زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' جو غریبوں کے لیے تباہ کن ہے۔

بعض سامانِ تجارت ایسے ہوتے ہیں جو صرف ایک واسطے (Mediator) کے بعد بازار میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے ان میں منافع کی شرح کم ہوتی ہے۔ جبکہ بعض سامانِ تجارت فیکٹری سے نکل کر کئی واسطوں سے ہوتے ہوئے بازار میں آتے ہیں۔ اس قسم کے سامانِ تجارت میں پہلے سامان کے مقابلے میں منافع کی شرح زیادہ ہونی چاہیے۔

غرض کہ منافع کی شرح متعین کرنے میں بہت سارے عوامل کارفرما ہوتے ہیں' جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ منافع کی شرح متعین کرتے وقت ان سب عوامل کی رعایت کی جائے۔ اگر شریعت نے تمام حالات اور تمام طرح کے سامانِ تجارت میں منافع کی ایک ہی شرح متعین کر دی ہوتی تو یہ بات عدل و انصاف کے منافی ہوتی۔شریعت نے تاجر کے ضمیر پر یہ بات چھوڑ دی ہے کہ وہ ان سب عوامل کی رعایت کرتے ہوئے اور معاشرے میں مروّجہ اصول کو دیکھتے ہوئے منافع کی کوئی شرح متعین کرے۔ وہ ایسی شرح متعین کرے جس سے نہ اسے نقصان ہو اور نہ

خریداروں کو۔ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ کیونکہ اسلامی معاشیات میں اخلاقیات کا بڑا عمل دخل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بالکل برعکس کہ جس میں دولت کمانے کی خاطر یہ طریقہ کار جائز ہے چاہے یہ دولت سود سے آتی ہو یا ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ یا شراب اور دوسری مضر اشیاء فروخت کر کے۔ اسلامی معاشیات میں ہر وہ طریقہ تجارت حرام ہے جس میں کسی کی حق تلفی ہوتی ہو یا جو اخلاقیات کے منافی ہو۔ اسلام نے اگرچہ منافع کی کوئی شرح متعین نہیں کی ہے' لیکن اخلاقیات کی پابندی ہر حالت میں ضروری ہے۔

بعض حنفی علماء نے سو یا اس سے زائد فیصد منافع حاصل کرنے کو غلط قرار دیا ہے' جبکہ بعض مالکی علماء نے تیس پینتیس فیصد سے زیادہ نفع کو غلط قرار دیا ہے حالانکہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل سے ثابت ہے کہ انہوں نے کبھی سو فیصد اور کبھی اس سے بھی زیادہ نفع لیا ہے۔ ان لوگوں کا عمل اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ بعض صورتوں میں سو یا اس سے زیادہ فیصد نفع لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ کسی پر ظلم نہ ہو رہا ہو یا کسی کی حق تلفی نہ ہو رہی ہو۔ میں چند ایسے واقعات پیش کر رہا ہوں جن میں سو فیصد یا اس سے بھی زیادہ نفع لینے کا تذکرہ موجود ہے۔

(۱) بخاری' ترمذی اور مسند احمد وغیرہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو ایک دینار دے کر بھیجا کہ وہ اس سے حضور ﷺ کے لیے ایک بکری خرید لیں۔ عروہ رضی اللہ عنہ نے بکری والے سے مول تول کیا اور ایک دینار میں دو بکریاں خرید لیں۔ وہ دونوں بکریاں لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک شخص مل گیا' اس نے دونوں بکریوں میں سے ایک بکری ایک دینار کے عوض خرید لی۔ (گویا حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے سو فیصد نفع لے کر بکری فروخت کی) پھر عروہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ لیجئے ایک بکری اور ساتھ میں ایک دینار۔ حضور ﷺ نے تعجب سے دریافت کیا کہ عروہ تم نے یہ کیسے کیا؟ عروہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ اس پر حضور ﷺ نے عروہ رضی اللہ عنہ کو ان کی تجارت میں برکت کی دعا دی۔

(۲) سو فیصد سے زیادہ نفع لینے کا واقعہ بخاری شریف میں ذرا تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور جنہیں دنیا ہی میں جنت کی خوشخبری دے دی گئی تھی۔ انہوں نے مدینہ کے مضافات میں ایک زمین ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں خریدی۔ ان کی شہادت کے بعد ان کا قرض چکانے کے لیے ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے یہی زمین سولہ لاکھ درہم میں فروخت کی۔ گویا کئی سو گنا نفع وصول کیا۔ یہ واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا ہے۔ زمین فروخت کرنے والے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے اور زمین خریدنے والے متعدد جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے مثلاً معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ اور یہ سودا بہت سارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی موجودگی میں طے پایا۔ اگر اس طرح کئی سو فیصد نفع لینا شریعت کی نظر میں غلط ہوتا تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ضرور اعتراض کرتے، لیکن کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ اس لیے یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ سو فیصد سے زیادہ نفع بھی لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی غبن دھوکا اور ذخیرہ اندوزی نہ ہو۔

ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہر طرح کی تجارت میں سو یا اس سے زیادہ فیصد نفع لینا جائز ہے۔ ان کے بیان کا مقصد صرف یہ ہے کہ شریعت نے نفع کی کوئی شرح مقرر نہیں کی ہے۔ بعض صورتوں میں نفع کی شرح سو فیصد یا اس سے زائد بھی ہو سکتی ہے اور شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بشرطیکہ غبن، دھوکا اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعے یہ نفع نہ حاصل کیا جائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان منافعوں کا بھی تذکرہ کر دوں جن کا حاصل کرنا حرام ہے:

(۱) حرام اشیاء مثلاً شراب، نشیلی دواؤں اور مورتیوں وغیرہ کی تجارت سے حاصل کیا گیا نفع، حرام ہے۔ اسی طرح ہر اس چیز کی تجارت سے حاصل کیا ہوا نفع حرام ہے جو

لوگوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ مثلاً کھانے کی وہ چیزیں جو زیادہ وقت گزرنے کی وجہ سے گل سڑ گئی ہوں یا وہ دوائیں جو صحت کے لیے مضر ہوں وغیرہ وغیرہ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ (بخاری، مسلم)

''بلاشبہ اللہ نے شراب، مردہ، سور اور مورتیوں کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے''۔

(۲) فریب دھوکے سے حاصل کیا گیا منافع، حرام ہے۔ مثلاً سامانِ تجارت کا عیب چھپا کر اسے فروخت کرنا یا دھوکے سے کسی چیز کو فروخت کرنا۔ اس ضمن میں وہ اشتہارات بھی آئیں گے جن میں کمپنیوں کی پیداوار (Product) کی ترویج کے لیے اس کی تعریف میں بہت کچھ جھوٹ بولا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا (بخاری)

''جو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ بَاعَ مِنْ اَخِيْهِ بَيْعًا وَفِيْهِ عَيْبٌ اِلَّا بَيَّنَهُ لَهُ (مسند احمد، ابن ماجہ)

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے کسی بھائی کو کچھ فروخت کرے اور اس میں کوئی عیب ہو، مگر یہ کہ وہ اسے اس عیب کے بارے میں بتا دے''۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کبھی بھی سامان کا عیب چھپا کر سامان فروخت نہیں کرتے تھے۔ اگر اس میں کوئی عیب ہوتا تو خریدنے والے پر عیب ضرور ظاہر کر دیتے۔ اس بات پر ان کا سختی سے عمل تھا۔

دھوکے کی صورتیں یہ بھی ہیں کہ خریدار کو بھولا بھالا اور سادہ لوح سمجھ کر اس سے

ضرورت سے زیادہ قیمت وصول کر لی جائے۔ یا خریدار کی شدید ضرورت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دوگنی چوگنی قیمت وصول کی جائے۔ نفع حاصل کرنے کے یہ طریقے حرام ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ کم منافع پر قناعت کی جائے۔ کم منافع لینے سے سامان کی فروخت بڑھ جاتی ہے اور کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے' جبکہ زیادہ منافع لینے سے وقتی فائدہ تو ضرور ہوتا ہے' لیکن حقیقت میں زیادہ نفع لینے سے کاروبار میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو نہایت مالدار صحابی تھے اور دنیا ہی میں انہیں جنت کی خوشخبری دے دی گئی تھی' ان سے ان کی مالداری کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے کبھی کم سے کم نفع کو بھی نہیں ٹھکرایا۔

(۳) سامانِ تجارت کی ذخیرہ اندوزی کر کے حاصل کیا گیا نفع بھی حرام ہے۔

حدیثِ نبوی ہے:

لَایَحْتَکِرُ اِلَّا خَاطِئٌ (مسلم)

''وہی شخص ذخیرہ اندوزی کرتا ہے جو گناہگار ہوتا ہے''۔

ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنِ احْتَکَرَ الطَّعَامَ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا فَقَدْ بَرِیَٔ مِنَ اللّٰہِ وبَرِیَ اللّٰہُ مِنْہُ (مسند احمد)

''جس نے کھانے پینے کی اشیاء کی چالیس دن تک ذخیرہ اندوزی کی تو وہ اللہ سے بری ہے اور اللہ اس سے بری ہے''۔

ذخیرہ اندوزی یہ ہے کہ سامانِ تجارت کو بازار میں جانے سے روک دیا جائے تاکہ اس قلّت کی وجہ سے سامان کی قیمت بڑھ جائے' اور اس کے بعد اسے فروخت کیا جائے۔

ایسی ذخیرہ اندوزی اس لیے حرام ہے کہ اس سے عوام کو تکلیف اور نقصان ہوتا ہے۔ یہ تکلیف اور نقصان اس وقت دو چند ہو جاتا ہے کہ جب ذخیرہ اندوزی کرنے والا

صرف ایک شخص یا ایک کمپنی ہو۔ یہ شخص یا یہ کمپنی بعض اشیاءِ صرف کو بازار میں پہنچنے سے قبل اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں اور جب ان اشیاءِ صرف کی مانگ بڑھتی ہے تو یہ ان کی من مانی قیمت وصول کرتے ہیں۔ اسے اصطلاح میں Monopoly یا اجارہ داری بھی کہتے ہیں۔ سود کی طرح سے یہ چیز بھی سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں میں سے ہے۔

فقہاء کے نزدیک اس بات میں اختلاف ہے کہ کن اشیاءِ صرف کی ذخیرہ اندوزی حرام ہے؟ بعض فقہاء کے نزدیک صرف کھانے پینے کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی حرام ہے۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح اور معتبر رائے یہ ہے کہ ان تمام اشیاءِ صرف کی ذخیرہ اندوزی حرام ہے جنہیں ضروری اور لازمی اشیاء (Essential Goods) کا نام دیا جاسکتا ہے مثلاً کھانے پینے کی چیزیں' دوائیں' کپڑے' مکانات اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں وغیرہ وغیرہ۔ لازمی اور ضروری اشیاء کا تعین زمانے کے لحاظ سے کیا جائے گا کیونکہ بہت ساری ایسی چیزیں جنہیں آج سے چند سال قبل سامانِ تعیش (Luxury Goods) کہا جاتا تھا' آج انہیں لازمی اشیاء میں شمار کیا جاتا ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الخراج'' میں لکھا ہے کہ ہر اس چیز کی ذخیرہ اندوزی حرام ہے جس کی ذخیرہ اندوزی سے عوام کو نقصان اور تکلیف ہو۔

فقہاء کے درمیان اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ کیا ہر حالت میں ذخیرہ اندوزی حرام ہے یا صرف تنگی اور قلت کی حالت میں؟ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ صرف تنگی اور قلت کے زمانے میں ذخیرہ اندوزی حرام ہے۔ لیکن اگر ان اشیاء کی تنگی اور قلت نہ ہو بلکہ مارکیٹ میں ان اشیاء کی بہتات ہو تو ایسی صورت میں ان اشیاء کی ذخیرہ اندوزی حرام نہیں ہے۔ لیکن بعض فقہاء کے نزدیک ہر حالت میں ذخیرہ اندوزی حرام ہے' کیونکہ ذخیرہ اندوزی کے ذریعے لازمی طور پر ان اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ شریعت نے منافع کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے اور اسے مارکیٹ پر چھوڑ دیا ہے' کیونکہ مانگ اور سپلائی کے اصول پر مارکیٹ منافع کی شرح خود ہی مقرر کر

لیتا ہے۔ معاشیات کا علم رکھنے والے اس اصول کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ البتہ اگر صورتِ حال ایسی ہو کہ مارکیٹ میں منافع کی شرح چند اسباب کی بنا پر ضرورت سے زیادہ ہو تو ایسی صورت میں حکومت کے لیے ضروری ہے کہ مارکیٹ میں دخل اندازی کرتے ہوئے قیمت اور منافع کی شرح کو متعین کر دے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تجارت میں منافع حاصل کرنا جائز بلکہ پسندیدہ عمل ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ''فضل اللہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ شریعت نے منافع کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ بعض احادیث میں سو فیصد یا اس سے زیادہ نفع لینے کا تذکرہ موجود ہے۔

زیادہ نفع لینا صرف بعض حالات میں جائز ہے۔ تمام حالات میں نہیں۔ وہ اشیاءِ صرف جن کا تعلق غریبوں سے ہوتا ہے اور وہ اشیاءِ صرف جنہیں ہم لازمی اور ضروری اشیاء قرار دیتے ہیں۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے وغیرہ۔ ان میں ضرورت سے بہت زیادہ نفع لینا جائز نہیں ہے۔ دھوکا' غبن' ذخیرہ اندوزی یا ہر اس طریقے سے نفع حاصل کرنا حرام ہے' جس سے خریداروں کو نقصان پہنچے۔ اسی طرح حرام چیزوں کی تجارت سے کمایا ہوا نفع بھی حرام ہے۔

اگرچہ تاجروں کو حلال نفع کمانے کا پورا حق ہے' لیکن حکومت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ضرورت پڑنے پر اشیاءِ صرف کی قیمت اور منافع کی شرح متعین کرنے کے لیے دخل اندازی کرے تاکہ چند لوگ مل کر عوام کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔

ہنسی مذاق

سوال: کیا ہنسی مذاق کرنا' لطیفے اور چٹکلے سنانا اور ایسی حرکتیں کرنا جن سے لوگوں کو ہنسی آئے شرعاً جائز ہے؟ بعض دین دار حضرات کا اس بات پر اصرار ہے کہ ہنسی مذاق کرنا دینی نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔ بقول ان کے ہمارا دین سنجیدہ' پروقار اور بارعب رہنے

کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دیندار لوگوں کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ان کی باتوں میں نرمی کے بجائے سختی ہوتی ہے' چہرے پر درشتی ہوتی ہے' گفتگو میں لڑنے بھڑنے والا انداز ہوتا ہے اور معاملات میں بڑا روکھا پن ہوتا ہے۔ اپنے اس طرزِ عمل کے حق میں یہ لوگ درج ذیل دلیلیں پیش کرتے ہیں:

(۱) حدیثِ نبوی ہے: لَا تُكْثِرِ الضِّحْكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضِّحْكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ ''بہت کثرت سے نہ ہنسا کرو کیونکہ کثرت سے ہنسا دل کو مردہ کر دیتا ہے''۔

(۲) ایک دوسری حدیث ہے وَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يُحَدِّثُ الْحَدِيْثَ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ فَيَكْذِبُ وَيْلٌ لَّهُ وَيْلٌ لَّهُ ''تباہی ہے اس کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے باتیں کرے اور باتوں میں جھوٹ بولے۔ تباہی ہے اس کے لئے' تباہی ہے اس کے لئے''۔

(۳) نبی ﷺ کے سلسلے میں روایت ہے کہ ''كَانَ مُتَوَاصِلَ الْأَحْزَانِ'' یعنی آپ پر ہمیشہ حزن وغم کی کیفیت رہتی تھی۔

(۴) قرآن کی یہ آیت لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (القصص:۷۶) ''نہ اترایا کر' کیوں کہ اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

جہاں تک اسلام کے سلسلہ میں میرا مطالعہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ اسلام جیسا عمدہ اور بہترین مذہب ایسے طرزِ عمل کی تعلیم نہیں دے سکتا جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں' بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اسلام کی طرف اس طرح کی باتیں منسوب کرنا اس کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔ امید ہے کہ قرآن وسنّت کی روشنی میں آپ اس مسئلہ کی وضاحت کریں گے۔

جواب: ہنسنا ایک انسانی خصلت ہے اور عین فطری عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہنستے ہیں' جانور نہیں ہنستے ہیں۔ کیونکہ ہنسی اس وقت آتی ہے جب ہنسی کی بات سمجھ میں آتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سمجھداری جانوروں میں نہیں ہوتی ہے۔

چونکہ اسلام دینِ فطرت ہے اس لیے اسلام کے سلسلے میں یہ تصوّر محال ہے کہ وہ

ہنسنے ہنسانے کے فطری عمل پر روک لگائے گا' بلکہ اس کے برعکس اسلام ہر اس عمل کو خوش آمدید کہتا ہے جو زندگی کو ہشاش بشاش بنانے میں مددگار ثابت ہو۔ اسلام یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پیروکاروں کی شخصیت بارونق' ہشاش بشاش اور تروتازہ ہو۔ مرجھائی ہوئی بے رونق اور پژمردہ شخصیت اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔

اس اسلامی شخصیت کا نمونہ دیکھنا ہو تو آنحضور ﷺ سے بہتر نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ کی سیرتِ پاک کا مطالعہ کرنے والا بخوبی جانتا ہے کہ آپ ﷺ گوناگوں دعوتی مسائل اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کے باوجود ہمیشہ ہنستے مسکراتے اور خوش رہتے تھے۔ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ اپنے ساتھیوں (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے ساتھ بالکل فطری انداز میں زندگی گزارتے تھے اور ان کے ساتھ ان کی خوشی' کھیل اور ہنسی مذاق کی باتوں میں شرکت فرماتے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے غموں اور پریشانیوں میں شریک رہتے تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کی شخصیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں تو آپ کا پڑوسی تھا۔ جب وحی نازل ہوتی تو مجھے بلا بھیجتے تاکہ میں اسے لکھ لوں۔ حضور ﷺ کی یہ حالت تھی کہ ہم سب جب دنیا کی باتیں کرتے تو حضور ﷺ بھی ہمارے ساتھ دنیا کی باتیں کرتے۔ جب ہم آخرت کی باتیں کرتے تو حضور ﷺ بھی ہمارے ساتھ آخرت کی باتیں کرتے اور جب ہم کھانے پینے کے بارے میں باتیں کرتے تو حضور ﷺ بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر باتیں کرتے۔ حضور ﷺ ہمارے ساتھ ہماری ساری گفتگو میں شریک ہوتے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آنحضور ﷺ کے بارے میں بتایا کہ ''آپ لوگوں میں سب سے زیادہ پُر مزاح اور پُر لطف شخصیت کے مالک تھے''۔

(کنز العمال حدیث نمبر ۱۸۴۰۰)

بخاری شریف کی اُمّ زُرع والی مشہور حدیث میں بیان ہے کہ حضور ﷺ اپنے گھر

میں اپنی بیویوں کے ساتھ کھیل تماشے کرتے تھے' ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔ اپنی بیویوں سے کہانیاں سنتے تھے۔ بخاری شریف ہی کی روایت ہے کہ حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مل کر دوڑ لگاتے تھے۔ اس دوڑ میں کبھی عائشہ رضی اللہ عنہا جیت جاتیں اور کبھی آپ ﷺ جیت جاتے۔ کون نہیں جانتا ہے کہ آنحضور ﷺ اپنی پیٹھ پر اپنے نواسوں (حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ) کو سوار کیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اور ان بچوں کی باتیں بڑے شوق سے سنتے تھے۔ کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی پیٹھ پر بچوں کو سوار دیکھ کر کہا کہ یہ تو بہترین سواری ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ شہسوار بھی تو بہترین ہیں۔

آنحضور ﷺ لوگوں کے ساتھ مذاق بھی کیا کرتے تھے۔ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بڑھیا نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ دعا کریں کہ میں جنت میں چلی جاؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں بوڑھی عورتیں نہیں جائیں گی۔ یہ جواب سن کر وہ بڑھیا رونے لگی۔ آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ بڑی بی! جنت میں کوئی بوڑھا نہیں ہوگا۔ بوڑھا شخص بھی جنت میں جوان ہو کر داخل ہوگا۔

ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا تا کہ آپ ﷺ اسے اونٹ کی سواری عطا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا۔ اس شخص نے حیرت سے پوچھا کہ اونٹنی کا بچہ سواری کے قابل کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اونٹ بھی تو آخر کسی اونٹنی کا بچہ ہوتا ہے۔ (ترمذی)

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اُمّ ایمن نام کی ایک عورت حضور ﷺ کے پاس آئی اور کہا کہ میرے شوہر آپ کو بلا رہے ہیں۔ آپ نے سوال کیا کہ تمہارا شوہر کون ہے' وہی نا جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے (آنکھوں میں سفیدی ہونا بے شرم ہونے کے لیے محاورۃً استعمال کیا جاتا ہے) اس عورت نے سمجھا کہ حضور ﷺ اس کے شوہر کو بے شرم کہہ رہے ہیں۔ کہنے لگی کہ بخدا میرے شوہر کی آنکھوں میں سفیدی

نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ سفیدی تو ہر آنکھ میں ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا مقصد اس سفیدی سے تھا جو سیاہ دائرے کے اردگرد ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ اور سودۃ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا ہمارے گھر میں موجود تھے۔ میں نے ان کے لیے حریرہ (دودھ اور آٹا میں بنا ہوا کھانا) تیار کیا۔ پھر میں نے اسے سودہ رضی اللہ عنہا کے سامنے کھانے کے لیے پیش کیا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ مجھے حریرہ پسند نہیں ہے۔ میں نے سودہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ کھاؤ ورنہ تمہارے چہرے پر حریرہ مل دوں گی۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے پھر بھی کھانے سے انکار کیا تو میں نے ان کے چہرے پر حریرہ مل دیا۔ حضور ﷺ ہم دونوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ تھوڑا سا جھک گئے تاکہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بھی میرے چہرے پر حریرہ مل سکیں۔ چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے حریرہ لیا اور میرے چہرے پر مل دیا۔ آپ ﷺ یہ تماشا دیکھ کر ہنستے رہے۔[1]

کوئی اور ہوتا تو ان کی اس حرکت پر ڈانٹتا اور سرزنش کرتا۔ لیکن حضور ﷺ نے انہیں اس چھیڑ چھاڑ سے نہیں روکا' بلکہ یہ دیکھ کر خود بھی محظوظ ہوتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ لوگوں کی زندگی میں خوشیوں کا رنگ بھرنا چاہتے تھے۔ خاص کر عید' بقرعید اور دوسرے خوشی کے مواقع پر۔ مشہور واقعہ ہے کہ عید کے موقع پر کچھ لڑکیاں حضور ﷺ کے گھر میں گانا بجانا کر رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر برہم ہوئے اور انہیں گانے بجانے سے روکنا چاہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکر انہیں گانے' بجانے دو۔ یہ تو عید کا دن ہے۔ ذرا یہودی بھی جان لیں کہ ہمارے دین میں بھی وسعت اور تفریح کے مواقع ہیں۔

کسی موقع پر حضور ﷺ نے بعض حبشیوں کو مسجدِ نبوی کے اندر کھیل تماشا دکھانے کی اجازت دی۔ حضور ﷺ خود بھی یہ کھیل تماشا دیکھتے رہے۔ انہیں جوش دلاتے رہے اور اپنی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے کندھے پر اٹھا کر یہ تماشا دکھاتے رہے۔ وہ لوگ

---

[1] یہ حدیث کتاب ''الفکاہۃ والمزاح'' میں زبیر بن بکار کے حوالہ سے منقول ہے۔

مسجدِ نبوی میں کھیل تماشا دکھاتے رہے، رقص کرتے رہے اور حضور ﷺ نے اس میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کیا۔

روایت ہے کہ کسی لڑکی کی رخصتی ہو رہی تھی۔ رخصتی کے موقع پر کسی کھیل تماشا اور گانے بجانے کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔[1] حضور ﷺ کو یہ بات سخت ناپسند ہوئی اور فرمایا کہ ھَلَّا کَانَ مَعَھَا لَھْوٌ (اس کے ساتھ کھیل تماشے کا انتظام کیوں نہیں ہے) بعض روایت میں حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ تم لوگوں نے اس خوشی کے موقع پر گانے والیوں کو کیوں نہیں بھیجا جو یہ گاتیں:

اَتَیْنَاکُمْ اَتَیْنَاکُمْ فَحَیُّوْنَا نُحَیِّیْکُمْ

''ہم تمہارے پاس آگئے، آگئے۔ تم ہمیں خوش آمدید کہو، ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں''۔

حضور ﷺ کی تربیت میں نشو ونما پانے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ایسے ہی تھے۔ ہنستے ہنساتے اور مذاق کرتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا سخت مزاج انسان بھی ہنسی مذاق کیا کرتا تھا۔ روایت ہے کہ انہوں نے ازراہِ مذاق اپنی لونڈی سے کہا کہ مجھے شریفوں کے خالق نے پیدا کیا ہے اور تمہیں بدمعاشوں کے خالق نے پیدا کیا ہے۔ اس بات پر وہ لونڈی کبیدہ خاطر ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ شریفوں اور بدمعاشوں کے خالق الگ الگ تھوڑے ہی ہیں۔ ان سب کو تو ایک ہی اللہ نے پیدا کیا ہے۔ مجھے اور تمہیں دونوں کو بھی اللہ نے ہی پیدا کیا ہے۔

مشہور تابعی ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مذاق کیا کرتے تھے؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ بھی تو انسان ہی تھے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہم جب آپ

[1] گانے سے مراد آج کل جیسے فلمی گانے نہیں ہیں' بلکہ شادی کے موقع پر جو مہذب اور شائستہ گانے گائے جاتے ہیں' وہ مراد ہیں۔

کے پاس رہتے ہیں تو ہماری ایمانی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے اور جب گھر میں اپنے اہلخانہ کے ساتھ ہوتے ہیں تو کچھ اور ہوتی ہے۔ آپ کے پاس رہتے ہوئے ہمارا ایمانی جوش و جذبہ کچھ زیادہ ہوتا ہے' جبکہ آپ کی محفل سے نکلنے کے بعد اس جذبے میں کمی آ جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اے حنظلہ! اگر تم ایک ہی جیسے حال میں ہمیشہ رہو (وہ ایمانی کیفیت ہمیشہ برقرار رہے جو میرے پاس رہنے سے طاری ہوتی ہے) تو فرشتے تم سے مصافحہ کرنے لگیں' یعنی تم فرشتوں کی صف میں شامل ہو جاؤ' لیکن اے حنظلہ! چند گھڑیاں یوں ہوتی ہیں اور چند گھڑیاں کچھ اس سے مختلف ہوتی ہیں۔ (تم انسان ہو' فرشتے نہیں۔ یقیناً تمہاری کیفیت فرشتوں سے مختلف ہوگی۔ تمہاری چند گھڑیاں سنجیدگی اور حد درجہ ایمانی کیفیت میں گزرتی ہیں تو چند گھڑیاں اس سے مختلف۔ ہنسی مذاق اور پُرلطف ماحول میں بھی گزریں گی)۔

حقیقت یہ ہے کہ چہرے پر خشونت اور باتوں میں روکھا پن لیے ہوئے بعض دیندار حضرات محض اپنی طبیعت اور فطرت کی وجہ سے ایسے ہوتے ہیں۔ اس میں اسلام کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس قسم کے دیندار حضرات سے اسلام سیکھنے کے بجائے' قرآن مجید' آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بہترین عملی نمونوں سے اسلام سیکھیں۔

اب ذرا ان دلیلوں پر نظر ڈال لیں جو آپ نے اپنے سوال میں پیش کی ہیں۔

(۱) پہلی حدیث میں بکثرت اور بہت زیادہ ہنسنے سے منع کیا گیا ہے۔ صرف ہنسنے کی ممانعت نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی چیز کی زیادتی مضر ہوتی ہے۔ خواہ ہنسنے کی زیادتی ہو یا رونے کی یا کسی اور چیز کی۔

(۲) یہ حدیث کہ حضور ﷺ پر ہمیشہ غم کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ایک ضعیف حدیث ہے اور اسے بطورِ دلیل نہیں پیش کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس بخاری شریف کی صحیح حدیث یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنی دعاؤں میں حزن و غم سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے

تھے۔

(۳) جہاں تک قرآن کی آیت لَا تَفْرَحْ ......الخ کا تعلق ہے تو اس میں لفظ فرح سے مراد ہنسا نہیں ہے' بلکہ گھمنڈ کرنا اور اِترانا ہے۔ یہی مفہوم تمام مفسرین نے بیان کیا ہے۔

غرض کہ قرآن و حدیث میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے' جس سے ہنسنے ہنسانے اور مذاق کرنے کی ممانعت ثابت ہو۔ بلکہ اس کے برعکس مذاق کرنا اور ہنسنا ہنسانا ایک جائز کام ہے جیسا کہ حضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عملی نمونوں سے واضح ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی مصیبتوں اور سختیوں کو برداشت کرنے میں ہنسنے ہنسانے والی کیفیت بڑا رول ادا کرتی ہے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے ان القلوب تمل کما تمل الابدان فابتغوا لها طرائف الحكمة ''جس طرح جسم اُکتا جاتے ہیں اسی طرح دل بھی اکتاتے ہیں۔ اس کی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے حکمت سے پُر لطیفے تلاش کیا کرو''۔

اور یہ بھی فرماتے تھے: روحوا القلوب ساعة بعد ساعة فان القلوب اذا كره عمى ''دل کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد آرام اور تفریح دیا کرو کیونکہ دلوں میں اگر کراہیت آ گئی تو دل اندھے ہو جائیں گے''۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کھیل تماشے کے ذریعے اپنے آپ کو طاقت فراہم کرتا ہوں تا کہ حق کے کام کے لیے میں چست اور پھرتیلا رہوں۔

ہنسی مذاق جائز ہے' لیکن حد کے اندر' کیوں کہ کسی بھی چیز کی زیادتی مضر ہوتی ہے۔ ہنسی مذاق کرتے وقت درج ذیل باتوں کا خیال کرنا ضروری ہے:

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ جھوٹی باتیں گھڑ کر لوگوں کو ہنسانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جیسا کہ بعض لوگ یکم اپریل کے دن کرتے ہیں۔ حدیث ہے کہ ''تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں''۔ ایک دوسری حدیث ہے کہ

''حضور ﷺ مذاق کرتے تھے لیکن ہمیشہ سچ بولتے تھے''۔

(۲) ہنسی مذاق کے ذریعے کسی کی تحقیر و تذلیل نہ کی جائے۔ الاّ یہ کہ وہ خود اس کی اجازت دے دے اور اس پر ناراض نہ ہو۔ کسی کی تحقیر کرنا بڑا گناہ ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (الحجرات:۱۱)

''اے ایمان والو! تمہیں چاہیے کہ ایک دوسرے کا ٹھٹھا نہ کرو''۔

اور حدیث ہے:

يَحْسَبُ اِمْرَءٍ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ يُّحَقِّرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمُ (مسلم)

''کسی کے بُرا ہونے کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے''۔

(۳) مذاق میں کسی کو ڈرانے دھمکانے سے پرہیز کیا جائے۔ حدیث ہے: لَايَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ يَّرُوْعَ مُسْلِمًا ''کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو ڈرائے دھمکائے''۔

(۴) ہنسی مذاق میں کسی دوسرے کا سامان نہ ہتھیا لیا جائے' حدیث ہے:

لَايَاْخُذُ اَحَدُكُمْ مَّتَاعَ اَخِيْهِ لَاعِبًا وَّلَا جَادًّا (ترمذی)

''کوئی شخص کسی دوسرے کا سامان نہ ہتھیا لے' نہ مذاق میں اور نہ سنجیدگی سے''۔

(۵) ایسے وقت مذاق نہ کرے جب سنجیدگی کا موقع اور ماحول ہو اور نہ ایسے مقام پر ہنسنا شروع کر دے جہاں رونے کا مقام ہو' کیونکہ ہر کام کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کی زبردست سرزنش کی ہے جو قرآن سنتے وقت ہنسی مذاق کرتے تھے' حالانکہ یہ سنجیدہ رہنے اور رونے کا مقام ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ○ وَتَضْحَكُوْنَ وَ لَاتَبْكُوْنَ ○ وَ اَنْتُمْ

سٰمِدُوْنَ ○ (النجم:۶۱)

''اب کیا یہی وہ باتیں ہیں' جن پر تم اظہارِ تعجب کرتے ہو۔ ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو''۔

حضرت اصمعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک عورت کو بڑے خشوع وخضوع کی حالت میں نماز پڑھتے دیکھا۔ نماز کے بعد وہ عورت آئینہ کے سامنے گئی اور بننے سنورنے لگی۔ حضرت اصمعی رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا' ابھی تو تم خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھ رہی تھیں اور اب بن سنور رہی ہو! اس دین دار عورت نے جواب دیا کہ میں جب خدا کے سامنے کھڑی تھی تو خشوع وخضوع کی حالت میں تھی اور اب اپنے شوہر کے پاس جارہی ہوں تو بن سنور کر۔ ہر کام کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔

(۶) ہنسی مذاق حد کے اندر اور اعتدال کے ساتھ ہو۔ ہنسی مذاق میں پھوہڑ پن نہ ہو کہ یہ چیز بُری لگنے لگے اور نہ بہت زیادہ ہو کہ اس سے اکتاہٹ شروع ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے' خواہ عبادت ہی کی زیادتی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ کثرت سے نہ ہنسا کرو کیونکہ ہنسی کی کثرت دل کو مردہ کر دیتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اعط الکلام من المزاح بمقدار ما تعطی الطعام من الملح یعنی اپنی گفتگو میں اتنا مزاح پیدا کیا کرو جتنا کہ کھانے میں نمک ڈالتے ہو۔

شطرنج

سوال: کیا شطرنج کھیلنا جائز ہے؟ آپ نے اپنی کتاب ''الحلال والحرام فی الاسلام'' میں اسے تین شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ وہ شرطیں یہ ہیں:

(۱) یہ کھیل نماز اور دوسرے فرائض سے غافل نہ کر دے۔

(۲) اس میں جوا نہ شامل ہو۔

(۳) کھیل کے دوران گالم گلوچ نہ ہو۔

میں نے بعض حضرات کو یہ کہتے سنا ہے کہ آپ اپنے فتووں میں کافی نرمی اور سہولت کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ آپ میں چیزوں کو حلال اور جائز قرار دینے کا رجحان زیادہ ہے۔ ان کے مطابق آپ دینی معاملات میں کافی بے پروائی اور سہل پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے قول کے مطابق شطرنج ایک حرام کھیل ہے' جسے آپ نے جائز قرار دیا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں تسلی بخش وضاحت مطلوب ہے۔ مجھے بھی اس کھیل میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی ہے۔ ہم خالی وقتوں میں خوش گپیاں اور عیب جوئی کرنے کی بجائے اس کے ذریعے تفریح حاصل کر لیتے ہیں۔ کیا ہمارا یہ موقف صحیح ہے؟

جواب: کچھ دنوں پہلے بحرین کی ایک فقہی کانفرنس میں' میرے کسی دینی بھائی نے مجھ پر اسی قسم کی تہمت لگائی تھی کہ میں اپنے فتووں میں کافی سہولت پسندی اور نرمی کی طرف مائل ہوں اور یہ کہ میں چیزوں کو ناجائز قرار دینے سے زیادہ انہیں جائز قرار دینے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اسی کانفرنس میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ جو لوگ مجھ پر سہل پسندی کا الزام لگاتے ہیں' ایسا ہی الزام ان پر میں بھی لگا سکتا ہوں کہ وہ اپنے فتووں میں تشدد اور سختی کی طرف مائل ہیں۔ انہیں چیزوں کو جائز اور حلال قرار دینے سے زیادہ حرام اور ناجائز قرار دینے میں دلچسپی ہے۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا حکم یہ ہے کہ دینی احکام میں آسانیاں فراہم کی جائیں اور سختیوں سے پرہیز کیا جائے۔ ملاحظہ کریں نبی کریم ﷺ کی دو حدیثیں:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا (بخاری' مسلم)

''آسانیاں پیدا کرو' مشکلیں اور سختیاں نہیں' اور ایسی باتیں بتاؤ جن سے دل میں اسلام کے لیے رغبت پیدا ہو' ایسی باتیں نہ بتاؤ جن سے اسلام سے دوری اور تنفر پیدا ہو''۔

إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ (بخاری' ترمذی)

''تمہیں آسانیاں فراہم کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، نہ کہ سختیاں اور مشکلیں بنانے والا''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ان میں سے آسان پہلو کو اختیار کیا۔ اسی مفہوم کی دوسری صحیح احادیث اور قرآن کی آیتیں بھی ہیں۔ پھر یہ لوگ آسانی اور نرمی کی بجائے تشدد اور سختی کی طرف میلان کیوں رکھتے ہیں۔ اسلام کا موقف تو یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو چیزوں کو جائز قرار دیا جائے اور حتی الامکان لوگوں پر سے پابندیوں اور سختیوں کا بوجھ کم کیا جائے۔ اللہ فرماتا ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ

(المائدۃ:۱۰۱)

''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم پر ناگوار ہوں''۔

جتنی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا ہے، بس انہیں پر اکتفا کرو۔ خواہ مخواہ کرید کرید کر ایسے سوالات نہ کرو کہ ان کے جواب کی وجہ سے دوسری چیزیں بھی حرام قرار دی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار چیزوں کے معاملے میں خاموشی اختیار کی ہے تاکہ یہ چیزیں ہمارے لیے جائز بنی رہیں۔ یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اپنے بندوں پر۔ اس لیے ہمیں بھی خواہ مخواہ ان چیزوں کے بارے میں تجسس میں پڑ کر انہیں حرام اور ناجائز قرار دینے میں دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهٖ فَهُوَ حَلَالٌ وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ۔ وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَفْوٌ فَاقْبَلُوْا مِنَ اللّٰهِ عَافِيَتَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُنْ يَنْسٰى شَيْئًا ''اللہ نے جس چیز کو اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے، وہ حلال ہے اور جسے حرام قرار دیا ہے وہ حرام ہے، اور جس کے سلسلے میں وہ خاموش ہے، اس کے سلسلے میں چھوٹ ہے، تم اللہ کی اس

چھوٹ کو قبول کرو۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے بارے میں بھول چوک کی وجہ سے خاموش نہیں رہا''۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر غضبناک ہوتا ہے' جو اپنی مرضی سے چیزوں کو حلال یا حرام قرار دیتے ہیں' فرماتا ہے:

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ (یونس:۵۹)

''اے نبی! ان سے کہو کیا تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اتارا تھا' اس میں تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرا لیا۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟''

قرآن و حدیث کے ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ دینی احکام میں آسانیوں کی طرف مائل ہونا اور چیزوں کو حلال قرار دینے میں دلچسپی کا مظاہرہ کرنا ہی اسلام کا موقف ہے اور یہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فقہی معاملات میں لوگوں کی ضرورتوں' زمانے اور علاقے کے حالات اور مزاج کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے مسائل میں سختیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ بات غیر مسلموں کے سامنے ہمارے دین کی غلط تصویر پیش کرتی ہے۔ خود حضور ﷺ نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ مشہور حدیث ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے گھر میں کچھ گانے والی لڑکیوں کو گانا گانے پر ڈانٹا کہ حضور ﷺ کے گھر میں بیٹھ کر تم یہ حرکت کر رہی ہو۔ حضور ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو روکا اور فرمایا کہ انہیں خوشی کے موقع پر گانے دو۔ ذرا یہودی قوم بھی دیکھ لے کہ ہمارے دین میں تفریح کی گنجائش اور وسعت ہے۔ جنوبی افریقہ کے ایک عالم دین نے بھی مجھ پر اسی قسم کا اعتراض کرتے ہوئے ایک مقالہ لکھا تھا۔ لیکن ان کا انداز بہت غیر شائستہ اور تنقیدی آداب و اصول سے محروم تھا۔ ان کے مقالے کو پڑھ کر لگا کہ موصوف کو نہ قرآن کا

صحیح علم ہے اور نہ حدیث کا اور نہ علم فقہ پر ہی انہیں کوئی خاص دسترس ہے۔ وہ اصلاً ہندوستان کے رہنے والے حنفی المسلک تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ تمام علماءِ کرام نے متفقہ طور پر شطرنج کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا کھیلنا گناہ کبیرہ ہے۔ موصوف کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خود حنفی مسلک میں اس کھیل کو اس وقت تک حرام نہیں قرار دیا گیا' جب تک کہ اس میں جوا نہ شامل ہو۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں شطرنج کے سلسلے میں چاروں مسلک کی رائے بیان کر دوں۔

(۱) احناف کی معتبر فقہی کتاب قدوری اور ہدایہ کے مطابق وہ شخص جو شطرنج میں جوا کھیلتا ہے' اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ اس لیے کہ جوا کھیل کر اس نے حرام کام کیا ہے۔ محض شطرنج کھیلنا کوئی ایسا برا کام نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی شہادت ٹھکرا دی جائے۔

(۲) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الروضۃ'' میں شافعی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''شطرنج کھیلنا بعض لوگوں کے نزدیک مکروہ ہے' بعض کے نزدیک جائز ہے اور اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ جو لوگ اسے مکروہ کہتے ہیں' ان کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے''۔ آگے مزید لکھتے ہیں ''اگر شطرنج میں جوا کھیلا جائے یا اس کی وجہ سے نماز میں غفلت ہو جائے یا کسی فحش کام کا ارتکاب ہو جائے تو پھر یہ گناہ ہے اور ایسے شخص کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی''۔

(۳) امام ابنِ رشد اس سلسلے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے شطرنج کے سلسلے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بہت اچھا کام نہیں ہے' لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ یہ اور کھیلوں کی طرح محض کھیل تماشے کی چیز ہے۔ البتہ باریش' دیندار اور بڑی عمر کے لوگوں کو یہ کھیل زیب نہیں دیتا''۔

(۴) ابنِ قدامہ اپنی کتاب ''المغنی'' میں حنبلی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ہر وہ کھیل جس میں جوا شامل کر لیا جائے حرام ہے اور جس میں جوا شامل نہیں

ہے، وہ کھیل حلال بھی ہو سکتا ہے اور حرام بھی۔ رہا شطرنج تو وہ بغیر جوئے کے بھی حرام ہے"۔

یہ ہیں چاروں مسلک کے اقوال۔ بعض اسے جائز قرار دیتے ہیں، بعض مکروہ اور بعض کے نزدیک یہ حرام ہے۔ گویا یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے اور اختلافی مسئلے میں کسی بھی ایک رائے کو اختیار کرنے کی مکمل اجازت ہوتی ہے۔

جو لوگ شطرنج کو حرام قرار دیتے ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) ارشادِ ربانی:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۝

(المائدۃ:۹۰)

"اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو"۔

۲۔ ارشادات نبوی ﷺ:

إِنَّ لِلّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لَوْحًا يَنْظُرُ فِيهِ فِي كُلِّ يَوْمٍ ثَلٰثَمِائَةٍ وَسِتِّينَ نَظْرَةً لَيْسَ لصاحب الشاه منها نصيب۔

"اللہ تعالیٰ ہر دن تین سو ساٹھ دفعہ اپنے بندوں پر نظر ڈالتا ہے۔ اس میں سے کوئی بھی نظر بادشاہ والے (شطرنج کھیلنے والے) کے لیے نہیں ہے"۔

الا ان اصحاب الشاه فی النار الذین یقولون قتلت واللّٰه شاهك

"سن لو! بادشاہ والے (شطرنج کھیلنے والے) جہنم میں جائیں گے۔ جو یہ کہتے ہیں بخدا میں نے تمہارے بادشاہ کو مار ڈالا"۔

ملعون من لعب الشطرنج

''شطرنج کھیلنے والے پر لعنت ہے''۔

(۳) جس طرح نردشیر کھیلنا متفقہ طور پر حرام ہے اسی طرح شطرنج کھیلنا بھی حرام ہے' کیونکہ دونوں کھیل ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔

(۴) بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کھیل کو پسند نہیں فرمایا۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب اس کھیل کو دیکھا تو فرمایا: ''مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ'' یہ کن مورتیوں پر تم گرے پڑ رہے ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اوپر بیان کیے گئے تمام دلائل کمزور اور ناقابلِ قبول ہیں۔

سورۂ مائدہ کی جس آیت کو بطورِ دلیل پیش کیا گیا ہے اس میں جوئے اور شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت میں یہ بات تو نہیں ہے کہ شطرنج کھیلنا جوا ہے۔ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ شطرنج بغیر جوئے کے بھی کھیلا جاتا ہے۔ اس آیت میں جوئے کی حرمت ہے نہ کہ شطرنج کی۔

شطرنج کی حرمت کے سلسلے میں جتنی حدیثیں بطورِ دلیل پیش کی گئیں وہ سب ضعیف اور موضوع ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی حدیث دلیل نہیں بن سکتی۔ واضح رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب قوم شطرنج کے کھیل سے ناواقف تھی۔ اسلامی فتوحات کے بعد یہ کھیل ہندوستان اور ایران سے ہوتا ہوا عربوں میں آیا۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے شطرنج کو حرام قرار دینے کے باوجود ان بے سند احادیث کو بطورِ دلیل نہیں پیش کیا ہے۔ ان کی دلیل صرف یہ ہے کہ یہ کھیل نماز اور دوسرے فرائض سے غافل کر دیتا ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ شطرنج کا کھیل نردشیر سے مشابہ ہے۔ ان دونوں کھیلوں میں نمایاں فرق ہے۔ شطرنج میں دماغ اور ذہانت کا استعمال ہوتا ہے اور اس میں کافی حد تک سنجیدگی اور شائستگی ہوتی ہے' جبکہ نردشیر ایک گھٹیا اور پھوہڑ کھیل ہے' جس میں عقل و ذہانت کا کوئی کام نہیں ہے اور اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حرام قرار دیا ہے۔

شطرنج سے متعلق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جن اقوال کو نقل کیا گیا ہے ان میں سے کوئی بھی قول باوثوق ذرائع سے ثابت نہیں ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "ارواء الغلیل" میں تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قول صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت نہیں ہے۔ بالفرض اگر تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شطرنج کو دیکھ کر یہ بات کہی تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں ذاتی طور پر یہ کھیل پسند نہیں آیا۔ کیونکہ اگر یہ کھیل حرام ہوتا تو آگے بڑھ کر بزورِ قوت وہ اس کھیل کو روک دیتے کیونکہ وہ خلیفۂ وقت تھے۔

اس کے برخلاف جو بات باوثوق ذرائع سے مروی ہے۔ وہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خود بھی اس کھیل سے متعلق مختلف رائے رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ وغیرہم کے نزدیک یہ کھیل ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔ جبکہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ کھیل مباح اور جائز ہے۔ حافظ ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ بہت سارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شطرنج کھیلتے تھے۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شطرنج کو حرام قرار دینے کے لیے کوئی واضح اور مضبوط دلیل نہیں اور بغیر کسی واضح دلیل کے کسی بھی چیز کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دوسرے کھیلوں کی طرح شطرنج بھی تفریح کا ایک ذریعہ ہے اور اس بات میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ جائز تفریح کی ضرورت سبھی کو ہوتی ہے۔ اپنے فارغ اور خالی وقت میں اگر کوئی شخص تفریح کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے شطرنج کھیل لیتا ہے تو یہ اس بات سے بہت بہتر ہے کہ وہ اپنا فارغ وقت غیبت یا کسی دوسرے فضول مشغلے میں گزار دے۔

شطرنج کے سلسلے میں میرا موقف یہ ہے کہ یہ ایک جائز کھیل ہے بشرطیکہ:

(۱) اس میں جوا نہ شامل ہو۔ اس لیے کہ جوا گناہِ کبیرہ اور حرام ہے۔

(۲) نماز اور دوسرے فرائض سے غافل نہ کر دے۔ خواہ یہ فرائض دُنیوی ہی کیوں نہ ہوں۔

(۳) کھیل کے دوران گالم گلوچ اور فحش باتوں سے اجتناب کیا جائے۔

(۴) عوامی جگہوں پر بیٹھ کر نہ کھیلا جائے۔ اس لیے کہ یہ بات شرافت کیخلاف ہے۔

(۵) اعتدال کے ساتھ اور حد میں رہ کر کھیلا جائے۔ حد سے زیادہ کھیلنا اور اس کا عادی ہو جانا صحیح نہیں ہے۔

گانا اور موسیقی

سوال: اسلام میں گانے اور موسیقی (میوزک) کا کیا حکم ہے؟

جواب: گانے اور موسیقی کے سلسلے میں لوگ اکثر سوال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف رائیں ہیں۔ بعض لوگ ہر طرح کے گانے اور ہر طرح کی موسیقی کو شوق سے سنتے ہیں اور اسے ان مباح چیزوں میں شمار کرتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے حلال قرار دیا ہے۔ جبکہ کچھ لوگ ہر طرح کی موسیقی اور ہر طرح کے گانے کو حرام تصوّر کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں گانا شیطان کی بانسری ہے اور ایسا لہو ولعب ہے' جو اللہ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے۔ گانے والی اگر عورت ہو تو اس کی حرمت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک تیسرا گروہ ہے' وہ دونوں ہی گروہوں کی طرف مائل نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گانا اور موسیقی آج کے دور کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ روز مرہ کی زندگی میں یہ دونوں چیزیں کچھ اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ان سے صرف نظر کرنا بہت مشکل ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ شاید ہی کوئی گھر ریڈیو یا ٹی وی سے خالی ہو۔ ایسی صورت میں ہم صرف یہ فتویٰ دے کر جان نہیں چھڑا سکتے کہ گانا اور میوزک حرام ہے۔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پوری سنجیدگی اور غیر

جانبداری کے ساتھ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر تحقیق کر کے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا حل تلاش کریں۔

اسلامی شریعت کا ایک متفقہ اصول یہ ہے کہ بنیادی طور پر ہمیں ہر چیز کو جائز اور حلال تصور کرنا چاہئے۔ سوائے ان چیزوں کے جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے واضح طور پر حرام قرار دے دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرۃ:۲۹)

''اسی نے تمہاری خاطر زمین کی ساری چیزیں تخلیق کی ہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہی واسطے اور ہمارے ہی استعمال کے لیے دنیا کی تمام چیزیں بنائی ہیں' اس لیے اصولی طور پر تمام چیزیں ہمارے لیے حلال ہیں۔ البتہ وہ چیزیں حرام قرار دی جائیں گی جنہیں اللہ نے واضح طور پر حرام قرار دے دیا ہے۔ کوئی چیز اگر واضح طور پر قرآن و حدیث میں حرام نہیں ہے تو پھر ہمیں اسے حرام قرار دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو گناہگار ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ بات اللہ کی مرضی کیخلاف ہوگی۔ کسی شے کو حرام یا حلال قرار دینا صرف اللہ کا حق ہے۔ ہمارا اور آپ کا نہیں۔ کسی چیز کو اگر اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اصلاً حلال اور جائز ہے۔ اسی لیے فقہاءِ کرام کہتے ہیں کہ کسی شے کو حلال ثابت کرنے کے لیے دلیل پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن اسے حرام ثابت کرنے کے لیے دلیل ضروری ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم انسانوں کے لیے جو چیزیں حرام ہیں' اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنّت میں ان کی وضاحت کر دی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ ؕ

(الانعام:۱۱۹)

''حالانکہ اللہ نے تمہارے لیے ان سب چیزوں کی تفصیل بیان کر دی ہے' جو اس نے تم پر حرام کی ہیں' سوائے یہ کہ تم حالتِ اضطرار میں ہو''۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فِیْ کِتَابِہٖ فَهُوَ حَلَالٌ وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ وَمَا سَکَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَفْوٌ فَاقْبَلُوْا مِنَ اللّٰهِ عَافِيَتَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ یَکُنْ لِیَنْسٰی شَیْئًا (حاکم)

''اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جسے حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہے اور جسے حرام قرار دیا ہے وہ حرام ہے' اور جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے وہ اس کی طرف سے چھوٹ ہے۔ تو اللہ کی اس چھوٹ کو قبول کرو' کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ اس کا حکم بیان کرنا بھول گیا''۔

اس اصول کی بنیاد پر ہمیں دیکھنا ہوگا کہ قرآن و حدیث میں گانے اور موسیقی کی حرمت کی صراحت ہے یا نہیں ہے۔ اگر واقعی قرآن و حدیث میں انہیں صراحت کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے تو ان کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ان کے حلال ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ جو لوگ گانے اور موسیقی کو حرام قرار دیتے ہیں' وہ قرآن و حدیث سے مندرجہ ذیل دلیلیں پیش کرتے ہیں:

(۱) پہلی دلیل یہ ہے کہ بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ گانے کو حرام تصور کرتے تھے' کیونکہ اللہ کا فرمان ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○

(لقمان:۶)

''اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو کلام دلفریب خرید کر لاتے ہیں تاکہ اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں بغیر کسی علم کے اور اللہ کے راستے کا مذاق اڑائیں۔ ان لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے''۔

اس آیت میں ''لھو الحدیث'' کی تشریح کرتے ہوئے یہ حضرات فرماتے ہیں

کہ اس سے مراد گانا ہے' لیکن اگر ہم آیت کے سیاق وسباق پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں گانے کو حرام قرار دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور نہ لھو الحدیث سے مراد گانا ہی ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مذمت کر رہا ہے اور انہیں سخت عذاب کی دھمکی دے رہا ہے جو محض لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ''لھو الحدیث'' اختیار کرتے ہیں۔ لھو الحدیث کا مفہوم ہے فضول اور بے کار بات۔ کسی کو گمراہ کرنے کے لیے اگر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کو استعمال کیا جائے تب بھی یہ عمل قابلِ مذمت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں ''لھو الحدیث'' پر سرزنش نہیں کی گئی ہے' بلکہ گمراہ کرنے کے عمل کو قابلِ مذمت قرار دیا گیا ہے۔

اس آیت سے یہ مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ گانا سننا حرام ہے۔ علامہ ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت کی بنیاد پر گانے کو حرام قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ محض چند صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اپنی ذاتی رائے تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی رائے کو بطورِ دلیل نہیں پیش کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی اس رائے سے اختلاف رکھتے تھے۔

(۲) گانے کو حرام قرار دینے کے لیے یہ لوگ قرآن کی اس آیت کو بھی بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں:

وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (القصص:۵۵)

''اور جب وہ بیہودی گفتگو سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں''۔

چونکہ گانا لغو میں شامل ہے اس لیے مومنین کو اس کے سننے سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں بھی اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ گانا لغو میں شامل اور حرام ہے۔ اس آیتِ میں لغو سے مراد گالم گلوچ' فضول گوئی اور لڑائی جھگڑے کی

باتیں ہیں۔یعنی جب کوئی شخص ان مؤمنین سے گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑے پر اتر آتا ہے تو یہ مؤمنین ان سے الجھنے کے بجائے درگزر کر کے اپنی راہ لیتے ہیں۔اور اگر بالفرض لغو سے مراد گانا تسلیم کرلیں تب بھی اس آیت میں یہ بات نہیں ہے کہ لغو حرام ہے' بلکہ صرف اتنی سی بات ہے کہ مؤمنین اس سے پرہیز کرتے ہیں۔کسی شے سے پرہیز کرنا اور بات ہے اور اس کا حرام ہونا بالکل دوسری بات ہے کوئی ضروری نہیں کہ ہر لغو بات گناہ ہو۔ بعض لغو باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر اللہ گرفت نہیں کرتا' ملاحظہ کریں:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ (المائدۃ:۸۹)

''تم جو لغو قسم کی قسمیں کھالیتے ہو' اللہ ان پر گرفت نہیں کرتا''۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا مؤاخذہ نہیں کرے گا' جو لغو طریقے سے اللہ کے نام کی قسم کھاتے ہیں تو ان لوگوں کا مؤاخذہ کیسے کرے گا' جو اشعار کو نغموں اور گانوں کی شکل میں گاتے اور سنتے ہیں۔

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔اس لیے جو شخص گمراہی اور اللہ کی نافرمانی کے لیے گانا بجانا کرتا ہے' وہ فاسق ہے۔اس لیے کہ اس کی نیت اللہ کی نافرمانی ہے' لیکن محض تفریح' سکون اور ذہنی نشاط کے لیے گانے گانا یا سننا گناہ نہیں ہے اور جو شخص اس نیت کے ساتھ نغمے سنتا ہے کہ وہ تازہ دم ہو کر اللہ کی عبادت بہتر طور پر کر سکے۔اس کا یہ عمل باعثِ اجر و ثواب ہے۔

(۳) گانے کو ناجائز قرار دینے والوں کی دلیل بخاری شریف کی یہ حدیث بھی ہے:

لَيَكُوْنَنَّ قَوْمٌ مِّنْ اُمَّتِيْ يَسْتَحِلُّوْنَ الْحِرَّ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ (بخاری)

''میری اُمت میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو زنا' ریشم' شراب اور گانے

بجانے کو حلال کرلیں گے''۔

لیکن یہ حدیث بھی بطورِ دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس لیے کہ بخاری شریف میں ہونے کے باوجود علماءِ حدیث اسے ''معلق'' شمار کرتے ہیں اور اس بنا پر یہ ضعیف حدیث ہے اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینے کے لیے ضعیف حدیث کو بطورِ دلیل نہیں پیش کیا جاسکتا۔

(۴) ان کی دلیل یہ حدیث بھی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ الْقَيْنَةَ وَبَيْعَهَا وَ ثَمَنَهَا وَ تَعْلِيْمَهَا (روح المعانی سورۃ لقمان)

''اللہ تعالیٰ نے گانے بجانے والی لونڈیوں کی خرید و فروخت اس سے حاصل شدہ رقم اور اس کی تعلیم کو حرام قرار دیا ہے''۔

لیکن یہ حدیث بھی ضعیف ہے اس لیے بطورِ دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔ خاص کر اس حالت میں کہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے لڑکیوں کو گاتے بجاتے سنا اور انہیں منع نہیں فرمایا۔ اس حدیث کا تذکرہ آگے چل کر آئے گا۔

(۵) ان کی دلیل یہ روایت بھی ہے ان الغناء ينبت النفاق في القلب ''گانا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے''۔

لیکن یہ کوئی حدیث نہیں ہے کہ اسے بطورِ دلیل پیش کیا جاسکے۔ یہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور یہ ان کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کی ذاتی رائے سے اتفاق کریں۔ عملی طور پر بھی ہم مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ گانا دل میں نفاق پیدا نہیں کرتا بلکہ اس سے دل میں تازگی اور ذہن میں نشاط پیدا ہوتا ہے۔

(۶) ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ عورت کی آواز پردہ ہے اس لیے عورت کا گانا سننا حرام ہے۔ یہ ایک بوگس دلیل ہے' کیونکہ اسلامی شریعت میں کہیں یہ بات نہیں آئی کہ عورت کی آواز پردہ ہے اور اس کا سننا حرام ہے' بلکہ اس کے برعکس صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے لڑکیوں کو گاتے سنا اور انہیں منع نہیں فرمایا۔

خلاصہ کلام یہ کہ گانے کو حرام قرار دینے والے اپنی رائے کے حق میں جتنی دلیلیں پیش کرتے ہیں، وہ یا تو گانے کی حرمت کے سلسلے میں صریح اور واضح نہیں ہیں یا پھر صحیح اور ثابت نہیں ہیں۔ علامہ قاضی ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الاحکام'' میں کہتے ہیں کہ گانے کو حرام قرار دینے والی کوئی دلیل صحیح اور ثابت نہیں ہے۔ علامہ ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ گانے کی حرمت ثابت کرنے کے لیے جتنی احادیث پیش کی جاتی ہیں، وہ سب کی سب ضعیف اور موضوع ہیں۔

جائز قرار دینے والوں کی دلیلیں

ہم واضح کر چکے ہیں کہ بنیادی طور پر ہر چیز حلال ہے۔ سوائے اس چیز کے جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے واضح طور پر حرام قرار دیا ہو۔ اس لیے کسی چیز کے حرام ہونے کے لیے دلیل پیش کرنا تو ضروری ہے، لیکن اس کے حلال ہونے کے لیے دلیل پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اسے حرام نہیں قرار دیا ہے۔ اوپر کی گفتگو میں ہم نے واضح کیا ہے کہ گانے کو حرام قرار دینے کے لیے جتنی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، وہ سب ضعیف اور غیر ثابت شدہ ہیں۔ اس لیے گانے کو حلال قرار دینے کے لیے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ہم بعض دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

قرآن وحدیث سے دلائل

اللہ کا فرمان ہے:

وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَ اۨنْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

(الجمعۃ:۱۱)

''اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف

لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ سب سے بہترین رزق دینے والا ہے''۔

اس آیت میں لہو ولعب اور تجارت دونوں کا تذکرہ ایک ساتھ ہے۔ اس میں ان دونوں چیزوں کی مذمت محض اس وجہ سے کی گئی ہے کہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جمعہ کا خطبہ چھوڑ کر ان میں مشغول ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ جمعہ کا خطبہ نہ چھوڑتے تو نہ تجارت پر ان کی مذمت ہوتی اور نہ لہو پر۔

بخاری شریف میں یہ مشہور واقعہ درج ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کچھ لڑکیاں بیٹھ کر گا رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں گانے سے روکنا چاہا اور کہنے لگے ''کیا شیطان کی بانسری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بجائی جا رہی ہے؟'' اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے ساتھ گا رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ ایسا کرنا اور وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں گناہ ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کو گانے سے روکنے کی بجائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ انہیں گانے دو۔ ذرا یہودی بھی جان لیں کہ ہمارے دین میں بھی تفریح اور وسعت ہے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کو گانے دیا اور اس بنا پر یہ ایک جائز چیز ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم دوسری قوموں کی نظر میں دینِ اسلام کی تصویر کو بہتر اور عمدہ بنانے کی کوشش کریں۔

بخاری شریف ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ ایک لڑکی کی رخصتی ہو رہی تھی اور اس خوشی کے موقع پر کسی گانے بجانے کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ کوئی گانا بجانا کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ انصار کو تو گانا بجانا بہت پسند ہے۔ نسائی اور حاکم کی صحیح حدیث ہے کہ حضرت عامہ بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

میں ایک شادی کی تقریب میں قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ وہاں کچھ لڑکیاں گانا گا رہی تھیں۔ انہوں نے ان دونوں سے پوچھا "اے رسول اللہ کے ساتھیو! تمہاری نگاہوں کے سامنے یہ سب ہو رہا ہے؟" ان دونوں نے جواب دیا کہ تمہیں گانا سننا ہے تو سنو۔ نہیں سننا ہے تو جاؤ' شادی بیاہ کے موقع پر گانا بجانا جائز ہے۔

ان کے علاوہ متعدد صحیح احادیث ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گانا حلال اور جائز ہے۔

عقلی دلیل

ذرا آپ غور کریں کہ گانا کیا چیز ہے؟ گانا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ یہ ایک عمدہ اور خوشگوار شے ہے' جس کا سننا اچھا لگتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں گانا کان کی عمدہ غذا ہے۔ اسی طرح جس طرح کھانا پیٹ کی غذا ہوتا ہے' اچھے مناظر آنکھوں کی غذا ہوتے ہیں اور اچھی خوشبو ناک کی غذا ہوتی ہے۔ جس طرح خوشبو اور بھلے مناظر حرام نہیں ہیں۔ اسی طرح کانوں کی غذا (گانا) بھی حرام نہیں ہونی چاہیے۔ اسلام کا مزاج یہ نہیں ہے کہ اچھی بھلی چیزوں کو حرام قرار دے۔ بعض لوگ اور خاص کر سخت گیر قسم کے لوگ اسلام کے سلسلے میں یہ انتہائی غلط تصوّر رکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو عمدہ لگے اور اس میں مزہ آئے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے۔ یہ تصوّر صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر عمدہ اور بھلی چیز کو ہمارے لیے حلال قرار دیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ (المائدۃ:۴)

"یہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا چیزیں حلال کی گئی ہیں۔ ان سے کہو کہ تمہارے لیے عمدہ اور بھلی چیزیں حلال کی گئی ہیں"۔

کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام یا حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دے۔

مزید یہ کہ گانا سننا اور اس سے محظوظ ہونا بالکل فطری (Natural) بات ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ بچہ جب روتا ہے تو ماں اسے لوری گا کر چپ کراتی ہے۔ گانے کی طرف مائل ہونا اور اس کی خواہش کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ وہ انسان کی فطری ضرورتوں پر مکمل پابندی نہیں لگاتا ہے۔ علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو فطرت کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے نہ کی فطرت کو بدلنے اور اس پر روک لگانے کے لئے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض حبشی جب مسجدِ نبوی میں کھیل تماشے دکھا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع نہیں کیا بلکہ خود بھی کھیل تماشا دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اپنے ساتھ دکھاتے رہے اور اتنی دیر تک دیکھتے اور دکھاتے رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود فرماتی ہیں کہ میں اکتا گئی۔ گانا اگر لہو ولعب ہے تو اسلام نے ہر قسم کے لہو ولعب کو نہیں حرام قرار دیا ہے۔ بلکہ بعض لہو ولعب مباح اور جائز بھی ہیں جیسا کہ مذکورہ حدیث سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ نبوی کے اندر کھیل تماشے دکھانے کی اجازت دی۔ انسان ہمیشہ سنجیدہ نہیں رہ سکتا۔ لہو ولعب کی طرف مائل ہونا ایک فطری بات ہے۔ سنجیدگی کے ماحول سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے تفریح حاصل کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ جبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "یَا حَنْظَلَةُ! سَاعَةً وَسَاعَةً" (اے حنظلہ چند گھڑی نہایت سنجیدگی کے ماحول میں گزرتی ہے اور چند گھڑی اس سے مختلف ماحول میں) انسان ایک جیسے موڈ میں ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ اسے بھی جائز تفریح کی اشد ضرورت ہے۔ یہی وہ معتدل اور متوازن طریقۂ زندگی ہے جس کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ حدیث میں اشارہ کیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

روحوا القلوب ساعة بعد ساعة فان القلوب اذا اكرهت عميت

''دلوں کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تفریح پہنچایا کرو کیونکہ دلوں میں اکتاہٹ آ جائے تو دل اندھے ہو جاتے ہیں''۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میں تھوڑی دیر کے لیے لہو ولعب میں مشغول رہتا ہوں تاکہ ان کے ذریعے تازہ دم ہو کر نیک کاموں کے لیے چست اور پھرتیلا ہو سکوں۔

یہ ہیں وہ بعض دلیلیں جو گانے کے جواز کے حق میں پیش کی جاتی ہیں اور یہ دلیلیں کافی مضبوط اور صریح ہیں۔ ان دلائل کی مضبوطی کی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین اور فقہاءِ کرام کی اکثریت گانے کو مباح اور جائز تصوّر کرتی تھی۔ چنانچہ مدینے کے لوگ اپنے زہد و تقویٰ میں مشہور ہونے، اہلِ ظاہر قرآن و سنّت کے ظاہری الفاظ پر عمل کرنے اور صوفیاءِ کرام دُنیوی لذات سے بے نیاز رہنے کے باوجود گانے کو جائز اور حلال سمجھتے تھے۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب ''نیل الاوطار'' میں رقمطراز ہیں کہ اہلِ مدینہ اور اہلِ ظاہر گانے کو جائز سمجھتے ہیں خواہ یہ گانا عود (ستار) کی موسیقی کے ساتھ ہو۔ امام الحرمین فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس چند لونڈیاں تھیں جو عُود (ستار) پر گانا گایا کرتی تھیں اور عبداللہ بن زبیرؓ انہیں سنتے تھے۔ مشہور تاریخ دان ابوالفرج اصفہانی لکھتے ہیں کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض اشعار ستار پر بجا کر سنے۔ اہلِ مدینہ اس بات پر متفق ہیں کہ ستار کا بجانا جائز ہے۔ مالک بن انس رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ معازف (موسیقی کے آلات) مباح اور جائز ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سارے تابعین مثلاً قاضی شریح، سعید بن المسیّب، عطاء بن ابی رباح، امام زہری اور امام شعبی وغیرہ گانے کو حلال اور جائز تصوّر کرتے تھے۔ یہ تمام لوگ موسیقی کے ساتھ بھی گانے کو مباح سمجھتے تھے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ بغیر موسیقی کے گانے کے جائز ہونے پر تو تمام لوگ متفق ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف میں متعدد صحابہؑ کرام اور تابعین کے نام گنائے ہیں جو گانے کو مباح سمجھتے تھے۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ،

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہم۔ تابعین و تبع تابعین میں سے انہوں نے سعید بن المسیّب' قاضی شُریح' سعید بن جبیر' زہری' امام ابوحنیفہ' شافعی اور مالک وغیرہم کے نام گنائے ہیں' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر طرح کے گانے جائز ہیں اور ہر طرح کی موسیقی مباح ہے۔ اسے جائز اور مباح سمجھنے کے بعد چند باتوں کی رعایت ضروری ہے:

(۱) گانے کے بول اسلامی تعلیمات و آداب کے خلاف نہ ہوں۔ مثلاً گانے میں شراب اور زنا وغیرہ سے دلچسپی کا اظہار نہ ہو یا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا دینِ اسلام کی مخالفت میں کوئی بات نہ کہی گی ہو یا ظالموں اور فاسقوں کی مدح سرائی نہ کی گئی ہو۔ گانے کے مباح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ گانے کے بول بھی جائز اور مباح ہوں۔

(۲) ان کی ادائی کا طریقہ بھی شائستہ اور اسلامی آداب کے مطابق ہو۔ ناز و ادا کے ساتھ یا رقص کے ساتھ گانا جائز نہیں ہے۔ خواہ اس کے بول جائز اور مباح ہی کیوں نہ ہوں۔

(۳) جذبات کو بھڑکانے والے اور انسان کو محبت میں مست رکھنے والے گانے درست نہیں ہیں۔

(۴) گانوں کے ساتھ شراب و شباب کی آمیزش نہ ہو۔ ایسی محفلیں نہ ہوں جہاں شراب پی جارہی ہو اور مردوں اور عورتوں کا باہم اِختلاط ہو۔

یہاں ایک بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ پرانے زمانے میں ریڈیو وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے گانا سننے کے لیے ضروری تھا کہ گانے کی محفلوں میں شرکت کی جائے' جہاں عام طور پر شراب و شباب کا انتظام ہوا کرتا تھا۔ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ یہ محفلیں ناجائز باتوں سے پاک ہوں۔ البتہ آج کے دور میں انسان ان محفلوں میں شرکت کیے بغیر گھر بیٹھے ریڈیو اور دوسرے ذرائع سے گانے سن سکتا ہے اور اس میں بلاشبہ گانا سننے والوں کے لیے گنجائش کا پہلو نکلتا ہے۔

(۵) زندگی صرف محبت' تفریح اور مستی کا نام نہیں ہے۔ گانے وغیرہ کے ذریعے تفریح حاصل کرنا جائز ہے' لیکن ہر وقت تفریح اور مستی حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ ساری توجہ ہمیشہ فرائض کی انجام دہی اور اہم کاموں کی تکمیل کی طرف ہونی چاہیے۔ ہماری زندگی کو بامقصد ہونا چاہیے۔ البتہ کبھی کبھار ان جائز چیزوں سے تفریح حاصل کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۶) انسان کا قلب وضمیر سب سے بڑا مفتی اور جج ہوتا ہے۔ وہ حق وناحق کا فیصلہ خود بھی کر سکتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ان جائز چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے ضمیر کو ٹٹولتا رہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان جائز چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ ناجائز چیزوں کا بھی مرتکب ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے ان ناجائز باتوں سے فوری پرہیز کرنا چاہیے۔

آخر میں' میں علماءِ کرام کو ایک نہایت اہم بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ خاص کر ان علماءِ کرام کو جو لفظ حرام کو کھیل اور مذاق تصور کرتے ہیں اور اپنے فتووں میں بڑی آسانی کے ساتھ کسی بھی چیز کو حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ کسی چیز کو حرام قرار دیتے ہوئے انہیں اللہ کا خوف دامن گیر ہونا چاہیے۔ لفظِ حرام کوئی معمولی لفظ نہیں ہے۔ کسی شے کو حرام قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس کے بارے میں اللہ کا حکم سناتے ہوئے اس پر پابندی لگا دی ہے۔ اگر واقعی یہ چیز اللہ کی نظر میں حرام نہ ہوئی تو آپ اللہ پر افترا پردازی کے گناہگار ہوں گے۔

جیسا کہ اللہ فرماتا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۞ (النحل:۱۱۶)

''اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگاتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ

حرام۔ تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پائیں گے"۔

کسی چیز کو حرام قرار دینا اتنا آسان معاملہ نہیں ہے کہ آپ محض اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے یا محض اندازے کی بنیاد پر یا کسی ضعیف حدیث کی بنیاد پر کسی شے کو حرام قرار دیں۔ جب تک کہ اس کی حرمت ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی واضح اور صریح دلیل موجود نہ ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے لیے اس بات سے سخت اور کوئی بات نہیں ہے کہ مجھ سے کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں پوچھا جائے۔ اس لیے کہ کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اور یہ کام انتہائی ذمّے داری کا ہے۔

سلفِ صالحین کا منہج یہ رہا ہے کہ وہ کسی شے کو حرام کہنے کی بجائے یہ کہتے تھے کہ میری رائے میں یہ چیز نامناسب ہے یا ناپسندیدہ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردِ رشید تھے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے اہلِ علم و مشائخ اپنے فتووں میں یہ کہنے سے گریز کرتے تھے کہ فلاں چیز حرام ہے یا فلاں چیز حلال۔ محض اندازے کی بنیاد پر یا اپنے مخصوص اور سخت گیر مزاج کی وجہ سے کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دینا سلفِ صالحین کا طریقہ نہیں رہا ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اس بات کا خاص خیال رکھیں۔

طیاروں اور اشخاص کا اغوا

سوال: آپ نے خبروں میں اس کویتی طیارے کے بارے میں پڑھا ہوگا، جسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس میں سوار بے گناہ بوڑھے، بچے اور عورتیں مسلسل سولہ دنوں تک خوف و ہراس کی حالت میں رہے۔ بلکہ اغوا کنندگان نے بعض معصوموں کی جان بھی لے لی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اغوا کنندگان اپنے بارے میں متقی اور پرہیزگار ہونے کی بھی نمائش کر رہے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے طیارے کا اغوا اچھے اور نیک مقصد کے لیے کیا ہے۔ وہ نماز کے وقت نمازیں پڑھتے تھے' روزے بھی رکھتے تھے اور ان کی زبانیں ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتی تھیں۔

براہِ کرم رہنمائی فرمائیں کہ اس صورتِ حال میں اسلام کا کیا موقف ہے؟ کیا واقعی کسی اچھے اور نیک مقصد کے لیے اغوا جیسا گھناؤنا جرم کیا جا سکتا ہے؟ کن گناہوں کی پاداش میں انہوں نے مسافروں کو اغوا کیا اور ان میں سے بعض کی جان لے لی؟ کیا اسلام اس طرح بے گناہوں کو ڈرانے' دھمکانے اور ان کی جان لینے کی اجازت دیتا ہے؟

جواب: بلاشبہ میں نے اور میرے جیسے ان کروڑوں مسلمانوں نے جن کا دل ابھی پتھر نہیں ہوا ہے' مذکورہ واقعے سے سخت اذیّت محسوس کی تھی۔ میں نے اپنے خطبوں اور ٹی وی کے پروگراموں میں اس حرکت کی سخت مذمت بھی کی تھی۔ بے گناہ افراد پر ظلم' گناہ اور جرم ہے خواہ وہ کسی بھی دین یا کسی بھی قوم وملت سے تعلق رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ظلم و زیادتی کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس معاملے میں یہودیوں کی طرح اسلام کے دو پیمانے نہیں ہیں۔ یہودی قوم یہودیوں پر ظلم وزیادتی کو برداشت نہیں کرتی لیکن خود دوسروں پر ظلم وزیادتی کرنے میں کوئی گناہ محسوس نہیں کرتی۔

میں اسلام کے چند بنیادی اصول پیش کرتا ہوں تا کہ اسلامی قوانین کی روشنی میں آپ کو اپنے سوال کا جواب مل سکے:

(۱) بے گناہوں پر ظلم وزیادتی کرنا حرام ہے۔ اسلام کسی بے گناہ انسان پر ظلم و زیادتی کو کسی بھی صورت میں جائز نہیں قرار دیتا۔ خواہ بے گناہ شخص مسلم ہو یا غیر مسلم یا اس کا تعلق کسی بھی ملک یا قوم وملت سے ہو۔ زیادتی کرنے والا اگر خلیفۂ وقت بھی ہو تب بھی اسلام اسے برداشت نہیں کرتا۔ اس بات کو حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع

پر صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ جنگ کے دوران بھی اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ بے گناہ شہریوں مثلاً بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کی جان لی جائے۔ یہاں تک کہ اس پادری اور پنڈت کی جان لینا بھی جائز نہیں ہے' جو جنگ سے کنارہ کش ہو کر کنیسا یا مندر میں بیٹھ کر عبادت میں مشغول ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض انصاف پسند تاریخ دانوں نے اعتراف کیا ہے کہ تاریخ نے مسلمانوں سے زیادہ رحمدل فاتح نہیں دیکھا ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ زیادتی صرف انسانوں ہی پر نہیں' بلکہ جانوروں پر بھی جائز نہیں ہے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ ایک عورت محض اس وجہ سے جہنم کی حقدار ہو گئی کہ اس نے ایک بلی کو گھر میں قید کر دیا' نہ اسے کھانا دیا اور نہ گھر سے باہر جانے دیا کہ خود سے کچھ کھا پی لے' یہاں تک کہ بلی بھوک سے مر گئی۔

ذرا غور کیجئے کہ ایک بلی کو بلا وجہ قید کرنا اور اس کو اذیت دینا اتنا بڑا جرم ہے تو ان لوگوں کا جرم کس قدر بھیانک ہوگا' جنھوں نے بے گناہ مسافرین کو طیارے کے اندر قید کر دیا۔ انہیں خوف و ہراس میں مبتلا کیا اور ان میں سے بعض کی جان لے لی۔

(۲) ہر شخص اپنے گناہ کا خود ذمّے دار ہے۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (النجم:۳۸)

''کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا''۔

بلاشبہ اسلام کے اصولوں میں سے ایک واضح اصول یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمّے دار ہے۔ اگر کسی نے غلطی کی ہے تو اس کی غلطی کی سزا اس کے باپ یا بھائی کو نہیں دی جائے گی۔ یہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ طیارے کے اغوا کنندگان خود کو متقی اور پرہیزگار ظاہر کرنے کے باوجود اسلام کے اس واضح حکم سے کھلا انحراف کر رہے تھے۔ انہوں نے حکومت سے اپنے مطالبات منوانے اور اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے بے گناہ مسافروں پر ظلم کیا اور ان کی جان لی۔ حالانکہ یہ مسافر بالکل بے قصور تھے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ایسا بھیانک جرم وہ اسلام کے نام پر کر رہے

تھے۔ بلاشبہ ایسے لوگ مسلمانوں کے لیے باعثِ عار بھی ہیں اور اسلام کی پیشانی پر بدنما داغ بھی۔ کیا انہیں پتا نہیں ہے کہ کسی بے گناہ کا قتل کس قدر بھیانک گناہ ہے؟

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (المائدۃ:۳۲)

''جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا' گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا''۔

صحیح حدیث میں ہے:

لَزَوَالُ الدُّنْيَا اَهْوَنُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ (ترمذی)

''پوری دنیا کو مٹا دینا اللہ کے نزدیک زیادہ آسان ہے کسی مسلم کو قتل کر دینے کے مقابلے میں''۔

محض ہتھیار سے کسی کو خوفزدہ کرنا بھی موجبِ لعنت جرم ہے۔ حدیث میں ہے:

مَنْ اَشَارَ اِلٰى اَخِيْهِ بِحَدِيْدَةٍ فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَلْعَنُهٗ حَتّٰى يَنْتَهِيَ (مسلم)

''جس نے اپنے بھائی کی طرف ہتھیار اٹھایا' فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں حتیٰ کہ وہ ہتھیار ہٹالے''۔

(۳) کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے غلط راستے کا انتخاب جائز نہیں ہے۔ گناہ اور جرم کا راستہ اختیار کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ خواہ کسی اچھے مقصد ہی کے لئے' یہ غلط راستہ کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ اسلام اس مکیاولی نظریے کی سختی سے تردید کرتا ہے کہ مقصد نیک ہو تو اسے پانے کے لیے اچھا برا کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی نظریے کے مطابق جتنا ضروری کسی مقصد کا نیک یا مفید ہونا ہے' اتنا ہی ضروری ان ذرائع کا اچھا ہونا بھی ہے' جنہیں مقصد کے حصول کے لیے اختیار کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدقہ و خیرات کرنے کے لیے چوری کرنا یا حرام طریقے سے مال حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ اس

لیے کہ مقصد کے نیک ہونے کے باوجود اس مقصد کو حاصل کرنے کا راستہ جائز نہیں ہے۔ حضورﷺ کا فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا الطَّيِّبَ (مسلم)

''اللہ پاک ہے اور صرف پاک چیز ہی کو قبول کرتا ہے''۔

اسی لیے علماءِ کرام عمل صالح کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عمل صالح وہ ہے جس میں دو باتیں پائی جاتی ہوں۔ پہلی یہ کہ یہ عمل خالصتاً اللہ کے لیے ہو اور دوسری یہ کہ اسلامی احکام اور شریعت کے مطابق ہو۔ اسلامی شریعت سے ہٹ کر انجام دیا ہوا یا اللہ کے علاوہ کسی اور کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا عمل، صالح نہیں ہوسکتا۔

طیارہ اغوا کیس میں اغوا کنندگان کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کا مقصد نیک وصالح ہے اور وہ کویتی جیلوں میں قید اپنے بعض ساتھیوں کی رہائی کی غرض سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ ان کے اس مقصد کو جائز اور احسن تسلیم کر لینے کے باوجود اس بات میں دو رائے نہیں کہ انہوں نے جو راستہ یا طریقہ اختیار کیا ہے وہ انتہائی شرمناک اور مذموم ہے۔ یہ ایک بدترین جرم ہے۔ اس صورت میں اس جرم کا گھناؤنا پن اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ انہوں نے یہ جرم اسلام کے نام پر اور خود کو متقی پرہیزگار سمجھتے ہوئے کیا ہے۔ اپنے اس رویے سے وہ اسلام کی زبردست بدنامی کا سبب بن رہے ہیں۔

بلاشبہ اسلام کی نظر میں طیارے کا اغوا کرنا، کسی صورت جائز نہیں ہے اور اب علماءِ کرام پر فرض ہے کہ وہ دنیا والوں کے سامنے اسلام کے صحیح موقف کی وضاحت کریں اور انہیں پورے وثوق کے ساتھ بتائیں کہ اسلام اس عمل کی سختی کے ساتھ تردید کرتا ہے اور ایسا کرنے والے صحیح مسلمان نہیں ہوسکتے۔

چھٹا باب

طبی مسائل

- ☆ ناگزیر صورت میں جان لیوا دوا کا استعمال
- ☆ انسانی اعضاء کی پیوند کاری
- ☆ اِسقاطِ حمل
- ☆ زور زبردستی کا حمل
- ☆ پان کا استعمال
- ☆ متفرقات

٦

ناگزیر صورت میں جان لیوادوا کا استعمال

سوال: اگر کوئی مریض ناقابلِ برداشت تکلیف میں مبتلا ہے اور اس کی حالت ناقابلِ دید ہے تو کیا یہ بات جائز ہے کہ کسی دوا کے ذریعے اس کی جان لے لی جائے۔ جان لینے کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ مریض کوایسی دوایاانجکشن دیا جائے جورفتہ رفتہ اس کی جان لے لےاور دوسری یہ کہ اس کا علاج بند کردیا جائے اور علاج نہ ہونے کی وجہ سے مریض خودہی دم توڑ دے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ کوئی شخص کینسر کا مریض ہےاوروہ اتنی شدید تکلیف میں مبتلا ہے کہ وہ بار بار بیہوش ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر کویقین ہے کہ کینسر کا یہ مرض اب اس کی جان لے کرہی چھوڑے گا تو کیا ایسی صورت میں اسے کوئی دوادی جاسکتی ہے جورفتہ رفتہ اس کی جان لے لے؟ یا کوئی بچہ پیدائشی طور پر ناقص الجسم (Abnormal) ہے۔ اس کی ساخت غیر فطری ہے۔ دماغی طور پر وہ مفلوج ہے اور اس کے پھیپھڑے بھی خراب ہیں۔ مصنوعی علاج (Artifical Treatment) کے ذریعے اسے طویل عرصے تک زندہ رکھا جاسکتا ہے' لیکن یہ علاج کافی مہنگا ثابت ہو سکتا ہے۔ علاج نہ ملنے کی صورت میں یقینی ہے کہ بچہ خود بہ خود مرجائے گا۔ کیا ایسی صورت میں یہ مصنوعی علاج ضروری ہے یا اس بات کی گنجائش ہے کہ اس کا علاج بند کردیا جائے؟

جواب: پہلی صورت یا پہلی مثال میں آپ نے جان لینے کی جو ترکیب لکھی ہے وہ یقیناً شرعی اعتبار سے ناجائز ہے۔ خواہ Slow Poison کے ذریعے جان لی جائے یا الیکٹرک شاک کے ذریعے یا کسی اور دوسرے ذریعے سے' بہرحال قتل ہے۔ انسان کی

جان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے اور یہ حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے کہ وہ کسی کی جان لے۔

جان لینے کی دوسری صورت جو آپ نے لکھی ہے' اس سلسلے میں کچھ کہنے سے قبل یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ فقہاءِ کرام کی اکثریت کے نزدیک مرض کا علاج کرانا شرعاً واجب اور ضروری نہیں ہے' بلکہ علماء کے درمیان اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ مرض کا علاج کرانا افضل ہے یا بیماری پر صبر کرنا۔ بعض علماء کے نزدیک بیماری پر صبر کرنا اور علاج نہ کرانا افضل ہے۔ بخاری و مسلم کی صحیح حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک عورت سر کے شدید درد میں مبتلا تھی۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور درخواست کی کہ اے حضور (صلی اللہ علیک وسلم)! میرے لیے شفایابی کی دعا کیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم چاہو تو اپنی بیماری پر صبر کرو اور اس کے بدلے میں جنت کی حق دار بنو اور چاہو تو میں تمہارے لیے دعا کروں اور اپنے اس مرض سے نجات پا جاؤ۔ اس عورت نے کہا کہ پھر تو میں اپنی بیماری پر صبر کروں گی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام میں بہت سے ایسے بھی تھے' جو بیماری کا علاج نہیں کراتے تھے۔ کسی نے ان کا اس بات پر مؤاخذہ بھی نہیں کیا۔ اگر علاج کرانا واجب ہوتا تو یہ لوگ ضرور علاج کراتے۔

میری اپنی رائے بھی یہی ہے کہ علاج کرانا واجب نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ مرض خطرناک ہو اور علاج کرانے سے شفایابی کے روشن امکانات ہوں۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت رہی ہے کہ مرض کی حالت میں خود بھی علاج کراتے تھے اور دوسروں کو بھی علاج کرانے کا مشورہ دیتے تھے۔

البتہ اگر صورتِ حال ایسی ہو کہ علاج سے شفایابی کے امکانات صفر ہوں' تو ایسی صورت میں علاج کرانا نہ ضروری ہے اور نہ مستحب۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مریض جسے مصنوعی طریقوں سے زندہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے' اسے ان مصنوعی طریقوں سے زندہ رکھنا شریعت کی نظر میں نہ واجب ہے اور نہ مستحب۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا

علاج بند کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اس طرح علاج بند کر دینے سے اگر مریض کی موت ہو جاتی ہے تو اسے قتل میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ مصنوعی طریقے سے اسے زندہ رکھنا' اس کے مرض کی مدت میں اضافہ کرنا ہے اور یہ مصنوعی طریقے اتنے مہنگے ہیں کہ عام آدمی ان اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ان مہنگے مصنوعی طریقوں کا استعمال کتنے دنوں تک چلتا رہے گا۔ ایسی صورت میں میری رائے میں بہتر یہی ہے کہ مریض کا علاج بند کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی طبعی موت مر سکے۔

دونوں صورتوں میں واضح فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں مریض کو جان بوجھ کر ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے یہ قتل میں شمار ہوگا۔ جبکہ دوسری صورت میں مریض کو مارنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے' بلکہ اس کا علاج بند کر دیا جاتا ہے' اس لیے اسے قتل میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس بنا پر پہلی صورت ناجائز اور حرام ہے اور دوسری صورت جائز اور مباح۔

انسانی اعضاء کی پیوند کاری

سوال: انسانی اعضاء کی پیوند کاری کے سلسلے میں مجھ سے کچھ سوالات کیے گئے ہیں۔ چونکہ یہ اجتہادی مسائل ہیں' اس لیے میں نے ان کے جواب میں تحقیق کا رویہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ اجتہادی مسائل میں کسی بھی فقیہ یا مفتی کی رائے حتمی نہیں ہوسکتی اس لیے میں بھی ان مسائل میں اپنی رائے کو قطعی یا حرفِ آخر نہیں قرار دے سکتا۔ پہلے میں ان تمام سوالات کو یکجا پیش کرتا ہوں۔

(۱) کیا کسی مسلمان کیلئے جائز ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے کسی عضو کا عطیہ کسی دوسرے شخص کو دے دے؟

(۲) کیا موت کے بعد میت کے کسی عضو کو بطورِ عطیہ کسی کو دیا جا سکتا ہے؟

(۳) عضو کا عطیہ کسے دیا جا سکتا ہے؟ اپنے کسی رشتہ دار یا دوسرے مسلمان کو؟ یا

مسلم وغیر مسلم کسی بھی انسان کو۔

(۴) اگر اس کا عطیہ کرنا جائز ہے تو کیا اس کی خرید وفروخت بھی جائز ہے؟

(۵) کیا میت کے گھر والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ میت کے کسی عضو کا عطیہ دے سکیں؟ اسی طرح کیا حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ حادثات میں مرنے والوں کے بعض اعضاء کو محفوظ کر کے زندہ لوگوں میں کسی ضرورت مند کو عطیہ کر دے۔

(۶) کیا کسی غیر مسلم کا عضو کسی مسلم کے جسم میں لگایا جا سکتا ہے؟

(۷) کیا کسی جانور (پاک و ناپاک) کا عضو کسی مسلم کے جسم میں لگایا جا سکتا ہے؟

جواب: انسانی اعضاء کا عطیہ کرنا جائز ہے یا ناجائز' اس سلسلے میں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کے تصرف کا حق اسے حاصل نہیں ہے' اس لیے جس چیز کا وہ مالک نہیں ہے اسے وہ عطیہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو ایک دوسرے زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ انسانی جسم اگرچہ اللہ کی ملکیت ہے' لیکن اللہ ہی نے انسان کو اس بات کا حق عطا کیا ہے کہ فائدے اور نفع کی خاطر اس ملکیت میں وہ اپنی مرضی سے تصرف کر سکے۔ مثال کے طور پر جسم کی طرح مال و دولت بھی اللہ کی ملکیت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بطورِ امانت انسان کو عطا کیا ہے جیسا کہ اللہ خود فرماتا ہے:

وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (النور:۳۳)

''اور انہیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے''۔

اس آیت میں واضح طور پر اللہ نے یہ بات کہہ دی ہے کہ اس نے جو مال ہمیں عطا کیا ہے وہ دراصل اللہ کا مال ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ نے ہمیں اس بات کا حق عطا کیا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے اس میں تصرف کر سکیں۔ اس لیے جس طرح مال و دولت کا عطیہ دے کر ہم کسی انسان کی مدد کر سکتے ہیں' اسی طرح ہم اپنے جسم کا کوئی عضو کسی ضرورت مند انسان کو دے کر اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ

انسان اپنی پوری دولت کسی کو عطیہ دے سکتا ہے' لیکن اپنا پورا جسم کسی کو عطیہ نہیں دے سکتا یا کوئی ایسا عضو بطورِ عطیہ نہیں دے سکتا کہ جس کے عطا کرنے سے خود اس کی جان چلی جائے۔ جس طرح کسی مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ دریا میں کود کر کسی ڈوبتے ہوئے انسان کو بچائے یا جلتے ہوئے مکان میں داخل ہو کر کسی شخص کی جان بچائے' اسی طرح یہ بھی جائز ہونا چاہیے کہ اپنے جسم کا کوئی عضو عطا کر کے کسی مرتے ہوئے شخص کی جان بچائے۔ آج ہم خون کے عطیہ کو جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ خون بھی تو انسانی جسم کا ایک حصہ ہے اور بہت ہی اہم حصہ ہے۔

اسلامی شریعت کا اصول ہے کہ بقدرِ امکان کسی کی مصیبت کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ جبھی تو بھوکوں کو کھانا کھلانا' قیدیوں کو رہائی دلانا' مریض کا علاج کرانا اور مرتے ہوئے شخص کی جان بچانا' شریعت کی نظر میں بڑے نیک اعمال ہیں۔ کسی مسلم کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ کسی شخص کو مصیبت میں دیکھے اور اس کی مدد نہ کرے۔

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی مریض کو کسی انسانی عضو کی اتنی شدید ضرورت ہے کہ اس کے بغیر اس کا زندہ رہنا مشکل ہے مثلاً یہ کہ اس کا گردہ ناکارہ ہو جائے اور اسے گردے کی شدید ضرورت ہے تو ایسی صورت میں کوئی شخص اپنے دو گردوں میں سے ایک گردے کا عطیہ دے کر اس کی جان بچالے تو اس کا یہ عمل باعثِ اجر و ثواب ہے۔ اگر مال و دولت کا عطیہ باعث اجر و ثواب ہے تو انسانی عضو کا عطیہ اس سے بھی بڑھ کر کارِ ثواب ہے' کیونکہ مال کے بغیر محتاج انسان مر نہیں جائے گا لیکن اس عضو کے بغیر اس کی زندگی ختم ہو سکتی ہے۔ البتہ انسانی عضو کا عطیہ کرنا چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

(۱) کسی ایسے عضو کا عطیہ جائز نہیں ہے جو جسم میں ایک ہی عدد ہو مثلاً دل کیوں کہ اس کا عطیہ دینے کے بعد انسان کے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔

(۲) اسی طرح کسی ظاہری عضو کا عطیہ دینا جائز نہیں ہے۔ مثلاً ہاتھ' پیر' آنکھ وغیرہ۔

(۳) عطیہ دینے سے اگر بیوی اور بال بچوں میں سے کسی کو نقصان ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں عطیہ دینا جائز نہیں ہے۔ مجھ سے ایک عورت نے سوال کیا کہ میں اپنا ایک گردہ اپنی بہن کو عطیہ کرنا چاہتی ہوں لیکن میرا شوہر راضی نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟ میں نے جواب دیا کہ چونکہ تم پر تمہارے شوہر کے حقوق زیادہ ہیں۔ تم اپنا ایک گردہ عطیہ دینا چاہتی ہو۔ اس کے لیے تمہارا آپریشن ہوگا۔ جسمانی طور پر تم کمزور ہو جاؤ گی۔ ساری زندگی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا ہوں گی اور یہ ساری باتیں تمہارے شوہر کے لیے تکلیف دہ ہوسکتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ تم اپنے شوہر سے بھی اس بات کی اجازت لے لو۔

(۴) عضو کا عطیہ کرنے والا عاقل و بالغ ہو۔ کم سن بچہ اپنی مرضی سے یہ کام نہیں کر سکتا کیونکہ اپنے نفع و نقصان کی اسے تمیز نہیں ہے۔ یہی حال پاگل شخص کا ہے۔

(۵) بچے اور پاگل کے سرپرست (ولی) کیلئے بھی جائز نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے ان کے کسی عضو کا عطیہ کریں۔

موت کے بعد عضو کا عطیہ کرنا

جس طرح انسان اپنی زندگی میں اپنے کسی عضو کا عطیہ کر سکتا ہے اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ مرنے سے قبل یہ وصیت کر جائے کہ مرنے کے بعد اس کا فلاں عضو عطیہ کر دیا جائے۔ اس لیے کہ مرنے کے بعد لازمی طور پر اس کا جسم مٹی میں مل کر نیست و نابود ہو جائے گا اور کسی کے کام کا نہ رہے گا۔ نیست و نابود ہونے کے بجائے اس کا کوئی عضو کسی ضرورت مند کے کام آ جائے تو یہ عمل یقیناً قابلِ تحسین اور باعث اجر و ثواب ہے۔ قرآن و سنّت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے عطیہ دینے کی ممانعت ثابت ہو رہی ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا ''کسی ایسی چیز کو دینے سے کیوں روک رہے ہو جس کے دینے سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے' لیکن کسی اور کا بھلا ہو جائے گا'' ذرا غور کیجیے کہ مرنے والا مر جائے گا اور اس کے کسی بھی عضو سے نہ وہ خود فائدہ

اٹھا سکتا ہے اور نہ کوئی اور۔ ایسی صورت میں اگر کسی ضرورت مند کو اس کا کوئی قابلِ استعمال عضو عطیہ کر دیا جائے تو کیا یہ نیکی کا کام نہیں ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ موت کے بعد کسی عضو کے نکالنے سے لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے اور لاش کی بے حرمتی سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث شریف ہے:

كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِ عَظْمِ الْحَيِّ (مسند احمد)

''مردہ کی ہڈی توڑنا زندہ شخص کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے''۔

ان کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ لاش کی بے حرمتی جائز نہیں ہے' لیکن مردہ جسم سے کسی عضو کا نکال لینے سے اس کی بے حرمتی نہیں ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح زندہ شخص کے جسم سے آپریشن کر کے کسی عضو کو نکال لیا جائے تو اس کی بے حرمتی نہیں ہوتی ہے۔ مذکورہ حدیث میں جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ ہے لاش کا' مثلہ بنانا اور اسے مسخ کرنا جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ انتقاماً کیا کرتے تھے۔

بعض لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ سلفِ صالحین میں سے کسی نے بھی عضو کے عطیہ کے سلسلے میں کوئی کلام نہیں کیا ہے اور نہ اسے جائز قرار دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سلفِ صالحین کے نقش قدم پر چلیں۔ ان کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ سلفِ صالحین کے زمانہ میں اعضاء کی پیوند کاری کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ جب یہ کام ان کے زمانے میں ہوتا ہی نہیں تھا تو اس سلسلے میں بھلا وہ کلام کیسے کرتے؟ دورِ حاضر میں ہم بہت سارے ایسے کام کرتے ہیں جو سلفِ صالحین نے نہیں کیے تھے' کیونکہ ان کے دور میں ان چیزوں کا وجود ہی نہیں تھا۔ اعضاء کی پیوند کاری بھی ان چیزوں میں سے ایک ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات ذہن نشین کرانی ضروری ہے اور وہ یہ کہ میت کے پورے جسم کا عطیہ جائز نہیں ہے' تاکہ شریعت کے حکم کے مطابق میت کی تکفین و تدفین ہو سکے۔

کسی غیر مسلم کو عضو کا عطیہ دینا

جس طرح مال و دولت کا عطیہ کسی غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے اسی طرح عضو کا عطیہ بھی غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے۔ اِلاّ یہ کہ یہ غیر مسلم کھلم کھلا مسلمانوں کا دشمن ہو یا اسلام سے مرتد ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں یہ عطیہ جائز نہیں ہے۔ اگر صورتِ حال ایسی ہو کہ مسلم اور غیر مسلم بیک وقت دونوں ہی کسی عضو کے ضرورت مند ہوں تو ایسی صورت میں مسلم شخص کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ اللہ کا فرمان ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ (التوبة:۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں''۔

اسی طرح دیندار مسلم کو غیر دین دار مسلم پر اور رشتہ دار کو غیر رشتہ دار پر ترجیح دی جائے گی اور جس طرح کسی متعین شخص کو عضو کا عطیہ دینا جائز ہے اسی طرح کسی ایسے فرد یا سوسائٹی کو بھی یہ عطیہ دینا جائز ہے جو ان اعضاء کو محفوظ رکھتی ہو اور بہ وقت ضرورت مستحق لوگوں کو ان اعضاء کا عطیہ فراہم کرتی ہو۔

عضو کا عطیہ جائز ہے' لیکن اس کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے

انسانی اعضاء کا عطیہ تو جائز ہے' لیکن ان کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے' تاکہ انسانی جسم سامانِ تجارت نہ بن جائے کہ اس سے اس کی بے حرمتی لازم آتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ بعض غریب ملکوں میں انسانی اعضاء کی تجارت زوروں پر ہے۔ غریبوں کو پیسے کا لالچ دے کر یا ان کی بے خبری میں ان کے اعضاء نکال لیے جاتے ہیں اور مالداروں کو مہنگے داموں فروخت کیے جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک گھناؤنا جرم ہے۔

عضو کا عطیہ قبول کرنے والا اگر اپنی خوشی سے عطیہ دینے والے کو بطورِ انعام کچھ رقم دے دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے' بشرطیکہ پہلے سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی گئی ہو۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ قرض لینے والا اپنی خوشی سے قرض دینے والے کو

قرض کی واپسی کے وقت قرض کی رقم سے کچھ زائد رقم عطا کر دے۔ یہ زائد رقم عطا کرنا جائز ہے' کیونکہ نبی ﷺ نے بھی ایسا کیا ہے۔

میت کے وارثین میت کے اعضاء کا عطیہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جس طرح مرنے کے بعد میت کی دولت کے مالک اس کے وارثین بن جاتے ہیں اسی طرح مرنے کے بعد میت کا جسم اس کی اپنی ملکیت نہیں رہ جاتا بلکہ اس پر تصرف کا حق اس کے وارثین کو مل جاتا ہے۔ اس لیے میت کے سرپرست اور وارثین کے لیے میت کے کسی عضو کا عطیہ کرنا جائز اور درست ہے۔ ایسا ہی حق اللہ تعالیٰ نے مقتول کے وارثین کو دیا ہے کہ چاہیں تو وہ قتل کے بدلے قصاص کا مطالبہ کریں یا چاہیں تو قصاص نہ لے کر دِیت پر اکتفا کریں۔ اللہ کا فرمان ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۳۳)

''اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو' اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے' پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے' اس کی مدد کی جائے گی''۔

قطر میں کسی نے مجھ سے دریافت کیا کہ وہ بچے جو پیدائشی طور پر ناقص الجسم (Abnormal) پیدا ہوتے ہیں اور جن کے زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں ہوتی ہے' کیا ان کے بعض اعضاء کو نکال کر ان بچوں کو عطا کیا جا سکتا ہے جنہیں ان اعضاء کی سخت ضرورت ہے؟ میں نے جواب دیا کہ یہ کام نہ صرف یہ کہ جائز ہے' بلکہ باعثِ اجر و ثواب ہے۔ میرے اس فتوے پر لوگوں نے عمل کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سارے بچوں کو نئی زندگی مل گئی۔ البتہ اگر مرنے والا مرنے سے قبل اپنے

کسی عضو کے عطیہ سے منع کر جائے تو ایسی صورت میں وارثین اس کے اس عضو کا عطیہ نہیں دے سکتے۔

اسی طرح حکومت کے لیے بھی جائز ہے کہ حادثات میں پائی جانے والی لاوارث لاشوں کے اعضاء کو نکال کر محفوظ کر لے تاکہ بہ وقتِ ضرورت حاجت مند مریضوں میں ان اعضاء کی پیوندکاری کی جاسکے۔ بشرطیکہ اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ یہ لاش لاوارث ہے۔

غیر مسلم شخص کا عضو مسلم شخص کے بدن میں لگانا

غیر مسلم شخص کے عضو کی مسلم شخص کے بدن میں پیوندکاری بالکل جائز اور درست ہے' کیونکہ انسان کے اعضاء مسلم یا کافر نہیں ہوتے اور قرآن کی یہ آیت کہ ''انما المشرکون نجس'' (مشرکین نجس اور ناپاک ہیں) اس آیت میں نجاست سے مراد ظاہری اور جسمانی نجاست نہیں ہے' بلکہ روحانی اور معنوی نجاست ہے۔

کسی ناپاک جانور کا عضو مسلم شخص کے بدن میں لگانا

رہا یہ سوال کہ کسی ناپاک جانور مثلاً سور وغیرہ کا کوئی عضو کسی مسلم شخص کے بدن میں لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں میرا جواب یہ ہے کہ انتہائی ناگزیر حالت میں اس کی اجازت دی جاسکتی ہے اور وہ بھی بقدرِ ضرورت۔ اسی طرح جس طرح انتہائی ناگزیر حالت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے گوشت کو بقدر ضرورت حلال قرار دیا ہے۔

سور کی جو چیز حرام کی گئی ہے وہ ہے اس کا گوشت کھانا' جیسا کہ قرآن کی آیتوں سے پتا چلتا ہے۔ رہا اس کے اعضاء سے استفادہ کرنا تو صراحت کے ساتھ کہیں بھی اس کی حرمت نہیں بیان کی گئی ہے۔ سور کی طرح مردار کا گوشت بھی اللہ نے حرام قرار دیا ہے' لیکن اس کے چمڑے سے استفادہ کو جائز قرار دیا ہے اور جہاں تک اس کے عضو کے نجس ہونے کا سوال ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نجاست قابلِ گرفت ہوتی ہے جو جسم کے

باہری حصہ میں لگی ہوتی ہے۔ جسم کے اندرونی حصے میں تو پہلے ہی سے پیشاب' پاخانہ اور خون کی صورت میں بے شمار نجاست اور غلاظت بھری ہوتی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سور کے نجس عضو کو بدن کے اندرونی حصے میں لگانا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہونی چاہیے۔

آخر میں' میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ایک مرد کے خُصیے کو دوسرے مرد میں لگانا کسی صورت جائز نہیں ہے' کیونکہ اس خصیہ میں وہ مادہ ہوتا ہے جس سے بچے کی ولادت ہوتی ہے۔ اگر ایک مرد کے خصیے کو دوسرے مرد میں لگا دیا جائے تو اس سے نسب کے خلط ملط ہونے کا امکان ہے۔ یہی تو وہ امکان ہے جس کی وجہ سے عورت طلاق یا شوہر کی وفات کے بعد عدت گزارتی ہے۔

اسی طرح کسی شخص کے دماغ کو دوسرے شخص میں لگانا درست نہیں ہے' کیونکہ اس طرح بڑے غلط نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

اِسقاطِ حمل

سوال: اِسقاطِ حمل (Abortion) کن حالات میں جائز ہے؟

جواب: اسلامی شریعت کی نظر میں جنین (پیٹ کا بچہ) کی زندگی کی وہی اہمیت و حرمت ہے جو کسی زندہ انسان کی ہے۔ اس لیے اس زندگی کی حفاظت بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح زندہ انسان کی زندگی کی حفاظت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاملہ عورت رمضان کے مہینے میں روزے توڑ سکتی ہے اور اگر جنین کو کسی قسم کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں روزہ رکھنا درست نہیں ہے۔ یہ سب اس لیے و یکہ پیٹ میں نشو ونما پانے والے بچے کی زندگی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ اسلامی شریعت نے کسی شخص کو حتیٰ کہ خود ماں کو اس بات کا حق نہیں دیا ہے کہ جان بوجھ کر جنین کو نقصان پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ زنا کی وجہ سے ٹھہرنے والے حمل کا بھی عورت اِسقاط نہیں کرا سکتی کیونکہ اس بچے کی حیثیت بھی ایک

زندہ انسان کی سی ہے۔ اگر یہ حرام کا بچہ ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔

جنین کی اسی حیثیت کی وجہ سے اسلامی شریعت کا یہ قانون ہے کہ موت کی سزا پانے والی عورت اگر حاملہ ہے تو اسے اس وقت تک موت کی سزا نہیں دی جا سکتی جب تک وہ بچے کو جنم نہ دے لے اور اس کی دودھ چھڑانے کی عمر نہ ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ اس شخص پر پوری دِیت دینا لازم ہے جو کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائے اور اس کی وجہ سے اس کا بچہ ساقط ہو جائے اور تھوڑی دیر زندہ رہ کر چل بسے۔

علاّمہ ابنِ حزم کہتے ہیں کہ روح پھونکنے کے بعد جنین ایک مکمل انسان تصوّر کیا جائے گا۔ جنین کی اس حقیقت کی بنیاد پر تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ روح پھونکنے (بچے میں جان پڑنے) کے بعد اِسقاطِ حمل جائز نہیں ہے اور اگر کسی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تو اسے قتل میں شمار کیا جائے گا۔

البتہ روح پھونکنے سے قبل اِسقاطِ حمل جائز ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں فقہاءِ کرام کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض فقہاءِ کرام بہ وقت ضرورت اِسقاطِ حمل کو جائز قرار دیتے ہیں' کیونکہ روح کو پھونکنے سے قبل جنین محض گوشت اور خون کا بے جان لوتھڑا ہے۔ لیکن وہ علماءِ کرام جو ''عزل'' (مباشرت کے وقت منی کو باہر گرا دینے) کو ناجائز قرار دیتے ہیں' ان کے نزدیک روح پھونکنے سے قبل بھی اِسقاطِ حمل جائز نہیں ہے اور وہ علماءِ کرام جو عزل کو جائز قرار دیتے ہیں' ان کے نزدیک روح پھونکنے سے قبل اِسقاطِ حمل جائز ہے بشرطیکہ معتبر اور مستند ڈاکٹروں کی ٹیم طبی بنیادوں پر اِسقاطِ حمل کو ضروری قرار دے۔ عزل کو جائز قرار دینے والے بعض علماء ایسے بھی ہیں' جو روح پھونکنے سے قبل اِسقاطِ حمل کو جائز نہیں قرار دیتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عزل اور اِسقاط میں بہت فرق ہے۔ اِسقاط یہ ہے کہ بچے کے وجود میں آنے کے بعد اسے گرا دیا جائے' جبکہ عزل میں بچے کے وجود کا سرے سے کوئی تصوّر ہی نہیں ہوتا ہے۔

بعض علماءِ کرام کے نزدیک روح پھونکنے سے قبل اِسقاطِ حمل حرام تو نہیں' لیکن

مکروہ ضرور ہے۔ ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ روح پھونکنے سے قبل جنین گرچہ بے جان لوتھڑا ہے، لیکن آخر کبھی نہ کبھی اس میں روح پھونکی جائے گی اور اسے زندگی عطا ہوگی۔

روح پھونکنے اور جان پڑنے کا وقت کون سا ہوتا ہے۔ اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بخاری و مسلم کی وہ مشہور حدیث جسے وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں، کے مطابق جنین کے اندر ایک سو بیس دن کے بعد روح پھونکی جاتی ہے، لیکن مسلم شریف کی ایک دوسری صحیح حدیث ہے جسے حضرت حذیفہ بن اسید روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے إِذَا مَرَّ بِالنُّطْفَةِ ثِنْتَانِ وَأَرْبَعُونَ لَيْلَةً بَعَثَ اللّٰهُ إِلَيْهَا مَلَكًا فَصَوَّرَهَا وَخَلَقَ سَمْعَهَا وَبَصَرَهَا وَجِلْدَهَا وَلَحْمَهَا وَعِظَامَهَا...... الخ ''نطفہ پر جب بیالیس دن گزر جاتے ہیں تو اللہ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور اس کی صورت گری کرتا ہے۔ اس کے کان، آنکھ، جلد، گوشت اور ہڈیوں کی تخلیق کرتا ہے...... الخ''۔

یہ ایک لمبی حدیث ہے جو یہ واضح کرتی ہے کہ بیالیس دن گزرنے کے بعد نطفہ ایک انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کی تقدیر لکھ دی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ ہونے کے بعد اس کے وجود کو ختم کرنا، گویا اسے قتل کرنا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث جس میں ایک سو بیس دن کے بعد روح پھونکنے کی بات کہی گئی ہے اور وہ حدیث جس میں بیالیس دن کے بعد تخلیق کی بات کہی گئی ہے، یہ دونوں حدیثیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان دونوں کے درمیان تطابق کی صورت علماءِ کرام نے یہ بتائی ہے کہ فرشتے دو دفعہ بھیجے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ بیالیس دن کے بعد جنین کی تخلیق اور اس کی صورت گری کے لیے اور دوسری دفعہ ایک سو بیس دن کے بعد اس نئی مخلوق میں روح پھونکنے کیلئے۔ دورِ حاضر کے بعض ماہرین طب کہتے ہیں کہ پرانے زمانے کے وہ علماءِ کرام جو ایک محدود علم کی بنیاد پر ایسا کہتے ہیں۔ اگر انہیں دورِ جدید کی غیر معمولی سائنسی تحقیقات کا

علم ہوتا تو وہ ہرگز ایسا فتویٰ نہ دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق چھ ہفتے بعد ہی نطفہ اس مرحلے میں پہنچ جاتا ہے' جس میں اسے انسانی خصائص عطا ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو مسلم شریف کی مذکورہ حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

ان دونوں احادیث اور علماءِ کرام کی مختلف آراء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اصولی طور پر اِسقاطِ حمل ناجائز اور حرام ہے' لیکن اس حرمت کے کئی درجے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حمل کے ابتدائی ایام میں اِسقاطِ حمل کی حرمت اتنی شدید نہیں ہے' جتنی اس کی تخلیق شروع ہونے (بیالیس دن گزرنے) کے بعد اس کی حرمت ہے۔ روح پھونکنے کے بعد اِسقاطِ حمل سراسر قتل اور بھیانک جرم ہے۔ صرف انتہائی ناگزیر حالت میں اس کی اجازت دی جاسکتی ہے اور وہ ناگزیر حالت یہ ہے کہ اِسقاط نہ کرنے کی صورت میں ماں کی جان خطرے میں پڑ جائے۔ جنین کے مقابلے میں ماں کی جان کی زیادہ اہمیت ہے۔ اس لیے بچے کے مقابلے میں ماں کو بچانا زیادہ ضروری ہے۔

دورِ حاضر کے بعض علماءِ کرام کے نزدیک انتہائی ناگزیر صورت یہ بھی ہے کہ جنین میں کچھ ایسا تخلیقی نقص یعنی پیدائشی عیب پیدا ہو جائے کہ پیدا ہونے کے بعد اس کی زندگی اس کے لیے مصیبت اور عذاب بن کر رہ جائے۔ الٹراساؤنڈ اور بعض دوسرے جدید آلات کے ذریعے پیدائش سے قبل پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ آیا بچے میں اس طرح کا کوئی نقص پایا جاتا ہے۔ اگر یہ نقص ایسا ہے کہ پیدائش کے بعد ساری زندگی بچے کے لیے مصیبت بن کر رہ جائے تو ایسی صورت میں اِسقاطِ حمل جائز ہے' لیکن میں ان علماءِ کرام کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ اس لیے کہ:

(۱) جب چار مہینے گزر جائیں تو ان تخلیقی عیوب و نقائص کے باوجود جنین ایک زندہ انسان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا اِسقاط اسے قتل کرنے کے مترادف ہے۔

(۲) طبی معائنے اور ڈاکٹروں کی اس رپورٹ کے باوجود کہ بچے میں تخلیقی نقص

ہے' بسا اوقات بچہ صحیح وسالم پیدا ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک کیس میری نظر سے گزرا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک شخص نے مجھ سے فتویٰ پوچھا کہ میری بیوی کے پیٹ میں پانچ مہینے کا بچہ ہے اور میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس میں تخلیقی نقص ہے۔ کیا ہم اس کا اِسقاط کرا سکتے ہیں؟ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اللہ پر بھروسہ کریں اور اِسقاط نہ کرائیں۔ کچھ عرصے کے بعد میرے پاس ایک کارڈ آیا جو اس بچے کی طرف سے تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میرے محسن! اللہ کے بعد میں آپ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے بچا لیا ورنہ میرے والدین میرا اِسقاط کرا کے مجھے پیدائش سے قبل ہی مار ڈالتے۔ اس لیے میری نظر میں طبی معائنے کو حرفِ آخر سمجھ کر اسقاط کرا دینا جائز نہیں ہے۔

(۳) اب میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ پیدائش کے کے بعد آپریشن وغیرہ کے ذریعہ ان تخلیقی عیوب پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

(۴) تخلیقی عیوب سے مراد اگر اندھا پن اور بہرا پن ہے تو یہ ایسے عیوب نہیں ہیں جن کی وجہ سے اِسقاط کی اجازت دی جا سکے۔ کتنے ہی ایسے اندھے اور بہرے لوگ گزر چکے ہیں جنہوں نے اس پیدائشی نقص کے باوجود کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور کامیاب زندگی گزاری ہے اور یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے اندھا یا بہرا پیدا کرتا ہے اسے اس نقص کے بدلے کوئی دوسری غیر معمولی صلاحیت عطا کر دیتا ہے۔ اس لیے اس طرح کے پیدائشی نقائص کی وجہ سے اِسقاط کرانا میری نظر میں جائز نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ میری نظر میں صرف ایک ہی ایسی صورت ہے جس میں اِسقاط کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اِسقاط نہ کرایا گیا تو ماں کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اسی صورت میں ماں کی جان بچانے کے لیے حمل کو ساقط کرایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ماں کی جان بہرحال بچے کی جان سے زیادہ اہم ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

زور زبردستی کا حمل

سوال: بوسنیا کی ان لڑکیوں اور عورتوں نے جو سربیا کے وحشی اور ظالم فوجیوں کی جنسی ہوس کا نشانہ بن چکی ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو چکی ہیں' اس حرام حمل کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حمل ان کی مرضی کیخلاف اور زور زبردستی کے ذریعے قرار پایا ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہیں کہ وہ اس حرام حمل کا کیا کریں؟ کیا وہ اس کا اِسقاط کرا سکتی ہیں؟ اگر نہیں کرا سکتی ہیں تو ولادت کے بعد یہ بچہ مسلم کہلائے گا یا کافر؟

جواب: یہی سوال مجھ سے اریٹریا کی ان مسلم خواتین نے کیا تھا جو اریٹریا کی تحریکِ آزادی کے دوران عیسائی فوجیوں کی جنسی ہوس کا نشانہ بن چکی تھیں۔ اور اس سے قبل ایسا ہی سوال ان مسلم خواتین نے کیا تھا جو بغیر کسی قصور کے جیلوں میں بند ہیں اور افسران جیل وقتاً فوقتاً ان سے اپنی جنسی پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔ ان سب کا سوال یہ تھا کہ اس زور زبردستی کے نتیجہ میں جو بچہ ان کے پیٹ میں پل رہا ہے' وہ اس کا کیا کریں؟

اس سوال کے جواب میں' میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ زور زبردستی کے ذریعے جنسی ہوس کا نشانہ بن جانے والی لڑکیاں اور عورتیں بے قصور اور بے گناہ ہیں۔ یہ گناہ ان کی مرضی سے نہیں ہوا ہے۔ اللہ کا قانون حق وانصاف پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو زنا سے زیادہ بھیانک جرم شرک کو بھی درگزر کر دیتا ہے' اگر کسی شخص کو اس کی مرضی کیخلاف شرک پر مجبور کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (النحل:۱۰۶)

''سوائے اس شخص کے جس کے ساتھ زبردستی کی جائے' لیکن اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو''۔

بلکہ اضطراری حالت اور مجبوری میں حرام چیزیں بھی حلال ہو جاتی ہیں:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رَّحِيْمٌ ۝ (البقرۃ:۱۷۳)

''ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے''۔

اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنْ اُمَّتِیْ اَلْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ (ابن ماجہ)

''اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کی بھول چوک اور اس گناہ کو معاف فرما دیا ہے جو زور زبردستی کے ذریعہ کرایا جائے''۔

ان لڑکیوں اور عورتوں کا صرف اتنا قصور ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور صرف اسی بنا پر انہیں بے عزت کیا گیا ہے اور وہ جنسی استحصال کا شکار ہوئی ہیں۔ ان شاءاللہ وہ اس ظلم و بربریت کے عوض میں اللہ کے یہاں اجر و ثواب کی مستحق ہوں گی۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

مَا يُصِيْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَّصَبٍ وَّلَا وَصَبٍ وَّلَا هَمٍّ وَّلَا حُزْنٍ وَّلَا اَذًى وَّلَا غَمٍّ حَتَّى الشَّوْكَةَ يُشَاكُهَا اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ (بخاری)

''مسلم کو جو بھی مصیبت، تکلیف، غم اور پریشانی لاحق ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر اس کے کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ اس کے بدلہ میں اس کے گناہ کو معاف کر دیتا ہے''۔

میں مسلم جوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ان مظلوم خواتین کو اپنی عصمت میں لے لیں۔ ان سے شادی کر لیں تاکہ ان کے غم و آلام کا کچھ تو مداوا ہو سکے۔ کیونکہ کسی شریف عورت کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ درندہ صفت لوگ اس کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیں۔ البتہ اس حمل کا اِسقاط کرانا جائز نہیں ہے۔ خواہ یہ حمل

زنا کے نتیجے ہی میں قرار پایا ہو' کیونکہ زنا کے ذریعے وجود میں آنے والا بچہ بھی ایک جیتی جاگتی روح ہے اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے کہ وہ زنا کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور ﷺ نے حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا (وہ صحابیہ جنھوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اس کا اعتراف بھی کرلیا تھا) کو ان کے اعتراف کے فوراً بعد' رجم' موت کی سزا نہیں دی تھی۔ بلکہ انہیں حکم دیا کہ پہلے وہ بچے کو جنم دے لیں اور دو سال تک اسے دودھ پلائیں۔ چنانچہ اس کے بعد انہیں رجم کی سزا دی گئی۔ حضور ﷺ نے انہیں اس بات کا حکم نہیں دیا کہ یہ حرام نطفہ کا بچہ ہے اس لیے اسے ساقط کرادیں۔ اس سلسلے میں میرا فتویٰ یہی ہے۔ البتہ بعض علماءِ کرام کسی معقول عذر کی بنا پر چالیس دن سے پہلے پہلے اور بعض علماءِ کرام ایک سو بیس دن سے پہلے پہلے اِسقاط کی اجازت دیتے ہیں' کیوں کہ اس مدت میں حمل میں روح نہیں ہوتی ہے۔

گویا یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے۔ سوال کرنے والی خواتین چاہیں تو اس فقہی اختلاف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حمل کو چالیس یا ایک سو بیس دن سے قبل اِسقاط کرا سکتی ہیں۔ اس کے لیے ان کے پاس ایک معقول عذر بھی ہے اور وہ عذر یہ ہے کہ حالتِ جنگ میں ان کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا ہے اور اگر وہ چاہیں تو اس حمل کو ساقط نہ کرائیں اور بچے کو جنم دیں۔ کوئی شخص انہیں زبردستی اِسقاط پر مجبور نہیں کرسکتا ہے اور جنم لینے والا بچہ مسلمان ہی کہلائے گا کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

كُلُّ مَوْلُودٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ (بخاری)

''ہر بچہ دینِ فطرت (اسلام) پر جنم لیتا ہے''۔

ولادت کے بعد اس بچے کی تعلیم و تربیت اور نان و نفقہ کی ذمّے داری مسلم حکومت اور مسلم معاشرہ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے کہ ایسی مظلوم ماں اور بے سہارا بچے کو یونہی بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے۔

پان کا استعمال

سوال: سگریٹ نوشی کے سلسلے میں ہم نے آپ کی رائے پڑھی کہ سگریٹ نوشی حرام ہے' کیونکہ اس میں جان و مال دونوں کا نقصان ہے اور یہ خودکشی کے برابر ہے۔ سگریٹ ہی کی طرح ہمارے ملک یمن میں ایک چیز بہ کثرت استعمال کی جاتی ہے' جسے لوگ ''القات'' کہتے ہیں۔ یمن میں اس کا استعمال بہت عام ہے۔ حتیٰ کہ علماء بھی شوق سے اسے تناول فرماتے ہیں اور وہ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں محسوس کرتے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یمن سے باہر کے بعض علماء نے 'القات' کو حرام قرار دیا ہے' کیونکہ سگریٹ کی طرح اس میں بھی جان و مال دونوں کا نقصان ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟[1]

جواب: سگریٹ کے بارے میں ہم پہلے ہی کافی تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ پابندی کے ساتھ اس کا استعمال کرنا اور اس کا عادی ہونا حرام ہے' کیونکہ اس میں مال کی بربادی کے ساتھ ساتھ صحت کی بھی بربادی ہے اور دھیرے دھیرے یہ چیز موت کے منہ میں لے جاتی ہے۔ یہ تو خودکشی کے برابر ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کے استعمال سے کینسر جیسا مرض ہو سکتا ہے اور موت آ سکتی ہے' اس کا استعمال کرنا خودکشی نہیں تو اور کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کا نقصان صرف پینے والوں تک محدود نہیں رہتا ہے' بلکہ آس پاس بیٹھے لوگ بھی اس کے دھوئیں سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کی صحت پر بھی اتنا ہی برا اثر پڑتا ہے۔ جتنا پینے والوں پر پڑتا ہے۔ اسلام کا بنیادی اصول ہے ''لاضرر ولا ضرار'' (کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے خود کو نقصان ہو یا دوسروں کو نقصان ہو)۔ سگریٹ نوشی میں خود کا بھی نقصان ہے اور دوسروں کا بھی۔ اسلامی شریعت کے تمام

---

[1] ''القات'' پان ہی کی ایک شکل ہے۔ اس کے پتے بھی پان کے پتوں کی طرح ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ 'القات' کے پتوں کو بغیر چونے اور زردہ کے استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ پان میں چونا' زردہ اور کتھا استعمال کرتے ہیں جس سے اس کے نقصان میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے میری نظر میں اگر 'القات' کا استعمال جائز نہیں ہے تو پان کا استعمال بہ درجہ اولیٰ جائز نہیں ہے۔

احکام پانچ چیزوں کی حفاظت کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ دین، جان، عقل، نسل اور مال۔ کوئی بھی کام ان پانچ چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو نقصان پہنچائے تو شریعت کی نظر میں وہ کام جائز نہیں ہے۔ آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ سگریٹ نوشی ان پانچوں ہی چیزوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

چند سال قبل ''القات'' کے موضوع پر مدینہ یونیورسٹی نے ایک سیمینار کرایا تھا۔ اس سیمینار میں شرکت کرنے والے تمام علماء و مشائخ نے متفقہ طور پر سگریٹ کی طرح 'القات' کو بھی ناجائز قرار دیا تھا۔ صرف یمنی علماء اس رائے سے متفق نہیں تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ لوگ ''القات'' کی حقیقت سے ناواقف ہیں جبھی انہوں نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ یمن کے علماء و مشائخ بھی بڑے شوق سے 'القات' تناول فرماتے ہیں۔

چند سال قبل میں یمن کے دورے پر گیا تھا اور ذاتی تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر میں نے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں:

(۱) 'القات' ایک مہنگی شے ہے۔ پہلے میں اسے سگریٹ کی طرح سستی شے تصوّر کرتا تھا لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ یہ تو سگریٹ کے مقابلے میں دسیوں گنا مہنگی شے ہے۔ اتنی مہنگی شے کو چبا چبا کر تھوک دینا' بلاشبہ فضول خرچی ہے۔ نہ تو اس میں کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ دُنیوی۔

(۲) 'القات' کا استعمال سراسر وقت کی بربادی ہے۔ عام طور پر لوگ اسے ظہر کے بعد سے لے کر مغرب تک استعمال کرتے ہیں۔ اس دوران لوگ 'القات' چبانے اور گپیں لڑانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتے۔ ذرا غور کریں کہ پورے ملک میں اس رواج سے کس قدر وقت کی بربادی ہوتی ہے۔ یہ تو ملک کا بہت بڑا نقصان ہے۔ اتنا سارا وقت اگر کسی مفید کام میں لگایا جاتا تو ملک کی تعمیر و ترقی میں خاصی مدد ملتی۔ لوگ اب اس نقصان کو محسوس کرنے لگے ہیں۔

(۳) یمن کی تقریباً تیس فیصد زمین 'القات' کی پیداوار میں استعمال ہوتی ہے۔

اگر یہی زمین اناج اگانے کے لیے استعمال کی جاتی تو یمن کو دوسرے ملکوں سے غلہ درآمد کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ بلاشبہ اتنے بڑے پیمانے پر 'القات' کی پیداوار یمن کے بجٹ پر مالی بوجھ ہے۔

(۴) انصاف پسند لوگ اقرار کرتے ہیں کہ صحت کے نقطۂ نظر سے 'القات' ایک نقصان دہ چیز ہے جو لوگ بلاوجہ اس میں فائدہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر اس میں تھوڑا بہت فائدہ ہے بھی تو اس کے مقابلے میں اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ کسی چیز میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو تو شریعت کی رُو سے وہ ناجائز قرار پاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب شراب اور جوئے کو حرام کیا تو اس کی یہی وجہ بتائی کہ اس میں فائدہ اور نقصان دونوں ہیں' لیکن فائدہ کے مقابلے میں نقصانات زیادہ ہیں۔(۱)

ان حقائق کی بنیاد پر یمن کے علماء و مشائخ اب اس بات کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ 'القات' کو ناجائز ہونا چاہیے۔ چنانچہ یمن کے مشہور عالمِ دین علاّمہ محمد سالم البیحانی نے اپنی کتاب ''اصلاح المجتمع'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ 'القات' کے نقصانات پر روشنی ڈالی ہے اور اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ 'القات' میں مال کی بربادی کے ساتھ ساتھ وقت اور صحت کی بھی بربادی ہے۔ اس سے دانت اور معدہ خراب ہوتا ہے اور مختلف قسم کی پیٹ کی بیماریاں ہوتی ہیں۔ اس کا استعمال کرنے والوں کا جسم عام طور پر کمزور ہونے لگتا ہے۔ سگریٹ کی طرح تمباکو کا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔ یہ

---

(۱) آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ پان کے استعمال میں وقت کی بربادی تو نہیں ہے البتہ مال اور صحت کی بربادی ضرور ہے۔ اس میں زردہ کا استعمال اس کے نقصان میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے دانتوں کو نقصان پہنچتا ہے اور بھوک کم ہونے لگتی ہے۔ پان کے استعمال سے صحت پر کافی بُرا اثر پڑتا ہے اور یہ کہ پان کھانے والے ادھر ادھر تھوکتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ عمارتوں کو غلیظ اور بدنما کر دیتے ہیں اور بیماری پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ ان سب حقائق کی روشنی میں پان کا استعمال کسی صورت جائز نہیں ہے۔ پتہ نہیں کہ برصغیر کے علماء کو یہ بات کیسے گوارا ہوتی ہے کہ خود بھی شوق سے پان کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی گلوریاں پیش کرتے ہیں۔

شراب کی طرح نشہ آور تو نہیں، لیکن اس میں متعدد خرابیاں اور بیماریاں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اہلِ علم اس کے استعمال کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ان چیزوں سے زیادہ مضر اور پھوہڑ وہ تمباکو (کھینی) ہے جسے لوگ ہاتھوں میں مل کر دانتوں کے درمیان رکھتے ہیں یا ناک سے سونگھ کر چھینک لیتے ہیں۔ یہ لوگ کھینی کھا کر ادھر ادھر تھوکتے ہیں۔ خود بھی نقصان اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی بیماریوں میں مبتلا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سگریٹ ہو یا 'القات' یا تمباکو ان تمام چیزوں کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ کوئی بھی انصاف پسند عالمِ دین ان کے استعمال کو جائز اور مباح نہیں قرار دے سکتا۔

متفرقات

سوال: بچے کی ولادت کے موقع پر کیا پڑھنا چاہیے؟

جواب: مسنون طریقہ یہ ہے کہ بچے کی ولادت کے بعد اس کے داہنے کان میں اذان دی جائے، حضور ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت کے بعد ایسا ہی کیا تھا تاکہ بچے کے کان میں پڑنے والی سب سے پہلی آواز توحید وتکبیر کی آواز ہو۔

سوال: کیا اِسقاط شدہ بچے کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟

جواب: ولادت کے بعد اگر بچہ چند لمحوں کے لیے بھی زندہ رہا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی ورنہ نہیں۔

سوال: بچے کی پیدائش روکنے کے لیے نس بندی کرانا کیا جائز ہے؟

جواب: یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ ''تغییر خلق اللہ'' (جسم انسانی میں اللہ کے بنائے ہوئے نظام میں) کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں ہے۔ نس بندی اللہ کے بنائے ہوئے نظام میں تبدیلی ہے، اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔ البتہ انتہائی مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ مثلاً بچہ پیدا کرنا ماں کی زندگی کے لیے خطرناک ہو اور اس خطرہ

کوٹا لنے کے لیے نس بندی کے علاوہ اور کوئی صورت نہ ہو۔

سوال: ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں مصروف ہو اور اس کے کپڑوں پر خون کی چھینٹ ہو تو کیا ان کپڑوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

جواب: جائز ہے۔ بشرطیکہ یہ چھینٹ معمولی ہو یا خون کے دھبے ایسے ہوں کہ ان کا دھونا اور صاف کرنا مشکل ہو۔

سوال: آپریشن کی کارروائی لمبی ہو تو کیا دو وقت کی نمازیں ایک ساتھ ملا کر پڑھی جا سکتی ہیں؟

جواب: آپریشن کی کارروائی ایک معقول شرعی عذر ہے اس لیے دو وقت کی نمازوں کا ایک ساتھ ادا کرنا جائز ہے۔ ایسی صورت میں ظہر اور عصر ایک ساتھ' مغرب اور عشاء ایک ساتھ ادا کی جا سکتی ہیں۔

سوال: کیا وضو میں پیر دھونے کے بجائے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

جواب: موزے پر مسح کرنا جائز ہے۔ متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ موزے پر مسح کی شرط یہ ہے کہ وضو کی حالت میں موزہ پہنا گیا ہو۔ مسافر شخص تین دن اور تین رات تک مسح کر سکتا ہے اور مقیم شخص ایک دن اور ایک رات تک۔ بشرطیکہ اس مدت میں موزے نہ اتارے جائیں۔

سوال: آپریشن کے دوران بسا اوقات ہم ڈاکٹروں کا بدن نرسوں سے چھو جاتا ہے تو کیا اس چھو جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب: جمہور علماء کے نزدیک بدن کے چھو جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔

سوال: ستر کا چھپانا فرض ہے' لیکن علاج اور آپریشن کے دوران بسا اوقات ستر کھولنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: علاج اور آپریشن کے دوران ستر کھولنے کی اجازت صرف انتہائی ضرورت کے موقع پر دی جا سکتی ہے اور وہ بھی بقدرِ ضرورت۔ بلا ضرورت ستر کھولنا

جائز نہیں ہے۔

سوال: زخم دھونے یا بدن صاف کرنے کے لیے اسپرٹ کا استعمال جائز ہے؟

جواب: اس میں کوئی حرج نہیں ہے' کیونکہ اسپرٹ شراب نہیں ہے۔ شراب پینے کے لیے بنائی جاتی ہے' جبکہ اسپرٹ طبی ضرورتوں کے لیے بنایا جاتا ہے۔

سوال: تنہائی میں کوئی ڈاکٹر کسی مریضہ کے پاس بیٹھ سکتا ہے؟

جواب: بیٹھ سکتا ہے' بشرطیکہ دروازہ کھلا ہو اور نگاہیں مریضہ کے جسم کا تعاقب نہ کریں۔

سوال: باس یا انچارج اگر غیر مسلم ہو تو کیا اسے سلام کرنے میں پہل کی جا سکتی ہے؟

جواب: اللہ کا حکم ہے کہ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (لوگوں سے اچھی بات کہو) ایک دوسری آیت میں اللہ حکم دیتا ہے: وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُ الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (اے محمد میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہ بات کہیں جو بہتر اور بھلی ہو) اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سلام میں پہل کرنا بھلی بات ہے۔ بہت ممکن ہے کہ غیر مسلم اس عمدہ اخلاق سے متأثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہو جائے۔

سوال: اکثر ایسی پارٹی یا کانفرنس میں شرکت ضروری ہوتی ہے۔ جس میں کھانے کے ساتھ شراب کا بھی اہتمام ہوتا ہے' کیا اس طرح کے دستر خوان پر بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا جا سکتا ہے؟

جواب: مسلمانوں کو چاہئے کہ حتی الامکان اس دستر خوان سے پرہیز کریں جس میں شراب کا انتظام ہو' کیونکہ حدیث میں ہے:

مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یَجْلِسْ عَلٰی مَآئِدَۃٍ یُّدَارُ عَلَیْھَا الْخَمْرُ (ترمذی)

''جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو' اسے چاہئے کہ اس دستر خوان پر نہ

بیٹھے جس میں شراب پلائی جارہی ہو''۔

البتہ مجبوری کی حالت میں اور کراہیت کے ساتھ اس دستر خوان پر بیٹھا جا سکتا ہے' کیونکہ اللہ کا فرمان ہے:

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ (الانعام:۱۱۹)

''اور جو چیزیں تم پر حرام کی گئی ہیں اللہ نے انہیں تفصیل سے بیان کر دیا ہے سوائے اس کے کہ تمہیں اضطرار کی حالت ہو''۔

سوال: آپس میں باتیں کرتے ہوئے لوگ عموماً ایک دوسرے کو اس کی غیر موجودگی میں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں ڈاکٹر اچھا نہیں ہے۔ جاہل ہے یا کام چور ہے' کیا یہ غیبت ہے؟

جواب: غیبت اور تنقید میں بڑا فرق ہے۔ جو بات غیبت کے ارادے سے کہی جائے وہ حرام ہے اور جو بات محض تنقید کے ارادے سے کہی جائے وہ غیبت نہیں ہے۔

سوال: کوئی شخص طویل ڈیوٹی انجام دینے کے بعد سو جائے اور نماز کا وقت ہو جائے تو کیا اس کی بیوی کو چاہئے کہ اس حالت میں اپنے تھکے ہوئے شوہر کو جگا دے یا اسے سوتا ہوا چھوڑ دے؟

جواب: اسلامی شریعت کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے سوتے ہوئے شخص کو مرفوع القلم (قابلِ معافی) قرار دیا ہے۔ اس لیے طویل ڈیوٹی انجام دینے کے بعد اگر کوئی شخص سوتا رہ گیا اور اس کی نماز چھوٹ گئی تو وہ قابلِ معافی ہے۔ بشرطیکہ نیند سے بیداری کے فوراً بعد نماز ادا کر لے اور بشرطیکہ وہ اسے اپنی عادت نہ بنا لے۔ بیوی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اپنے تھکے ماندے شوہر کو نیند پوری ہونے سے قبل جگا دے۔ کیونکہ یہ ڈیوٹی ایک دن کی نہیں ہے۔ یہ ڈیوٹی اسے روز انجام دینی ہے۔

سوال: ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے اگر ایک یا اس سے زائد بار جمعہ کی نماز چھوٹ جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: شریعت نے بغیر کسی عذر کے لگا تار تین بار جمعہ چھوڑنے سے منع کیا ہے اور اس پر سخت وعید آئی ہے۔ البتہ اگر کوئی شرعی عذر ہو مثلاً یہ کہ جمعہ کی نماز کے وقت آپریشن میں مشغول ہونا تو ایسی صورت میں جمعہ کی نماز کے بجائے ظہر کی نماز ادا کر لینی چاہیے۔ تاہم ہمیشہ کوشش اس بات کی ہو کہ جمعہ کی نماز چھوٹنے نہ پائے۔ یہ بات نماز پڑھنے والے کی نیت پر موقوف ہے کہ اسے واقعی شرعی عذر لاحق ہے یا نہیں۔

ساتواں باب

سیاسی مسائل

☆ اسلام اور سیاست

☆ اسلام اور جمہوریت

☆ اسلامی ملک میں سیاسی پارٹی

☆ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری

☆ سماج میں بُرائیوں کی روک تھام کے لیے طاقت کا استعمال

☆ نفاذِ اسلام کی کوشش

۷

اسلام اور سیاست

سوال: خودکو روشن خیال تصور کرنے والے بعض مسلم مفکرین نے ایک نئی اصطلاح ایجاد کی ہے جسے وہ ''سیاسی اسلام'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سیاسی اسلام سے مراد ان لوگوں کا اسلام ہے' جو دین میں سیاست کو شامل قرار دیتے ہیں اور دینی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی شامل رہتے ہیں۔ دراصل ان لوگوں نے یہ نئی اصطلاح ان لوگوں پر تنقید کرنے کے لیے ایجاد کی ہے' جو اسلام کو مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ کیا واقعی اسلام کا سیاست سے کوئی رشتہ نہیں ہے؟

جواب: بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلم دانشوروں میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اسلام کے دشمنوں کے خطوط پر سوچتے ہیں اور انہی کی پالیسیوں کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کو عملی زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے انہوں نے کبھی اسے ذاتی زندگی (Personal Life) تک محدود کر دیا تو کبھی اس کی صورت مسخ کرنے کے لیے اس کے مختلف ماڈل بنا ڈالے اور اسے مختلف نام عطا کر دیے۔ مثلاً سیاسی اسلام' اقتصادی اسلام' روشن خیال اسلام' رجعت پسند اسلام' ہندوستانی طرز کا اسلام' عربی طرز کا اسلام' ترکی کی طرز کا اسلام اور نہ جانے اسلام کے کون کون سے ماڈل انہوں نے وضع کر رکھے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک ہی ہے اور یہ وہ اسلام ہے جو قرآن و سنّت میں پایا جاتا ہے اور جسے حضور ﷺ' آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلفِ صالحین نے اپنے عملی نمونوں سے پیش کیا ہے۔

قرآن و حدیث کی تعلیمات اور حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

کے عملی نمونوں پر غور کرنے کے بعد پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلام سے سیاست کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ سیاست سے بے دخل ہونے کے بعد اسلام' اسلام نہیں رہ سکتا۔ کوئی دوسرا ہی دین بن جائے گا۔ کیونکہ:

(۱) اسلامی شریعت کے بہت سارے واضح احکام عین سیاست سے متعلق ہیں۔ اسلام محض روحانی عقیدہ یا چند دینی رسم و رواج کا نام نہیں ہے' بلکہ یہ عقیدہ بھی ہے اور عبادت بھی اور تمام دُنیوی معاملات کو بحسن و خوبی برتنے کا ایک بہترین نظام بھی۔ یہ دُنیوی مسائل خواہ سیاسی ہوں یا معاشرتی اور اقتصادی یا انکا تعلق معاملات سے ہو۔ یہ مسائل چاہے حالتِ امن سے تعلق رکھتے ہوں یا حالتِ جنگ سے' ان تمام امور میں دینِ اسلام کے واضح قواعد و اصول ہیں۔ ان اصول و قواعد سے روگردانی اور غیروں کے نظامِ حیات کی پیروی دراصل اس خالقِ کائنات سے بغاوت ہے' جس نے انسانوں کی بھلائی کے لیے یہ اصول و قواعد وضع کیے ہیں اور جن کی حقانیت کا زبانی دعویٰ کیا جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو عقیدۂ توحید محض ایک روحانی عقیدہ ہی نہیں ہے' بلکہ ایک انقلابی سیاسی نعرہ بھی ہے جو انسان کو مساوات' آزادی اور اخوت و محبت کی دعوت دیتا ہے۔ انسان کو انسان کی بندگی سے نکال کر خالقِ کائنات کی بندگی میں لے جانا چاہتا ہے' تاکہ کوئی بندہ بشر مطلق العنان حاکم بن کر دوسرے بندوں کے سیاسی اور سماجی حقوق نہ چھین لے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ جب بادشاہوں کے نام خطوط ارسال کرتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے تو آخر میں یہ آیتِ کریمہ ضرور نقل کرتے تھے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

(آل عمران: ۶۴)

''اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں''۔

(۲) خود کو سیاسی مسائل سے الگ تھلگ کر کے کوئی مسلمان مکمل مسلمان نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر ہر مسلمان پر اس بات کی ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ ''امر بالمعروف ونھی عن المنکر'' کا فریضہ انجام دے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے اس حکم کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلم شخص معاشرے کی جملہ برائیوں کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرے اور بھلی باتوں کو عام کرنے کے لیے سرگرم رہے۔ حضور ﷺ نے سب سے افضل جہاد اس عمل کو قرار دیا ہے کہ ظالم و جابر حکمراں کے روبرو حق بات کہی جائے۔ اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ ''سب سے افضل جہاد ظالم حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنا ہے''۔

اسلام اس بات کا حکم دیتا ہے کہ معاشرے میں کمزور اور مظلوم انسانوں کی مدد کی جائے اور ان کے حقوق کے لیے آواز بلند کی جائے۔ اللہ کا فرمان ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (النساء:۷۵)

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں''۔

اور اللہ ان لوگوں کے لیے سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے جو ظلم سہتے ہیں اور خاموش

رہتے ہیں اور کم از کم اتنا بھی نہیں کرتے کہ ظلم کی بستی سے ہجرت کر جائیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۝

(النساء:۹۷)

''جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے' ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بڑا بُرا ٹھکانا ہے''۔

اللہ لعنت بھیجتا ہے ایسے لوگوں پر جو معاشرے میں پھیلی ہوئی بُرائیوں پر خاموشی اختیار کیے رہتے ہیں اور انہیں دُور کرنے کی ذرہ برابر فکر نہیں کرتے۔ اللہ فرماتا ہے:

لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ (المائدۃ: ۷۸'۷۹)

''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی' ان پر داؤد اور عیسیٰ ابنِ مریم کی زبان سے لعنت کی گئی' کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ بہت بُرا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا تھا''۔

اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ برائیاں صرف چوری' شراب اور زنا وغیرہ کا نام ہے تو یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ بُرائی یہ بھی ہے کہ معصوم اور بے گناہ افراد کو جیلوں میں ڈال دیا

جائے اور ان پر سختی کی جائے۔ برائی یہ بھی ہے کہ الیکشن کے موقع پر ووٹوں کی دھاندلی کی جائے۔ برائی یہ بھی ہے کہ ووٹ ڈالنے سے پرہیز کیا جائے۔ برائی یہ بھی ہے کہ عوام کے پیسوں پر ناجائز قبضہ کرلیا جائے۔ جیسا کہ آج کل کے سیاسی لیڈران کرتے ہیں اور برائی یہ بھی ہے کہ اس مالی غبن پر خاموش رہا جائے اور اس کیخلاف آواز نہ اٹھائی جائے۔ برائی یہ بھی ہے کہ سیاسی معاملات میں دلچسپی نہ لے کر سیاست اور حکومت کی مکمل باگ ڈور ظالموں اور کافروں کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ یہ اور اس طرح کی بے شمار برائیاں ہیں جن کا تعلق سیاسی امور سے ہے اور ناممکن ہے کہ کوئی غیرت مند دین دار مسلمان ان برائیوں پر خاموش رہے اور کچھ نہ کرے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

اِذَا رَاَيْتَ اُمَّتِيْ تَهَابُ اَنْ تَقُوْلَ لِلظَّالِمِ يَا ظَالِمُ فَتَوَدَّعْ مِنْهُمْ

''جب تم میری اُمت کو دیکھو کہ ظالم کو ظالم کہنے سے ڈر رہی ہے تو پھر اسے الوداع کہہ دو (یعنی ایسی اُمت کا خاتمہ قریب ہے)''۔

بلاشبہ یہ ایمان کا تقاضا ہے کہ مومن شخص معاشرے اور ملک میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دُور کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ خواہ یہ برائیاں سماجی ہوں یا ثقافتی یا سیاسی۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص مومن ہونے کا دعویٰ کرے اور ان برائیوں کو پھلتا پھولتا دیکھے اور مطمئن رہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

مَنْ رَّاٰى مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانُ (مسلم)

''تم میں سے جو شخص برائی دیکھے تو چاہئے کہ اپنی قوت و طاقت سے اسے دور کرے۔ ایسا نہیں کرسکتا تو اپنی زبان سے دور کرے۔ ایسا بھی نہیں کرسکتا تو اپنے دل سے دور کرے (یعنی دل میں اسے برا سمجھے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔

عین ممکن ہے کہ اکیلا شخص برائیوں کے اس طوفان کا مقابلہ نہ کرسکے۔ خاص کر جبکہ

ملک کے سیاستداں اور اربابِ حل وعقد ہی ان برائیوں میں ملوث ہوں۔ اس صورتِ حال میں صحیح طریقۂ کار یہ ہوگا کہ بہت سارے افراد مل کر اجتماعی طور پر ان برائیوں کا مقابلہ کریں۔ یہ اجتماعی کوشش کسی آزاد تنظیم یا کسی سیاسی پارٹی کی بنیاد ڈال کر بھی کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ یہ سارے کام سیاسی کام ہیں اور مذکورہ حدیث کے مطابق ایمان کا عین تقاضا ہیں۔

آج کے جمہوری دور میں معاشرے میں پھیلتی ہوئی برائیوں کیخلاف مزاحمت کرنا یا حکومت کی غلط پالیسیوں پر تنقید کرنا اور ان کیخلاف آواز بلند کرنا' کسی بھی شخص کا جمہوری حق تصور کیا جاتا ہے' جبکہ دینِ اسلام اس حق کو صرف حق ہی نہیں' بلکہ واجب قرار دیتا ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ مومن اپنے ملک کے سماجی اور سیاسی حالات سے مکمل اور مستقل باخبر رہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے مسائل میں دلچسپی لے اور ان مسائل کے حل کے لیے ہمہ تن کوشاں رہے۔ ذرا حضور ﷺ کے اس فرمان پر غور کریں مَنْ لَّمْ يَهْتَمَّ بِاَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ ''جو شخص مسلمانوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا اور ان کی فکر نہیں کرتا وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے''۔

اور حضور ﷺ نے اس شخص کی موت کو جہالت کی موت قرار دیا ہے جو سیاست سے کنارہ کش ہو جائے اور کسی قائد یا حکمران کی تائید وحمایت کے لیے کمربستہ نہ رہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ لِاِمَامٍ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً (مسلم)

''جو شخص اس حالت میں وفات پائے کہ اس کی گردن میں کسی قائد کی بیعت نہ ہو (یعنی وہ کسی قائد کا حامی نہ ہو) تو وہ جہالت کی موت مرتا ہے''۔

اس حدیث کی روشنی میں یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ سیاسی معاملات میں کسی ایسے حکمران' قائد یا لیڈر کی حمایت ونصرت ضروری ہے' جو مسلمانوں کے معاملات میں

دلچسپی لیتا ہو انہیں حل کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہو اور دینِ اسلام کے غلبے کے لیے فکر مند رہتا ہو۔ یہ نری جہالت و گمراہی ہے کہ انسان اپنے اردگرد رُونما ہونے والے سیاسی اور سماجی معاملات سے بے خبر ہو کر زندگی گزارے اور اسی حالت میں مر جائے۔

جو لوگ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ کہ دین کو سیاست سے الگ کر کے رکھنا چاہیے' وہ دراصل قرآن و حدیث کی صریح اور واضح تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ مذکورہ قرآنی آیات و احادیث پر غور کریں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ دین سے سیاست کو الگ کرنا' جہالت و گمراہی ہے۔ بلکہ سیاسی مسائل سے بے خبر رہنا اور سیاسی بُرائیوں کو دور کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کرنا' اُمت مسلمہ کے حق میں گناہ ہے۔

دین کا سیاست سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ عین نماز کی حالت میں قرآن کی ان آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے' جن میں سیاسی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً وہ آیتیں جن میں مسلم دشمن حکمرانوں کی تائید و نصرت کی ممانعت ہے۔ یا جن میں دُنیوی معاملات کو اللہ کے قوانین کے مطابق حل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یا جن میں جنگوں کا تذکرہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح عین نماز کی حالت میں دعاءِ قنوت پڑھی جاتی ہے۔ یہ دعاءِ قنوت اس وقت پڑھی جاتی ہے' جب مسلمانوں پر کسی قسم کی دُنیوی یا آسمانی مصیبت نازل ہوتی ہے۔ مثلاً جنگ کی حالت ہو یا مسلمانوں پر کسی قسم کا سیاسی عذاب مسلط ہو جائے۔ یا قحط اور زلزلہ جیسی ناگہانی آفتیں ہوں۔ اس دعا میں ان مسائل کا تذکرہ کر کے ان سے عافیت کی دعا کی جاتی ہے۔

اس پوری تفصیل اور وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے تو یہ سراسر ہٹ دھرمی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ دین کو سیاست سے الگ کرنے کی باتیں کرتے ہیں وقت پڑنے پر یہی لوگ دین کا سہارا لے کر دیندار اور اسلام پسند لوگوں کے خلاف انتقامی

کارروائیاں کرتے ہیں۔ مثلاً مصر کے حکمرانوں نے جب الاخوان المسلمون کیخلاف انتقامی کارروائی کرنی چاہی اور یہ وہ لوگ تھے جو دین اور سیاست کو الگ الگ شے تصوّر کرتے تھے۔ ان لوگوں نے بعض گمراہ قسم کے علماء کا سہارا لیا اور ان سے اخوانیوں کیخلاف کارروائی کے لیے فتوے حاصل کیے۔ انہی علماء سے اس بات کے فتوے حاصل کیے گئے کہ اسرائیل سے مصالحت جائز ہے۔

علمی اعتبار سے سیاست ایک ایسا موضوع ہے جس کی خاص اہمیت ہے۔ کیونکہ یہ موضوع ملک وملت کی ذمّے داریوں کو بہ حسن وخوبی نبھانے سے تعلق رکھتا ہے۔ علماء نے سیاست کی یوں تعریف کی ہے کہ سیاست ان تدابیر کا نام ہے جو معاشرہ میں فلاح و بہبود لاتی ہیں اور ظلم وفساد کو دور کرتی ہیں۔

علاّمہ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عدل وانصاف پر مبنی سیاست' اسلامی شریعت کے خلاف نہیں ہوسکتی۔ بلکہ یہ عین اسلامی شریعت کا جز ہے۔ اسے ہم سیاست کا نام اس لیے دیتے ہیں کہ لوگوں میں یہی نام رائج ہے۔ ورنہ اس کے لیے عدلِ الٰہی کا نام زیادہ موزوں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور دنیا کے بغیر دین مکمل نہیں ہوسکتا۔ دین ایک بنیاد ہے اور حکمران اس بنیاد کا محافظ ہوتا ہے۔ اسی لیے عادل حکمرانوں کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب کہا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ اور داعی ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست سیاسی لیڈر بھی تھے اور یہی حال خلفاءِ راشدین کا تھا۔ ان سب کی سیاست عدل وانصاف پر مبنی اور فلاح وبہبود کی خاطر تھی۔ بُرا ہو ان سیاستدانوں کا جو جھوٹ' دھوکا' خیانت اور مکروفریب کے ذریعے سے اپنی سیاست کو چمکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لفظِ سیاست انہی کے گندے اعمال کا شکار ہو کر عوام النّاس میں بدنام ہو کر رہ گیا ہے' اور سیاست ایک گندی شے تصور کی جانے لگی ہے۔

سیاست سے عوام النّاس کی اس نفرت کو دیکھتے ہوئے مسلم دشمن عناصر کو بڑا اچھا موقع ہاتھ آ گیا کہ انہوں نے ان مسلم تنظیموں کو جو مکمل دین کی طرف دعوت دیتی ہیں'

انہیں سیاسی قرار دے دیا' تاکہ عوام الناس ان سے بدک جائیں۔ اب تو یہ عام سی بات ہوگئی ہے کہ کسی دیندار شخص کو بدنام کرنے اور اس کی اہمیت ومنزلت ختم کرنے کے لیے یہ کہنا کافی ہوتا ہے کہ یہ شخص سیاست کے چکر میں پڑ گیا ہے۔

اگر اسلام دشمنی کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا قرآن پڑھنا' مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرنا' بلکہ اسلام پر چلنا' سب کچھ سیاست سے تعبیر کیا جانے لگے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دن کے آنے سے پہلے ہم ہوش کے ناخن لیں۔

اسلام اور جمہوریت

سوال: مجھے سخت تعجب اور حیرت ہوئی جب میں نے کسی عالم دین کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جمہوریت اسلام کے منافی ہے اور یہ کہ جمہوریت کفر ہے' کیونکہ جمہوریت کا مفہوم ہے عوام اور اکثریت کی حاکمیت۔ جبکہ اسلام کی نظر میں حاکمیت انسانوں کی نہیں' بلکہ صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (الانعام: ۵۷)

''بلاشبہ حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے''۔

میری اپنی ناقص رائے یہ ہے کہ اس طرح کی باتوں سے اسلام کے دشمنوں کو شہ ملتی ہے اور وہ یہ کہتے نہیں جھجکتے کہ اسلام جمہوریت کا دشمن ہے اور ڈکٹیٹرشپ کا حامی۔ کیا واقعی اسلام کی نظر میں جمہوریت کفر اور گناہ ہے؟ براہِ کرم قرآن وسنّت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب: بہت افسوس اور تکلیف کی بات ہے کہ بعض دیندار حضرات اسلام کا صحیح اور مکمل علم نہ رکھنے کے باوجود اسلام کے سلسلے میں حق وناحق کچھ بھی کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی کیخلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دینا' ان کے لیے بڑی آسان سی بات ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کسی کیخلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دینا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جو

شخص کسی کیخلاف کفر کا فتویٰ صادر کرتا ہے' بہت ممکن ہے کہ یہ فتویٰ خود اس کی طرف پلٹ کر آجائے۔ بعض دیندار حضرات جمہوریت کے سلسلے میں اپنی اس عجیب وغریب رائے کا اظہار بڑی بے باکی سے کرتے رہتے ہیں حالانکہ انہیں خود پتہ نہیں ہے کہ جمہوریت کیا شے ہے؟

جمہوریت اس نظامِ حکومت کا نام ہے جسے انسان نے ڈکٹیٹر قسم کے حاکموں کے ظلم واستبداد کی ایک طویل تاریخ اور اس کیخلاف مسلسل جدوجہد کے بعد تجربہ وتحقیق کے نتیجے میں تلاش کیا ہے۔ اب ساری دنیا میں اسی نظامِ حکومت کا ڈنکا بجتا ہے اور ساری دنیا کے عوام اسی نظامِ حکومت کے نفاذ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس جمہوریت کے نفاذ کے لیے وہ مسلمان بھی جدوجہد کر رہے ہیں جو بعض غیر جمہوری ملکوں میں رہنے کی وجہ سے اسلام پر آزادانہ عمل اور اس کی تعلیم وتفہیم کی آزادی سے محروم ہیں۔

ڈکشنری اور سیاست کی کتابوں میں جمہوریت کی اصطلاحی تعریف کچھ بھی ہو لیکن اس کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی مرضی اور اپنی پسند کے حکمرانوں کے انتخاب میں مکمل آزادی ہو۔ ان پر ایسے حکمران مسلط نہ کر دیئے جائیں جنہیں وہ ناپسند کرتے ہوں یا ان کی مرضی کیخلاف ایسی معاشی ومعاشرتی پالیسیاں نہ تھوپ دی جائیں' جن میں ظلم واستبداد کا رنگ غالب ہو۔ اور انہیں اس بات کا پورا حق حاصل ہو کہ عوامی اور ملکی مفاد سے ہٹ کر چلنے والے حکمرانوں کا محاسبہ کر سکیں اور ضرورت پڑنے پر انہیں برطرف بھی کر سکیں۔

یہ ہے موجودہ جمہوریت کی حقیقت' جس کے عملی نفاذ کے لیے مختلف وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً الیکشن کی کارروائیاں' پارلیمنٹ کا قیام' متعدد سیاسی پارٹیوں کا وجود' اقلیت کو سیاسی اختلاف کی آزادی' صحافت کی آزادی اور عدلیہ کا غیر جانبدار ہونا وغیرہ وغیرہ۔

آپ ذرا غور کریں' کیا اس جمہوریت میں واقعی کوئی ایسی بات ہے جو اسلام کے

منافی ہے؟ کیا قرآن و سنّت سے ایک بھی ایسی دلیل پیش کی جا سکتی ہے جو اس جمہوریت کو اسلامی تعلیمات کیخلاف قرار دے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ جمہوریت اسلام کے منافی نہیں ہے' بلکہ عین اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ اسلام اس بات کا شدید مخالف ہے کہ لوگوں کی قیادت اور امامت کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں سونپ دی جائے جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں۔ چاہے یہ پورے ملک کی قیادت ہو یا نماز کے لیے ایک جماعت کی امامت ہو۔ حدیث شریف ہے:

ثَلَاثَةٌ لَا تَرْتَفِعُ صَلَاتُهُمْ فَوْقَ رُءُوسِهِمْ شِبْرًا اَحَدُهُمْ رَجُلٌ اَمَّ قَوْمًا وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ (ابن ماجہ)

''تین لوگ ایسے ہیں جن کی نماز ان کے سر سے اوپر ایک بالشت نہیں جاتی۔ ان تینوں میں سے ایک شخص وہ ہے جو نماز کی امامت کرے اور لوگ اس کی امامت کو ناپسند کرتے ہوں''۔

ذرا غور کریں کہ اسلام نماز باجماعت میں چند لوگوں کی قیادت کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دینے کیخلاف ہے جسے اکثریت ناپسند کرتی ہو تو پورے ملک کی قیادت کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دینا اسے کیسے گوارا ہوگا' جسے اکثریت پسند نہ کرتی ہو۔ اسی لیے حضور ﷺ کا فرمان ہے:

خِيَارُ اَئِمَّتِكُمْ اَىْ حُكَّامُكُمْ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ اَىْ تَدْعُوْنَ لَهُمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تَبْغَضُوْنَهُمْ وَيَبْغَضُوْنَكُمْ وَ تَلْعَنُوْنَهُمْ وَ يَلْعَنُوْنَكُمْ

(مسلم)

''تمہارے اچھے فرماں روا وہ ہیں جنہیں تم پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں پسند کرتے ہوں اور تم ان کے لیے دعائیں کرتے ہو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کرتے ہوں اور تمہارے بُرے فرماں روا وہ ہیں جن سے تم نفرت

کرتے ہو اور وہ تم سے نفرت کرتے ہوں اور تم انہیں لعن طعن کرتے ہو اور وہ تمہیں لعن طعن کرتے ہوں''۔

پورا قرآن پڑھ جایئے۔ جا بجا آپ کو اللہ کا قہر ان حکمرانوں پر ٹوٹتا نظر آئے گا جو اللہ کے بندوں پر ظلم کرتے ہیں۔ انہیں اللہ کے بجائے اپنی بندگی پر مجبور کرتے ہیں اور اللہ کی زمین پر ظلم و فساد برپا کرتے ہیں۔ قرآن میں متعدد مقامات پر فرعون' نمرود' ہامان اور عاد و ثمود کا تذکرہ اسی غرض و غایت کے تحت ہوا کہ ان لوگوں نے اللہ کی زمین پر ظلم و فساد برپا کیا تو اللہ نے ان کی زبردست پکڑ کی۔ ملاحظہ ہو سورۂ فجر کی مندرجہ ذیل آیتیں:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ٥ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ٥ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ٥ وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ٥ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ٥ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ٥ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ٥ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ٥ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ٥ (الفجر: ۶-۱۴)

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے ربّ نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی۔ اور ثمود کے ساتھ' جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں۔ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ جنہوں نے ملکوں میں سرکشی اختیار کی تھی۔ اور ان میں بڑا فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے ربّ نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا' حقیقت یہ ہے کہ تمہارا ربّ گھات لگائے ہوئے ہے''۔ قرآن صرف انہی ظالم حکمرانوں کی سرزنش نہیں کرتا بلکہ اللہ کی نظر میں وہ عوام النّاس (پبلک) بھی مجرم اور قصوروار ہیں جو ان ظالم حکمرانوں کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

وَ تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ

جَبَّارٍ عَنِيْدٍ○ (ھود:۵۹)

''یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا۔ اس کے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر سرکش اور ظالم و جابر کی پیروی کی''۔

وہ فوج بھی اللہ کی نظر میں قصوروار ہے جسے ظالم حکمراں عوام الناس پر ظلم و استبداد کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ○ (القصص:۸)

''بلاشبہ فرعون وہامان اور ان کی فوج غلطی پر تھے''۔

قرآن کے علاوہ صحیح احادیث میں بھی ان ڈکٹیٹر قسم کے حکمرانوں کے لیے زبردست وعید ہے، جو عوام الناس پر ظلم کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

اِنَّ فِيْ جَهَنَّمَ وَادِيًا وَفِي الْوَادِيْ بِئْرٌ يُّقَالُ لَهٗ هَبْهَبُ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّسْكِنَهٗ كُلَّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (طبرانی، حاکم)

''جہنم میں ایک وادی ہے اس وادی میں ایک کنواں ہے جس کا نام ہبہب ہے۔ اللہ نے اپنے اوپر فرض کرلیا ہے کہ اس میں ان لوگوں کو ڈالے گا جو ظالم و جابر ہیں''۔

کون نہیں جانتا کہ اسلامی نظامِ حکومت میں شُوریٰ کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ شُوریٰ یہ ہے کہ عوام الناس (پبلک) میں سے چند ایسے افراد منتخب ہوں جو باصلاحیت اور تجربہ کار ہوں، تاکہ حاکم وقت کارہائے سیاست چلانے میں ان سے مشورے لیتا رہے۔ شُوریٰ کی طرح عوام الناس بھی اس بات کے پابند ہیں کہ اپنے سیاستدانوں اور حکمرانوں کو مفید مشورے دیتے رہیں۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ ''الدین النصیحۃ'' (دین نصیحت ہے) اس حدیث کے الفاظ کے مطابق یہ نصیحت حکمرانوں کے لیے بھی ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ اپنے عمدہ مشورے اپنے حکمرانوں تک

پہنچاتے رہیں اور اگر انہیں غلطی پر دیکھیں تو انہیں نصیحت کریں۔ بلکہ ظالم حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنے کو نبی ﷺ نے افضل جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ "اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ تُقَالُ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ" سب سے افضل جہاد کسی ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہنا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات نہایت پسند ہے کہ ظالم حاکموں کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کیا جائے اور حکومت چلانے کے لیے انہیں بہتر پالیسیوں سے باخبر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاءِ راشدین نے مسند خلافت پر بیٹھنے کے معاً بعد جو خطبہ دیا تھا' اس میں اس بات کی طرف بھی واضح اشارہ کیا تھا۔ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی تھی اس میں یہ بات کہی تھی ایها النّاس انی ولیت علیکم ولست بخیر کم فان رایتمونی علی حق فاعینونی وان رایتمونی علی باطل فسددونی ''اے لوگو! میں تمہارا سربراہ مقرر کیا گیا ہوں' حالانکہ میں سب سے بہتر شخص نہیں ہوں۔ اگر تم مجھے حق پر دیکھو تو میری مدد کرنا۔ اور اگر غلطی پر دیکھو تو مجھے سیدھا راستہ دکھانا''۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کچھ اسی طرح کی بات کہی تھی ایها النّاس من رای منکم فی اعوجا جا فلیقومنی ''اے لوگو! تم میں سے جو میرے اندر کجی پائے تو وہ مجھے ٹھیک کردے''۔

کسی بھری محفل میں جب کسی عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی بات پر ٹوکا تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اصابت المراۃ واخطا عمر ''عورت نے ٹھیک بات کہی اور عمر سے غلطی ہوگئی''۔

آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ جمہوریت کا بنیادی ڈھانچہ اسلامی نظامِ حکومت سے بہت مختلف نہیں ہے۔ موجودہ جمہوریت میں بھی عوام میں سے چند لوگ منتخب ہوکر پارلیمنٹ میں جاتے ہیں۔ سربراہِ مملکت ان ممبران پارلیمنٹ کے مشورے سے کارہائے حکومت انجام دیتا ہے۔ عوام النّاس (پبلک) کو اختلافِ رائے کا حق

حاصل ہوتا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ حکومت کی غلط پالیسیوں پر تنقید کریں اور اپنے مفید مشوروں کے ذریعے سے حکومت کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں مدد دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے جمہوریت کے لیے بنیادی اصول پہلے ہی فراہم کر دیئے تھے اور باقی رہیں اس کی تفصیلات اور جزئیات تو یہ لوگوں کے صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے زمانے کی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق طے کر لیں۔

موجودہ دور کے انسان نے ڈکٹیٹر اور ظالم و جابر حکمرانوں اور بادشاہوں کیخلاف طویل جنگ کے بعد ایک ایسا نظامِ حکومت تلاش کیا ہے جسے انہوں نے جمہوریت کا نام دیا ہے اور جس میں عوام الناس کو ظالم حکمرانوں کے جنگل سے آزاد کرنے اور انہیں بنیادی حقوق دلانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

جمہوریت کو جمہوریت کا نام عطا کرنے والے اور اس کے اصول و قواعد وضع کرنے والے اگرچہ ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہیں، لیکن اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم غیر قوموں سے اچھی باتیں سیکھیں اور انہیں اختیار کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی یہی ہے کہ حکمت و دانائی کی باتیں مومن کی گم شدہ دولت ہے۔ جہاں سے انہیں یہ دولت مل جائے انہیں اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ حکمت و دانائی کی باتیں اور نفع بخش چیزیں اگر ہمیں غیر مسلموں سے ملتی ہیں تو ہمیں انہیں اختیار کرنا چاہیے۔ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے اور اسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین کا عمل تھا۔ چنانچہ غزوۂ خندق کے موقعے پر خندق کھود کر جنگ کرنے کا طریقہ انہوں نے غیر مسلموں سے سیکھا۔ اور جنگ بدر کے جنگی قیدیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط پر رہائی عطا کی کہ وہ مسلمانوں کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں گے۔ غیر مسلموں سے لکھنا پڑھنا اور دوسری مفید باتیں ان سے سیکھنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہمیں جہاں سے بھی اچھی اور نفع بخش باتیں حاصل ہوں انہیں اختیار کرنے میں ہی ہماری بھلائی ہے۔ اس بنیاد پر

میں ہمیشہ اپنے اس موقف کا اظہار کرتا آیا ہوں کہ غیر قوموں کے اچھے خیالات، بہتر طرز رہائش، مفید ٹیکنالوجی اور نفع بخش قوانین وضوابط کو اختیار کرنا ہمارے حق میں بہتر ہے بشرطیکہ یہ خیالات اور قوانین قرآن وحدیث اور اسلام کے بنیادی اصول وضوابط کیخلاف نہ ہوں۔

موجودہ جمہوریت کے اصول وضوابط پر غور کریں تو اس میں وہ بہت ساری باتیں ملیں گی جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ صرف نام کا فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ موجودہ جمہوریت میں الیکشن اور ووٹنگ وہی چیز ہے جسے اسلامی قانون میں ''شہادت'' کا نام دیا گیا ہے۔ شہادت کا مفہوم یہ ہے کہ اچھے لوگوں کے حق میں گواہی دی جائے کہ وہ اچھے ہیں۔ ووٹنگ بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ باصلاحیت لوگوں کے حق میں گواہی دی جائے اور اپنی اس رائے کا اظہار کیا جائے کہ یہ لوگ حکومت چلانے کے لیے مناسب افراد ہیں۔ اسلام کی نظر میں شہادت نہ دینا اور اسے چھپانا جس طرح گناہ ہے میرے خیال میں ووٹ نہ ڈالنا بھی اسی طرح گناہ ہے، کیونکہ اگر ووٹ کے ذریعے سے اچھے لوگوں کو حکومت میں لانے کی کوشش نہ کی گئی تو یقیناً حکومت میں وہ لوگ آجائیں گے جو عوام اور ملک دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ اللہ کا فرمان ہے:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ (البقرۃ:۲۸۳)

''اور گواہی نہ چھپاؤ، جو شخص گواہی چھپائے گا اس کا دل گناہگار ہے''

جس طرح شہادت کو چھپانا گناہ ہے اسی طرح یہ بھی گناہ ہے کہ ایسے لوگوں کے حق میں شہادت یا ووٹ دیا جائے جو نامناسب اور غلط قسم کے ہوں۔ ایسے لوگوں کے حق میں ووٹ دینا فرض ہے جو عدل وانصاف کے علمبردار ہیں۔ ملاحظہ ہو اللہ کا یہ فرمان:

وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ (الطلاق:۲)

''اور تم اپنے میں سے دو صاحب عدل لوگوں کو گواہ بناؤ''۔

اسی طرح ہمیں اس بات کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ ہم یہ شہادت یا ووٹ اس بنا پر نہ

دیں کہ فلاں ہمارا رشتہ دار ہے' یا ہمارے علاقہ کا ہے' یا ہماری پارٹی کا ہے' بلکہ صرف اللہ کی خاطر ووٹ دیں اور ایسے لوگوں کے حق میں دیں جو اچھے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق:۲)

''اور اللہ کی خاطر گواہی قائم کرو''۔

اسی طرح موجودہ جمہوریت میں ہم جس چیز کو پارلیمنٹ کہتے ہیں اسلامی اصطلاح میں اس کا نام شُوریٰ ہے۔ اسی طرح موجودہ جمہوریت میں آزادئ رائے' انسانی حقوق' ہر خاص و عام کے لیے یکساں قانون اور یکساں عدل و انصاف اور اس طرح کے بے شمار ایسے اصول و قوانین ہیں جنہیں اسلامی شریعت نے بھی اسی قدر اہمیت دی ہے' جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ موجودہ جمہوریت میں عوام النّاس کی حاکمیت ہوتی ہے' جبکہ اسلام صرف اللہ کی حاکمیت کا قائل ہے ان کا اعتراض ہی بے بنیاد ہے' کیونکہ جمہوریت میں عوام النّاس کی حاکمیت کے دعویٰ کا مطلب خدا کی حاکمیت سے اعلانِ آزادی نہیں ہے' بلکہ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ڈکٹیٹر قسم کے حکمرانوں کے ہاتھوں سے زمام حکومت چھین کر عوام النّاس کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔ تاکہ چند ڈکٹیٹر قسم کے لوگ عوام النّاس کی تقدیر کے مالک بن کر ان پر ظلم و جور نہ کر سکیں۔

عوام النّاس کی حاکمیت کا مفہوم یہ ہے کہ عوام النّاس اپنی مرضی سے اچھے لوگوں کا انتخاب کر سکیں اور انتخاب کے بعد اگر یہ لوگ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں تو ان کی غلطیوں پر محاسبہ کر سکیں اور ضرورت پڑنے پر ان کے منصب سے انہیں برطرف بھی کر سکیں۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اسلامی قوانین یا اللہ کی حاکمیت کیخلاف ہو۔ اللہ کی حاکمیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی اس تمام کائنات کا مدبر اور منتظم ہے۔ ساری کائنات میں اسی کا حکم چلتا ہے اور اسی کے اشارہ پر سب کچھ ہوتا ہے۔ ایک پتا بھی اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ اللہ کی حاکمیت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ حلال و حرام اور صحیح و غلط کا فیصلہ کرنا' اللہ کا کام ہے۔ اللہ نے جسے حلال قرار دیا اسے کوئی حرام نہیں قرار دے سکتا اور اللہ نے جس چیز کو

غلط کہہ دیا ہے وہ چیز صحیح نہیں ہوسکتی۔

الغرض جمہوریت کو بطورِ نظام تسلیم کرنے کا مطلب اللہ کی حاکمیت سے انکار نہیں ہے اور نہ عوام النّاس کو حاکم مان کر اللہ کے برابر لا کھڑا کرنا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جمہوریت ہی وہ طرزِ حکومت ہے جس کے ذریعے سے اسلام کے بنیادی سیاسی اصول وقواعد کو عملاً نافذ کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ جمہوریت کے مخالفین ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ جمہوریت میں اکثریت کی رائے کو ہی حق بجانب سمجھ کر اسے قبول کرلیا جاتا ہے اور اقلیت کی رائے ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔ گویا حق کا معیار اکثریت ہے نہ کہ قرآن وسنّت اور اسلامی شریعت۔ جبکہ اسلامی شریعت کی رُو سے حق بات وہ ہے جو قرآن وسنّت کے مطابق ہے چاہے اکثریت اس کیخلاف ہو اور غلط بات وہ ہے جو قرآن وسنّت کے خلاف ہے خواہ اکثریت اس کے حق میں ہو یعنی کسی بات کے حق وناحق ہونے کا معیار قرآن وسنّت ہے نہ کہا اکثریت واقلیت کا رجحان۔ لیکن یہ اعتراض سراسر بے بنیاد ہے' کیونکہ اسلامی جمہوریت میں اکثریت واقلیت کا رجحان ان باتوں میں معلوم کیا جاتا ہے جن میں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے اور یہ باتیں دین کے بنیادی اصول وقواعد سے تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ جن امور کے بارے میں قرآن وحدیث کا فیصلہ ہوچکا ہے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط ان میں اکثریت واقلیت کا رجحان نہیں جانا جاتا ہے' بلکہ ان باتوں میں رجحان معلوم کیا جاتا ہے جنہیں ہم اجتہادی معاملات کہتے ہیں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔ مثلاً ٹیکسوں کی تعیین کا مسئلہ' ٹریفک کے قوانین کے اِنضباط کا مسئلہ۔ بہت سارے امیدواروں میں سے کسی ایک امیدوار کے انتخاب کا مسئلہ یا ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے بے شمار دُنیوی مسائل ہیں' جن میں عموماً لوگوں کی رائے مختلف ہوجاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان مختلف رایوں میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی معیار تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کا سب سے عمدہ معیار یہ ہے کہ اکثریت کو

معیار تسلیم کیا جائے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک کے مقابلہ میں دو لوگوں کی رائے زیادہ بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خود حضور ﷺ اور خلفاءِ راشدین نے بھی اسی معیار کو اختیار کیا تھا۔ حضور ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

لَوِ اجْتَمَعْتُمَا عَلٰى مَشُوْرَةٍ مَّا خَالَفْتُكُمَا (مسند احمد)

"تم دونوں اگر کسی مسئلہ پر ایک رائے ہو جاؤ تو میں تمہارے خلاف نہیں کروں گا"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خود حضور ﷺ نے ایک کے مقابلے میں دو کی رائے کو فوقیت دی تھی۔ چنانچہ غزوۂ احد کے موقع پر حضور ﷺ نے اکثریت کی رائے کو اختیار کیا جو اس بات کے حق میں تھی کہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کی جائے، جبکہ بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور خود حضور ﷺ کی رائے اس سے مختلف تھی۔ وہ شہر کے اندر رہ کر جنگ کرنا چاہ رہے تھے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ وقت کے انتخاب کے لیے جس مجلس شوریٰ کا اعلان کیا تھا انہیں یہ تلقین کی تھی کہ مجلس شوریٰ میں اکثریت جس کے حق میں ہو اسی کو خلیفۂ وقت تسلیم کیا جائے۔ اسی طرح حدیث میں "سوادِ اعظم" کے اِتباع کی تلقین کی گئی ہے۔ سوادِ اعظم کا مطلب ہے لوگوں کی اکثریت۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جو جمہوریت کا مطالبہ کر رہے ہیں، کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام اور ملت اسلامیہ کو سب سے زیادہ نقصان ان ملکوں اور ان وقتوں میں پہنچا ہے جب لوگوں کی آزادی سلب کر لی گئی۔ ان پر جابر و ظالم حکمراں مسلط کر دیئے گئے۔ دعوتِ دین کے کاموں پر پابندی لگا دی گئی اور عوام الناس کو اللہ کی مرضی کا نہیں، بلکہ حکمرانوں کی مرضی کا پابند بنا دیا گیا۔ اسلام کے لیے ڈکٹیٹر شپ ایک بڑا چیلنج ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ڈکٹیٹر شپ کیخلاف جنگ کی جائے اور جمہوریت بحال کرنے کے لیے تمام تر جدوجہد کی جائے، کیونکہ اسی جمہوریت کے سائے میں اسلام پر عمل کرنے کی آزادی نصیب ہو سکتی ہے،

دعوت کی راہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں، عدل و انصاف مل سکتا ہے اور فاسق و فاجر قسم کے حکمرانوں کو بزورِ طاقت ان کی تباہ کاریوں سے روکا جا سکتا ہے۔

اسلامی ملک میں سیاسی پارٹی

سوال: کیا کسی اسلامی ملک میں اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کا وجود ہو؟ بعض علماءِ دین اس بات کے خلاف ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اسلام اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتا ہے اور فرقہ بندی سے روکتا ہے۔ متعدد سیاسی پارٹیوں کی تشکیل فرقہ بندی اور انتشار و تفرقہ کی طرف لے جاتا ہے۔ کیا ان علماءِ کرام کا موقف درست ہے؟

جواب: میں اپنی اس رائے کا متعدد بار اظہار کر چکا ہوں کہ اسلامی ملک کے اندر مختلف سیاسی پارٹیوں کی تشکیل میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے، کیونکہ اس ممانعت کے لیے کوئی شرعی دلیل قرآن و حدیث میں نہیں ہے اور بغیر کسی واضح دلیل کے کسی جائز چیز کو ناجائز قرار دینا صحیح نہیں ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ دورِ حاضر میں سیاسی پارٹیوں کی تشکیل نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ وقت کی شدید ضرورت ہے، تاکہ ملک کے اندر کسی ایک ہی پارٹی کی اجارہ داری نہ ہو کہ وہ تمام معاملات میں اپنی من مانی کرتی پھرے، اور کوئی اپوزیشن پارٹی نہ ہو جو اس کے نامناسب اقدامات پر اس کی گرفت کر سکے۔ آج ہم اپنی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ بعض غیر جمہوری ملکوں میں کسی ایک ہی پارٹی کے سیاسی استبداد کی وجہ سے معارضین پر کس قدر ظلم ہو رہا ہے۔ تاہم سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کی اجازت دو شرطوں کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔

پہلی شرط یہ کہ تشکیل پانے والی پارٹی اسلام کو بہ حیثیت عقیدہ اور اسلامی شریعت کو بہ حیثیتِ قانون تسلیم کرتی ہو اور اسلام کے ساتھ اس کا رویہ معاندانہ نہ ہو۔ اجتہادی مسائل میں اگر اس کے نظریات دوسری اسلامی پارٹیوں سے مختلف ہوں تو اس میں کوئی

مضائقہ نہیں ہے۔اور دوسری شرط یہ ہے کہ یہ پارٹی اسلام کے دشمنوں کے مفاد کے لیے کام نہ کرے۔

اسلامی ملک کے اندر اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ کسی ایسی سیاسی پارٹی کی تشکیل ہو جو سرے سے اسلامی عقیدہ و شریعت ہی کو نہ تسلیم کرتی ہو' حضور ﷺ کے واضح احکام و تعلیمات کا مذاق اڑاتی ہو اور کفر و الحاد کی دعوت دیتی ہو۔

متعدد سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کا مقصد یہ ہے کہ کوئی ایک ہی سیاسی پارٹی پورے ملک کے سیاہ و سپید کی مالک نہ بن جائے اور اپنی من مانی کرتی پھرے اور کوئی اسے روکنے والا نہ ہو۔اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کے علاوہ کوئی دوسری مضبوط پارٹی بھی ہو جسے سیاست کی اصطلاح میں اپوزیشن پارٹی کہتے ہیں' تاکہ وہ برسرِ اقتدار پارٹی کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکے۔ اس کا مستقل محاسبہ کرے۔ غلط پالیسیوں پر اس کی گرفت کرے اور مفید مشورے دے سکے۔

یہ باتیں میں اپنی طرف سے نہیں پیش کر رہا ہوں' بلکہ یہ نظریہ قرآن و سنّت کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔قرآن و سنّت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے امراء و حکام کو نصیحت کرتے رہیں۔مفید مشورے دیتے رہیں اور غلط اقدامات سے انہیں روکتے رہیں۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے:

إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَى يَدَيْهِ أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ مِّنْ عِنْدِهِ (ترمذی' ابوداؤد)

لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کی گرفت نہ کریں تو بہت قریب ہے کہ اللہ ان سب پر اپنا عذاب نازل کرے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر بیٹھے تھے تو لوگوں کے نام اپنے سب سے پہلے خطاب میں یہی بات کہی تھی کہ مجھے سیدھے راستہ پر دیکھنا تو

میری مدد کرنا اور مجھے غلط راستہ پر دیکھنا تو میری پکڑ کرنا اور میری اصلاح کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی غلط پالیسیوں پر تنقید کرنے کا جمہوری حق اور اس جیسے دوسرے جمہوری حقوق سے لوگوں کو سب سے پہلے اسلام ہی نے متعارف کرایا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی تشکیل بھی ان ہی جمہوری حقوق میں سے ایک ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دورِ حاضر میں وہ کون سے وسائل ہیں جن کے ذریعے سے حکومت کی غلط پالیسیوں پر تنقید کی جا سکتی ہے اور اسے نامناسب اقدامات سے روکا جا سکتا ہے؟ اور اپنے مفید و مثبت مشوروں کو حکومت سے منوایا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ تیر و تلوار اور اسلحہ کے ذریعے سے یہ مقصد حاصل کرنا یا زمین پر فساد برپا کر کے حکومت کو مجبور کرنا، اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح اقدام نہیں کہا جا سکتا۔

انسان نے ایک طویل تجربے کے بعد اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ایسا مؤثر اور پُر امن طریقہ تلاش کیا ہے جس کے ذریعے سے بغیر کسی خون خرابے کے حکومتِ وقت پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے اور یہ طریقہ ہے ملک کے اندر سیاسی پارٹیوں کا وجود یا کم از کم اپوزیشن پارٹی کا وجود۔

حاکمِ وقت کے لیے کسی ایک نہتے فردِ مخالف پر قابو پانا اور کچل ڈالنا نہایت آسان کام ہے، لیکن اس کی مخالفت پر اگر کوئی مضبوط سیاسی پارٹی ہو تو اس کی آواز کو دبانا حاکمِ وقت کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ حکومت کو اگر یہ احساس ہو کہ اس کے محاسبہ اور اس کی گرفت کرنے کے لیے ملک میں اپوزیشن پارٹیاں موجود ہیں تو اس کے لیے من مانی کرنا آسان نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے وسیع تر مفاد کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے اندر دوسری سیاسی پارٹیوں کا بھی وجود ہو تاکہ برسرِ اقتدار پارٹی کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جا سکے۔ اس کا محاسبہ اور اس کی باز پرس ہوتی رہے۔ اسے مفید مشورے ملتے رہیں اور وہ نفع بخش پالیسیوں سے باخبر ہوتی رہے۔ اسے بھلائیوں کی طرف رہنمائی کی جا سکے اور

بُرائیوں سے روکا جا سکے اور بلاشبہ یہ نظریہ عین اسلامی نظریۂ سیاست ہے۔

بعض سادہ لوح حضرات تصور کرتے ہیں کہ حکومتِ وقت اگر اللہ کی شریعت کے مطابق کام کر رہی ہو تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے تمام افراد اس حکومت کی تائید کریں اور حاکم وقت کی مکمل اطاعت کریں' کیونکہ قرآن کی رُو سے اولیاء الاُمور کی اطاعت واجب ہے۔

میں ان سادہ لوحوں سے کہنا چاہوں گا کہ کسی بھی اسلامی ملک کا سربراہ کوئی فرشتہ یا معصوم عن الخطا نہیں ہوتا۔ اس سے بھی غلطیوں کا امکان ہے اور اس کے وزراء اور دوسرے ممبران حکومت سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں' کیونکہ یہ سب انسان ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی اچھائیوں اور بُرائیوں دونوں پر نظر رکھی جائے۔ جب تک اچھے ہیں اُن کی اطاعت کی جائے اور جب بُرائیوں کی طرف مائل ہونے لگیں تو ان کی گرفت کی جائے' جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطاب میں اپیل کی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایسی سیاسی پارٹیوں کا وجود ضروری ہے جو حکومت وقت کی گرفت کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہوں۔

تاہم اس میں ایک قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ اسلامی ملک میں سیاسی پارٹیوں کا وجود شخصی یا علاقائی بنیاد پر نہ ہو۔ مثلاً یہ نہ ہو کہ یہ فلاں شخص کی پارٹی ہے اور وہ فلاں شخص کی پارٹی ہے۔ یہ فلاں علاقہ کی پارٹی ہے اور وہ فلاں علاقہ کی پارٹی ہے' کیونکہ ایسا کرنے سے عصبیتیں جنم لیتی ہیں اور باہمی تفرقہ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ جو شخص جس پارٹی سے منسلک ہوتا ہے' غلط اور صحیح ہر صورت میں اپنی ہی پارٹی یا اپنے علاقہ کی پارٹی کی حمایت کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کی پارٹی کا موقف صحیح ہے یا غلط۔

ہونا یہ چاہئے کہ پارٹی کا وجود نظریاتی اور فکری بنیادوں پر ہو۔ کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جانا اور لوگوں کا الگ الگ پارٹیوں میں منقسم ہو جانا عین فطری بات ہے۔ ملکی اور ملی مسائل میں بھی لوگوں کے الگ الگ نظریے اور رائیں ہو سکتی ہیں۔ اس بنیاد پر

ملک کے اندر مختلف سیاسی پارٹیوں کا وجود ایک صحت مند علامت ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے فقہی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے مختلف مسلک وجود میں آئے۔ کوئی بھی مسلمان اپنے خاص فقہی مسلک مثلاً حنفی یا شافعی مسلک سے منسلک ہونے کے باوجود دوسرے مسلک کے مسلمانوں کو نہ تو کافر سمجھتا ہے اور نہ گمراہ۔ بلکہ اس مسلک کے اختلاف کے باوجود سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

بالکل یہی صورتِ حال ہے سیاسی مسائل میں اختلاف کے نتیجہ میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے وجود میں آنے کی۔ یہ اعتراض کرنا بالکل غلط ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے وجود سے ملک کے اندر تفرقہ اور دشمنی جنم لے گی۔ جس طرح فقہی مسائل میں اختلاف کے نتیجہ میں مختلف مسلک ہو سکتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی دشمنی یا عداوت نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح سیاسی مسائل میں اختلاف کے نتیجہ میں مختلف سیاسی پارٹیاں وجود میں آ سکتی ہیں اور یہ کوئی تفرقہ بندی یا انتشار نہیں ہے۔

سیاسی پارٹیوں کے وجود کے سلسلے میں لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ یہ فکر مغربی ممالک کی دَین ہے اور ہمیں ان کی تقلید کرنے یا مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے' کیونکہ ہمیں ہر طرح کی تقلید سے نہیں' بلکہ صرف اندھی تقلید سے منع کیا گیا ہے اور ان چیزوں میں مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے جو غیر قوموں کی وجہ امتیاز ہیں مثلاً عیسائیوں کی طرح صلیب پہننا یا ہندوؤں کی طرح پیشانی پر تلک لگانا۔ جس نے یہ مشابہت اختیار کی وہ اسی قوم کا فرد شمار کیا جانے لگے گا۔ البتہ اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دوسری قوموں کی اچھی اور مفید باتیں اختیار کی جائیں' بلکہ ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اچھی اور مفید باتیں جہاں سے ملیں انہیں اختیار کرنا چاہئے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے جنگ میں خندق کھودنے کا طریقہ ایرانیوں سے سیکھا اور بادشاہوں کے پاس خطوط بھیجتے وقت ان پر مہر ثبت کرنے کے لیے انگوٹھی کا

استعمال دوسرے ملک کے بادشاہوں سے سیکھا۔ اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ نے ٹیکس اور دیوان کا نظام غیر قوموں سے سیکھا اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے ڈاک کا نظام دوسری قوموں سے اختیار کیا۔

اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ غیر قوموں سے سیکھ کر جمہوریت اختیار کی جائے اور جمہوریت کے تحت متعدد سیاسی پارٹیوں کے وجود کو جائز قرار دیا جائے۔ بشرطیکہ:

(۱) اس کا اختیار کرنا ہمارے لیے مفید ہو۔

(۲) اسے اختیار کر کے اس میں بعض تبدیلیاں لائی جائیں تا کہ یہ چیز ہماری شریعت سے ہم آہنگ ہو جائے۔

غیر مسلموں کے ساتھ رواداری

سوال: بعض دیندار حضرات اس بات کو اسلامی غیرت وحمیت کا تقاضا سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ ان کا سلوک معاندانہ ہو۔ یہ لوگ غیر مسلموں کے لیے اپنے دل میں ایک طرح کا بُغض وعناد رکھتے ہیں اور بعض تو ایسے ہیں جو ان پر ظلم وزیادتی کو گناہ نہیں سمجھتے' بلکہ اسے دینی حمیت قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی اسلامی ملک میں غیر مسلم اقلیت میں ہوں اور ان کے ساتھ معاندانہ سلوک کیا جائے تو مسلم دشمن مغربی ممالک کو اسلام اور مسلمانوں کیخلاف پروپیگنڈا کرنے کا بہترین موقع مل جاتا ہے۔ جو لوگ عالمی سیاست پر نظر رکھتے ہیں' وہ ان باتوں سے بخوبی واقف ہوں گے۔

براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ کس طرح کے سلوک کا حکم دیتا ہے۔ یہ سلوک بُغض وعداوت پر مبنی ہونا چاہیے یا اخوت ومحبت اور رواداری پر؟

جواب: غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے' ایک نہایت سنجیدہ اور اہم

مسئلہ ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس سلسلے میں اسلام کا صحیح موقف پیش کیا جائے کیونکہ بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں اس معاملے میں زبردست غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں' لیکن قبل اس کے کہ میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کروں چند حقائق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ بعض شدت پسند مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ معاندانہ رویہ ان کا اپنا ذاتی فعل ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کو قصوروار نہیں تصوّر کرنا چاہئے کیونکہ اسلام نے اس کا حکم نہیں دیا ہے۔

(۲) اپنے اس سخت گیر موقف کی وجہ سے اس طرح کے مسلمان نہ صرف یہ کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے مسئلہ بن جاتے ہیں' بلکہ خود اسلام کی بدنامی کا بھی سبب بن جاتے ہیں۔ غیر مسلمین انکا رویہ دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ ان کا دینِ اسلام اس طرح کے غیر اخلاقی سلوک کا حکم دیتا ہے۔

(۳) اگر ان سخت گیر قسم کے مسلمانوں کے ماحول کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اس رویے کے پیچھے صرف مذہبی عنصر ہی کارفرما نہیں ہے' بلکہ بعض نفسیاتی' معاشرتی اور اقتصادی عوامل بھی کارفرما ہیں۔

(۴) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ ان کا معاندانہ سلوک خود غیر مسلموں کے معاندانہ سلوک کا ردّعمل ہے چونکہ بعض شدت پسند غیر مسلم عناصر مسلمانوں کے ساتھ کھلم کھلا دشمنی کا اظہار کرتے ہیں' اس لیے اس کے ردعمل میں بعض مسلمان بھی ان کے ساتھ اس طرح کے رویّہ کو جائز تصوّر کرتے ہیں۔

ان حقائق کے بعد آیئے ذرا معلوم کریں کہ غیر مسلموں کے ساتھ رویہ کے سلسلے میں اسلام کا بنیادی تصوّر کیا ہے؟

اس معاملہ میں قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ معاملات میں ہمارا رویہ رواداری پر مبنی ہونا چاہئے۔ اسلام اس سلسلے میں مندرجہ

ذیل بنیادی اصول پیش کرتا ہے۔

(۱) بحیثیت مسلم ہمارا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ ہر انسان بحیثیتِ انسان معزز و مکرم ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی دین اور کسی بھی رنگ و نسل سے ہو۔ اللہ کا فرمان ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (الاسراء:۷۰)

''اور ہم نے آدم کی اولاد کو تکریم عطا کی ہے''۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو معزز و مکرم بنایا ہے' اس لیے ہمیں بھی چاہیے کہ انسان کی حیثیت سے ہم ہر انسان کی عزت و تکریم کریں۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ کا عمل ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک یہودی کا جنازہ حضور ﷺ کے قریب سے گزرا۔ آپ ﷺ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ کسی نے تعجب سے سوال کیا کہ حضور ﷺ! یہ تو یہودی کا جنازہ ہے' آپ ﷺ نے جواب دیا کہ کیا وہ انسان نہیں تھا؟ آپ ﷺ کا یہ عمل انسان کو بحیثیتِ انسان تکریم عطا کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

(۲) ہمارا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ کسی انسان کا مسلم یا کافر ہونا اللہ کی مرضی سے ہے۔ اللہ چاہتا تو سبھی کو مسلمان بنا دیتا لیکن اللہ کی مرضی اور حکمت ہے کہ دنیا میں بعض مسلم ہوتے ہیں اور بعض دوسرے مذاہب کے پیروکار۔ اللہ فرماتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ۝

(ھود:۱۱۸)

''تیرا ربّ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمت بنا دیتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب الگ الگ ہیں''۔

چونکہ ہر شخص کا مسلم یا کافر ہونا اللہ کی مرضی سے ہے اس لیے کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ کسی شخص کو قہراً جبراً مسلمان بنایا جائے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ

النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (یونس:۹۹)

''تمہارا ربّ چاہتا تو زمین کے سارے لوگ ایمان لے آتے۔ کیا تم لوگوں کے ساتھ زور وزبردستی کرنا چاہتے ہو تا کہ وہ ایمان لے آئیں؟''

(۳) کسی بھی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کافر کے کفر کا محاسبہ کرے یا اسے اس کی گمراہی کی سزا دے۔ نہ تو یہ اس کی ذمہ داری ہے اور نہ یہ دنیا اس لیے بنائی ہی گئی ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے اور اللہ نے اس کے لیے آخرت بنائی ہے جہاں کافروں کو ان کے کفر کی سزا ملے گی۔ اللہ کا فرمان ہے:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○ (الشوریٰ:۱۵)

''اس لیے اے نبی! تم اس دین کی طرف دعوت دو اور ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور کہو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے اس پر میں ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا ربّ ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اس کی طرف سب کو جانا ہے''۔

(۴) ہر مسلم کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف اور اخلاقِ حمیدہ کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بد اخلاقی اور ظلم وزیادتی کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ خواہ معاملہ کافروں کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ ظلم وزیادتی اور حق تلفی کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (المائدۃ:۸)

''اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم عدل وانصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے''۔

اور نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

دَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ وَاِنْ كَانَ كَافِرًا لَيْسَ دُوْنَهَا حِجَابٌ (مسند احمد)

''مظلوم خواہ کافر ہو اس کی پکار کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ (اس کی پکار فوراً خدا تک پہنچتی ہے)''۔

یہ ہیں اسلام کے چند بنیادی اصول۔ ان اصولوں کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا بہت آسان ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کے سلسلے میں اسلام کا کیا موقف ہے؟ اسلام کی نظر میں غیر مسلموں کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) غیر مسلموں کی ایک قسم وہ ہے جن کا دین آسمانی ہے اور جنہیں ہم اہل کتاب کہتے ہیں مثلاً یہودی اور عیسائی۔

(۲) غیر مسلموں کی دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کا دین خود ان کا وضع کردہ ہے اور ان میں بت پرستی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہندو جو کہ بت پوجتے ہیں یا مجوسی جو کہ آگ پوجتے ہیں۔

اسلامی شریعت میں دوسری قسم کے غیر مسلموں کے مقابلہ میں پہلی قسم کے غیر مسلموں کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ چنانچہ اسلام نے اہل کتاب کا ذبیحہ حلال قرار دیا ہے اور ان کی عورتوں سے شادی جائز قرار دی ہے۔

-وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (المائدۃ:۵)

''اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی''۔ ان کی عورتوں سے شادی کی اجازت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سارے سسرالی رشتہ دار اہلِ کتاب ہیں اور ان کے بچے کے ماموں، خالہ، نانا، نانی وغیرہ بھی اہلِ کتاب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں تسامح اور رواداری کی یہ عظیم ترین مثال ہے۔

ایک دوسرے زاویہ سے بھی غیر مسلموں کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے تئیں کھلم کھلا دشمنی رکھتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور انہیں تباہ و برباد کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں سے کوئی بیر نہیں رکھتے اور نہ ہی انہیں نقصان پہنچانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ نارمل طریقہ سے اور دوستانہ ماحول میں زندگی گزارتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں کے سلسلے میں اسلام کا موقف ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی مسلمان ان دونوں قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ ایک ہی جیسا برتاؤ کرتا ہے تو وہ انتہائی غلطی پر ہے۔

پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کسی قسم کی موالات، دوستی، ہمدردی اور میل ملاپ سے منع فرمایا ہے، کیونکہ یہ لوگ ہمارے ساتھ دشمنی اور جنگ پر آمادہ ہیں اور ہمارا وجود انہیں برداشت نہیں ہے، جبکہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ ہمیں حسنِ سلوک اور عدل و انصاف پر مبنی معاملہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے، کیونکہ ان کا سلوک بھی ہمارے ساتھ معاندانہ نہیں، بلکہ دوستانہ ہے۔ ذیل کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ ان دونوں قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہئے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (الممتحنۃ:۸،۹)

''اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور انصاف کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تو اس بات سے تمہیں روکتا ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور گھر سے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ جو لوگ اس طرح کے لوگوں سے دوستی کریں گے وہی لوگ ظالم ہیں''۔

کسی اسلامی ملک کے اندر رہنے والی غیر مسلم اقلیت کو اسلامی شریعت کی اصطلاح میں اہلِ ذمہ کہتے ہیں۔ اہلِ ذمّے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ غیر مسلم اللہ، رسول اور مسلمانوں کی پناہ میں ہیں۔ اب ان کی حفاظت کی ذمّے داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حقوق کے عوض ان پر جزیہ فرض کیا ہے، جسے وہ مسلم حکومت کو ادا کریں گے۔[1] بعض غیر مسلمین لفظِ ''جزیہ'' کو اپنی توہین محسوس کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اس لفظ کو بدل دیا جائے کیونکہ اس میں حقارت کی بو آتی ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بعض عیسائیوں نے مطالبہ کیا تھا۔ وہ ٹیکس دینے کے لیے تیار تھے لیکن جزیہ کے نام پر نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا حالانکہ یہ لفظ قرآن

---

[1] اسلامی شریعت کے مطابق اہلِ ذمہ کی حیثیت وہی ہے جو کسی مسلمان شہری کی ہے۔ وہ بھی مسلمانوں کی طرح پہلے درجہ کے شہری ہیں اور انہیں وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں۔

میں مذکور ہے۔ ان سے ٹیکس وصول کیا لیکن جزیہ کے نام پر نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ایک نہایت اہم بات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ اصل اہمیت نام کی نہیں' بلکہ مقصد و غایت کی ہے۔ اگر مقصد حاصل ہو رہا ہے تو اسے کسی بھی نام سے تعبیر کیا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جس طرح مسلمانوں کی جان و مال اور ان کے حقوق کی حفاظت کی ذمّے داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے' اسی طرح غیر مسلم اقلیت کی جان و مال کی حفاظت' ان کے تمام شہری حقوق اور ان کے مذہبی مقامات اور مقدّسات کی دیکھ بھال کی ذمّے داری بھی اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ غیر مسلم اقلیت کے لیے اسلامی شریعت کے یہ قوانین صرف اعتراف کرنے اور کتابوں میں لکھنے کے لیے نہیں ہیں' بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عملاً انہیں نافذ کیا جائے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کا محاسبہ کیا جائے۔

قانونی حیثیت سے غیر مسلم اقلیت جن رعایتوں اور رواداریوں کی مستحق ہے انہیں ہم مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) انہیں اپنے دین و مذہب کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ انہیں بزورِ طاقت اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان پر کسی قسم کی سیاسی' معاشی یا سماجی پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔

(۲) انہیں اپنے مذہبی رسم و رواج اور عبادات پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ انہیں اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے کسی دینی فریضے کو ترک کر دیں یا کوئی ایسا کام کریں جو ان کے مذہب کی رُو سے گناہ ہے۔ مثلاً اگر یہودی سنیچر کے دن کام کرنے کو اپنے مذہب کی رُو سے غلط تصور کرتا ہے تو اسلامی حکومت میں انہیں سنیچر کے دن کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی عیسائی اتوار کے دن گرجا گھر جانا ضروری سمجھتا ہے تو اسے ایسا کرنے سے منع نہیں

کیا جا سکتا۔

(۳) ان کے مذہب میں جو چیز حلال ہے اس پر ان کے لیے پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اگر چہ وہ چیز اسلام میں صریح حرام ہو۔ اسی طرح جو چیز ان کے مذہب میں حرام ہے اسے اپنانے پر انہیں مجبور نہیں کیا جا سکتا گرچہ وہ چیز اسلام میں حلال ہو۔ مثلاً اگر عیسائیوں کے مذہب میں سور کا گوشت کھانا اور شراب پینا حلال ہے تو اسلامی مملکت میں ان پر یہ چیزیں حرام نہیں کی جا سکتیں' کیونکہ ان کے مذہب میں یہ چیزیں حلال ہیں۔ گرچہ یہ چیزیں اسلام میں حرام ہیں۔

یہ وہ رعایتیں اور رواداریاں ہیں جو غیر مسلم اقلیت کو قانوناً حاصل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ایسی رواداریاں بھی ہیں جو قانون کے دائرے میں نہیں آتی ہیں' بلکہ حسنِ اخلاق کے زُمرے میں آتی ہیں اور جنہیں اختیار کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا سلوک اور برتاؤ حسنِ اخلاق و حسنِ معاشرت پر مبنی ہونا چاہیے۔ اگر وہ ہمارے پڑوسی ہیں تو پڑوسیوں کے مکمل حقوق انہیں ادا کریں اور اگر وہ ہمارے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں تو ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم ان کے ساتھ برا سلوک کریں۔ غیر مسلم والدین کے سلسلہ میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان:۱۵)

والدین کے علاوہ بقیہ غیر مسلمین جو ہمارے ساتھ مذہبی دشمنی نہیں رکھتے ہیں ان کے ساتھ ہمارا برتاؤ عدل وانصاف اور حسنِ اخلاق پر مبنی ہونا چاہیے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ (الممتحنہ:۸)

''اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور انصاف کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی

اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

ایک دوسری آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ مشرکین کو راہِ راست پر لانا تمہارا نہیں' بلکہ اللہ کا کام ہے۔ ان کے مشرک ہونے کے باوجود ان کی مالی مدد سے تم گریز نہ کرو۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ (البقرۃ:۲:۲۷۲)

"انہیں ہدایت دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو کچھ تم مال خرچ کرو گے اس میں تمہارا ہی بھلا ہے اور تم صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے مال خرچ کرتے ہو"۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردِ رشید محمد بن حسن روایت کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں جب قحط کی صورت پیدا ہوگئی تو نبی ﷺ نے مکہ کے قریب مشرکین کی مدد کے لیے مالی امداد روانہ کی۔ حالانکہ سبھی جانتے ہیں کہ مکہ والوں نے حضور ﷺ کے ساتھ کتنا برا سلوک کیا تھا۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری والدہ تشریف لائیں اور وہ مشرک تھیں۔ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ میری والدہ آئی ہوئی ہیں کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں ضرور کرو۔

حضور ﷺ کی سیرتِ پاک کا مطالعہ کرنے والا شخص بخوبی جانتا ہے کہ حضور ﷺ اہلِ کتاب اور مشرکین کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے پاس تشریف لے جاتے' ان کی خیریت دریافت کرتے حتیٰ المقدور ان کی مدد کرتے اور ان کے بیماروں کی تیمارداری کرتے۔

ابنِ اسحاق کی سیرتِ نبوی میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ نجران سے ایک عیسائی وفد حضور ﷺ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ آیا۔ حضور ﷺ اور صحابۂ کرام اس وقت عصر

کی نماز سے فراغت کے بعد مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے۔ اسی درمیان میں عیسائیوں کی عبادت کا وقت ہو گیا۔ چنانچہ وہ عیسائی مسجدِ نبوی کے اندر اپنی عبادت ادا کرنے لگے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین انہیں روکنے کے لیے آگے بڑھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں اپنی عبادت کرنے دو۔ چنانچہ مسجدِ نبوی کے اندر ان عیسائیوں نے اپنی عبادت ادا کی۔

سعید بن المسیّب روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی کے گھر والوں کے لیے صدقہ جاری کیا جو آج تک جاری ہے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیمار یہودی کی عیادت کو تشریف لے گئے اور باتوں باتوں میں اسے اسلام قبول کرنے کی پیشکش کی' چنانچہ اس حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر اس یہودی نے اسلام قبول کر لیا۔

بخاری شریف ہی کی ایک اور روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر کے اخراجات کے لیے کسی یہودی سے قرض لیا اور رہن کے طور پر اپنی زرہ اس کے پاس رکھ دی اور اسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو کسی صحابی سے قرض لے سکتے تھے۔ سارے صحابۂ کرام اپنا سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے لیکن اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی سے قرض لے کر اس بات کی تعلیم دی ہے کہ مشرکین و اہلِ کتاب کے ساتھ بھی ہمارا معاملہ ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ معتبر روایتوں میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے ہدیے اور تحائف بھی قبول کیے ہیں۔

یہ ہیں قرآن و حدیث کی چند دلیلیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا سلوک حسنِ اخلاق اور حسنِ معاشرت پر مبنی ہونا چاہیے۔ ان کے علاوہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عملی زندگی سے بھی مختلف دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک غریب یہودی کے گھر والوں کے لیے بیت المال

سے ماہانہ وظیفہ جاری کروایا۔ پھر یہ آیت پڑھی اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنَ ''بلاشبہ صدقہ فقراء ومساکین کے لیے ہے''۔

اور فرمایا کہ فقراء ومساکین یہودی اور عیسائیوں میں بھی ہوسکتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی سفر میں عیسائیوں کے ایک گاؤں سے گزرے۔ گاؤں والوں کو کوڑھ کا مرض لاحق تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بیت المال کی رقم سے ان کی مدد کا حکم جاری کیا۔

عمر رضی اللہ عنہ کو ایک مجوسی ابولؤلؤ نے شہید کیا تھا۔ اس کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے بسترِ مرگ پر لوگوں کو وصیت کی کہ غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ یہ واقعہ بخاری شریف میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ پڑوس میں جاکر فلاں یہودی کو قربانی کے گوشت میں سے ایک حصہ دے دو۔ غلام نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا کہ قربانی کے گوشت میں یہودی کا حصہ کیسے ہوسکتا ہے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہ بھی تو ہمارا پڑوسی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ (بخاری ومسلم)

''جبرئیل مجھے بار بار پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دے رہے ہیں یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ وہ پڑوسی کو وراثت کا حقدار بنا دیں گے''۔

بعض تابعین عیسائی پادریوں کو صدقۂ فطر دینے میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے۔ بلکہ ان میں سے بعض مثلاً امام زہری، ابن سیرین اور عکرمہ جیسے جلیل القدر تابعین عیسائی پادریوں کو زکوٰۃ کی رقم دینے میں بھی کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے۔

امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں ایک مشہور روایت ہے کہ انہوں نے تیمور لنگ سے جنگی قیدیوں کی رہائی کی بات چیت کی۔ تیمور لنگ امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے احترام

میں صرف مسلم قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو گیا لیکن ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بضد ہو گئے کہ صرف مسلم قیدیوں کو رہا کرنے سے بات نہیں بنے گی بلکہ ان کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی رہا کرنا ہوگا۔

قرآن و حدیث کی واضح تعلیمات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہٴ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین کے عملی نمونوں کو دیکھ کر یہ سمجھنا کس قدر آسان ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور خاص کر ان غیر مسلموں کے ساتھ جو کسی اسلامی ملک میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غور کریں کہ جب کسی اسلامی ملک میں غیر مسلم اقلیت کے ساتھ اچھے برتاؤ کی اتنی تاکید ہے تو کسی کافر ملک میں مسلم اقلیت کے لیے یہ بات کس قدر اہم ہے کہ وہ غیر مسلم اکثریتی فرقہ کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کریں۔ ذرا سوچیں تو سہی کہ اگر ہم غیر مسلموں کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کریں گے اور ان کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ کریں گے تو پھر ہم کس منہ سے غیر مسلموں سے کہہ سکیں گے کہ اسلام اچھے اخلاق کا حکم دیتا ہے اور اسلام بہت اچھا مذہب ہے۔ ہم کیسے انہیں اسلام کی طرف راغب کر سکیں گے۔ ہماری بداخلاقی دیکھ کر تو وہ اور بھی ہم سے دور ہو جائیں گے ہم سے نفرت کریں گے اور ہمارے دشمن بن جائیں گے اور آج کل یہی کچھ ہو رہا ہے۔

بُرائیوں کے انسداد کے لیے طاقت کا استعمال

سوال: کیا سماج میں بُرائیوں کی روک تھام کے لیے قوت و طاقت کا استعمال کیا جا سکتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَ ذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (مسلم)

”تم میں سے جو کوئی بھی بُرائی دیکھے تو اسے چاہیئے کہ بزورِ طاقت اس کی روک تھام کرے۔ جو ایسا نہیں کر سکتا اسے چاہیئے کہ اپنی زبان سے روک

تھام کرے اور جو ایسا بھی کرنے پر قادر نہیں ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے دل میں بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔

اس حدیث کی بنیاد پر بعض جذباتی قسم کے دیندار حضرات سماجی بُرائیوں کی روک تھام کے لیے قوت و طاقت کے استعمال پر اصرار کرتے ہیں خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں اور اگر حکومت چند خرابیوں میں ملوث ہے یا بُرائیوں کی ترویج کر رہی ہے تو یہ لوگ حکومت کیخلاف تخریبی کارروائیوں پر اتر آتے ہیں اور اس راہ میں انہیں جو نقصانات ہوتے ہیں یا جان چلی جاتی ہے تو اسے اللہ کی راہ میں شہادت تصوّر کرتے ہیں' جبکہ بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ سماج میں بُرائیوں کی روک تھام انفرادی ذمّے داری نہیں' بلکہ حکومت کی ذمّے داری ہے' کیونکہ بُرائیوں کی روک تھام کے لیے اگر ہر شخص انفرادی طور پر اپنی طاقت وقوت کا استعمال شروع کر دے تو معاشرہ میں بُرائیوں کی روک تھام کے بجائے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جائے گا۔

اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ امید ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں تشفی بخش جواب دیں گے۔

جواب: بلاشبہ بھلائیوں کا حکم دینا اور بُرائیوں سے روکنا' جسے شریعت کی اصطلاح میں (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کہتے ہیں' دین کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ یہ وہ فریضہ اور وصف ہے جس کی وجہ سے اس اُمت کو بہترین اُمت کا خطاب دیا گیا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ط (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو' تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

اور جس اُمت نے اس فریضہ سے غفلت برتی وہ اُمت اللہ کے نزدیک ملعون قرار پائی:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ م بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ (المائدۃ:۷۸۔۷۹)

''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ بُرا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا''۔

حقیقی مسلم وہ نہیں ہے جو صرف اپنی اصلاح کر کے مطمئن ہو جائے اور مگن رہے۔ معاشرہ میں بُرائیوں اور گمراہیوں کو پھلتا پھولتا دیکھے اور اسے تکلیف نہ ہو۔ اسے یہ فکر دامن گیر نہ ہو کہ ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کے لیے مسلسل جدوجہد ہونی چاہیے۔ حقیقی مسلم وہ ہے جسے اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد رہنے والے انسانوں کی اصلاح کی بھی فکر ہو۔ ایک سچے اور اچھے مسلمان کے لیے کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ خود تو آگ میں جلنے سے تکلیف محسوس کرتا ہو اور دوسروں کو آگ میں جلتا دیکھ کر بے پرواہ بنا رہے۔ ایک سچے انسان اور مسلمان کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے:

وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ (العصر۱۔۳)

''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے''۔

''تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ'' کی تشریح یہ ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو حق اور اچھی باتوں کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے اپنے سوال میں جس صحیح حدیث کا حوالہ دیا ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ مومن وہی شخص ہو سکتا ہے جو حق اور نیک باتوں کی تلقین کرتا رہے،

اور جو باتیں باطل ہیں اور سماج کو نقصان پہنچا رہی ہیں، ان کی روک تھام کے لیے ہمہ تن کوشاں رہے۔ اگر بزورِ طاقت روک سکتا ہے تو یہ سب سے بہتر صورت ہے ورنہ اپنی زبان اور قلم سے کوشاں رہے۔ یہ بات تو ایک باہوش، طاقتور اور زندہ قوم کی علامت ہے کہ معاشرہ میں پھیلتی بُرائیوں پر خاموش نہ رہے، بلکہ بزورِ طاقت انہیں روکنے کی کوشش کرے۔ اگر اُمت مسلمہ کو اس بات کا احساس ہے کہ اللہ نے اسے بہترین اُمت کا خطاب دیا ہے تو اسے چاہئے کہ ان اوصاف کو اختیار کرے جن سے اس کا بہترین ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔

تاہم اس فریضہ کی ادائی کے سلسلے میں چند باتوں اور شرطوں کی رعایت نہایت ضروری ہے۔ مذکورہ حدیث کے الفاظ خود ہی ان شرطوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ جس بُرائی کی روک تھام مقصود ہو وہ ''منکر'' ہو جیسا کہ مذکورہ حدیث میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ مُنکر، اس بُرائی کو کہتے ہیں جسے قرآن یا صحیح حدیث میں واضح طور پر اور مکمل صراحت کے ساتھ حرام اور گناہ قرار دیا گیا ہو۔

اس بنا پر وہ برائیاں، جنہیں ہمارا ذہن بُرائی تصوّر کرتا ہو لیکن قرآن و حدیث میں انہیں گناہ نہیں قرار دیا گیا ہے، منکر کے دائرے میں نہیں آئیں گی۔ کیونکہ جب تک اللہ اور اس کا رسول کسی بُرائی کو منکر نہیں کہتا اسے ہمارے منکر سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اسی طرح وہ گناہ جو گناہِ صغیرہ کہلاتے ہیں 'منکر' میں شمار نہیں ہوں گے کیونکہ اس طرح کے گناہ خود بہ خود معاف ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے:

إِن تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ۝ (النساء:۳۱)

''اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی چھوٹی بُرائیوں کو ہم معاف کرتے رہیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے''۔

اسی طرح بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں علماء کے درمیان اختلاف ہوتا ہے۔ بعض انہیں گناہ قرار دیتے ہیں اور بعض انہیں جائز اور مباح تصور کرتے ہیں مثلاً سگریٹ کا استعمال کرنا یا موسیقی کے ساتھ گانا سننا وغیرہ۔ اس طرح کے اختلافی مسائل بھی منکر کے دائرے میں نہیں آتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ بعض سخت گیر قسم کے مسلمانوں نے دکانوں میں گھس کر گڑیوں اور کھیلنے کے مجسموں کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا اور اس طرح ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اس طرح کی تخریبی کارروائی کے ذریعے سے برائیوں کو روک رہے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ عمل صحیح نہیں تھا کیونکہ گڑیوں اور مجسموں سے کھیلنا ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی نظر میں یہ بات ناجائز ہو لیکن بہت سارے علماء گڑیوں سے کھیلنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ جو مسلک وہ اختیار کریں سارے مسلمان وہی مسلک اختیار کرلیں۔ آخر کس بنا پر وہ اپنی مرضی اور اپنا مسلک دوسروں پر تھوپ سکتے ہیں۔

غرضیکہ اس طرح کے اختلافی مسائل میں سخت گیر موقف اپنانا یا چھوٹے چھوٹے گناہوں کی روک تھام کے لیے طاقت کا استعمال کرنا' کسی طرح مناسب اقدام نہیں ہے۔

(۴) دوسری شرط یہ ہے کہ جس منکر کی روک تھام مقصود ہو معاشرہ میں اعلانیہ طور پر اور کھلم کھلا اس کا ارتکاب ہو رہا ہو' کیونکہ حدیث کے الفاظ ہیں ''مَنْ رَّاٰی'' جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ منکر لوگوں کی نظر میں آ جائے۔ اگر کوئی شخص چوری چھپے یا اپنے گھر میں بیٹھ کر کسی 'منکر' کا ارتکاب کر رہا ہے تو اسے بزورِ طاقت روکنا ہماری ذمّے داری نہیں ہے۔ یہ اس کے اور اس کے خدا کے درمیان کا معاملہ ہے۔ چاہے تو اسے سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ کُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافیٰ اِلَّا الْمُجَاھِرُوْنَ ''میری اُمت کا ہر شخص قابلِ معافی ہے سوائے ان لوگوں کے جو کھلم کھلا برائیاں کرتے ہیں''۔

مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں کوئی شخص چوری چھپے اپنے گھر کے اندر کسی بُرائی میں ملوث تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے بُرائی سے روکنے کے لیے چپکے سے اس کے گھر کے پچھواڑے سے اندر آ گھسے اور رنگے ہاتھوں اسے پکڑ لیا۔ اس شخص نے کہا کہ اے امیر المؤمنین میں نے تو بُرائی کر کے صرف ایک گناہ کیا ہے۔ لیکن آپ نے اس طرح میرے گھر میں گھس کر تین گناہ کیے ہیں۔ پہلا گناہ یہ ہے کہ آپ نے تجسس کیا اور میری ٹوہ میں لگے رہے' حالانکہ اللہ نے تجسس اور ٹوہ میں لگے رہنے سے منع کیا ہے۔ دوسرا گناہ یہ ہے کہ آپ میرے گھر کے پچھواڑے سے چوری چھپے میرے گھر کے اندر آئے' حالانکہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ جب کسی کے گھر جاؤ تو گھر کے دروازے سے جاؤ۔ تیسرا گناہ یہ ہے کہ آپ میرے گھر کے اندر بغیر میری اجازت اور بغیر سلام کیے داخل ہوئے۔ حالانکہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ جب کسی کے گھر جاؤ تو سلام کرو اور اس کی اجازت ملے تب اندر جاؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور بہت نادم ہوئے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ بُرائیوں کو بزورِ طاقت روکنے والے کے پاس ان کی روک تھام کے لیے خاطر خواہ استطاعت اور مادی و معنوی وسائل مہیا ہوں۔ اسی لیے مذکورہ حدیث میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جو شخص اس طرح کی استطاعت نہ رکھتا ہوا سے طاقت کے بجائے صرف زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طاقت کے زور پر بُرائیوں کی روک تھام کے لیے اس کی استطاعت اور اس کے لیے مناسب وسائل کا مہیا ہونا ضروری ہے۔ بعض لوگ وسائل مہیا نہ ہونے کے باوجود محض جذبات میں آ کر طاقت کا استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ اقدام غیر حکیمانہ اور حدیث کے مزاج کے خلاف ہے' کیونکہ ایسا کرنے سے بُرائیوں کے دور ہونے کے بجائے نئے نئے مسائل اور فتنے جنم لیتے ہیں۔

مناسب یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنے ہی اثر و رسوخ والے علاقہ میں رہ کر بُرائیوں کی

روک تھام کی کوشش کرے۔ مثلاً شوہر اپنے گھر والوں کے درمیان رونما ہونے والی خرابیوں اور بُرائیوں پر نظر رکھے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح حاکم وقت اپنے ملک کے حدود میں رہتے ہوئے بُرائیوں کی روک تھام کے لیے قوت کا استعمال کر سکتا ہے۔

(۴) اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ بُرائیوں کی روک تھام کے لیے طاقت کا استعمال کسی بڑی بُرائی یا فتنے کا سبب نہ بن جائے۔ مثلاً خون خرابے کی نوبت آ جائے یا اس بات کا اندیشہ ہو کہ جنہیں بُرائیوں سے روکا جا رہا ہے وہ ضد میں آ کر ہنگامہ مچائیں گے اور مزید بُرائیوں کا ارتکاب کرنے لگیں گے۔ اسی لیے علماءِ کرام کہتے ہیں کہ ایسے موقع پر خاموشی اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: لَوْلَا اَنَّ قَوْمَكَ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِشِرْكٍ لَبَنَيْتُ الْكَعْبَةَ عَلٰى قَوَاعِدِ اِبْرَاهِيْمَ ''اگر تمہاری قوم شرک کے زمانے سے بہت قریب نہ ہوتی تو میں کعبہ کی تعمیر ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر کرتا''۔

یعنی تمہاری قوم ابھی ابھی شرک سے نکلی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر کعبہ کی تعمیر کی تو تمہاری قوم ضد میں آ کر دوبارہ شرک میں چلی جائے گی۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو میں ایسا ضرور کرتا۔

ذہنوں میں ایک اہم سوال یہ اُبھرتا ہے کہ اگر برائیاں حکومت کی طرف سے پھیلائی جا رہی ہوں تو کیا عوام حکومت کو ان بُرائیوں سے باز رکھنے کے لیے طاقت کا استعمال کر سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے غیر منظم اور جذباتی انداز میں قوت کا استعمال خطرناک نتائج کا باعث بن سکتا ہے۔ اس طرح کے اقدام سے پہلے ضروری ہے کہ عوام کے پاس حکومت پر اثر انداز ہونے کے لیے مناسب وسائل مہیا ہوں۔ دورِ جدید میں یہ مناسب وسائل حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) عوامی طاقت ہو کسی بھی جمہوری ملک میں عوام کی آواز سے بڑھ کر اور کوئی طاقت نہیں ہو سکتی۔

(۲) ملک کے پارلیمنٹ میں عوام کا اپنا اثر ورسوخ پیدا کرنا' کیونکہ پارلیمنٹ ہی سب سے مؤثر ادارہ ہے جسے قوانین بنانے' انہیں نافذ کرنے یا انہیں ختم کرنے کے اختیارات ہوتے ہیں۔

(۳) ملک کی فوج میں عوام کا اپنا اثر ورسوخ بنانا' کیوں کہ حکومت کے لیے فوج کے مطالبات کو ٹھکرانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اگر فوج چاہے تو حکومت کو اس کے غلط اقدامات سے روک سکتی ہے۔

آخر میں' میں ان لوگوں سے کچھ کہنا چاہوں گا جو معاشرہ میں بُرائیوں کے خاتمہ کا نیک ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے کچھ عملی اقدامات کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ صدیوں سے ہماری قوم جہالت اور گمراہی میں مبتلا ہے' جس کی وجہ سے اس قوم میں برائیاں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ اس لیے جب تک بنیادی اور اصل برائیاں نہیں دور کی جائیں گی اس وقت تک خاطر خواہ نتائج سامنے آنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ جن بُرائیوں کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ انہیں اگر بزورِ طاقت دور بھی کر دیا جائے تو بھی بنیادی خرابیاں معاشرے کو ہمیشہ کھوکھلا اور تباہ و برباد کرتی رہیں گی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے بنیادی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ بنیادی خرابیوں سے میری مراد ہے۔ جہالت' ناخواندگی' صحیح دین سے ناواقفیت اور اچھے اور اعلیٰ کردار کا فقدان وغیرہ وغیرہ۔ جب تک ان خرابیوں کو دور نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک محفلِ موسیقی کو زبردستی بند کرانے عورتوں کو زبردستی برقعے پہنوانے اور گڑیوں کی دکانوں کو توڑنے پھوڑنے سے فائدہ کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم کی جہالت دور کی جائے۔ ان میں دینی و دنیاوی تعلیم عام کی جائے۔ انہیں صحیح دین سے واقف کرایا

جائے اور ان میں اعلیٰ کردار پیدا کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو چھوٹی چھوٹی اور غیر بنیادی خرابیاں خود بہ خود زائل ہو جائیں گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ بُرائیوں کے ازالے کے لیے حکمت و دانائی کا استعمال بہت ضروری ہے۔ آج ہماری دعوتی سرگرمیوں کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم حکمت و دانائی کا راستہ اختیار کرنے اور نتائج پر نظر رکھنے کے بجائے محض جذباتی انداز میں دعوت کا کام کرتے ہیں۔ جہاں نرمی اختیار کرنی چاہیے وہاں بحث و مباحثہ اور تشدد پر اتر آتے ہیں بلکہ بسا اوقات لڑائی جھگڑے کی نوبت آ جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکمت کا راستہ اختیار کیا جائے اور نرمی اور رغبت دلانے والا انداز اپنایا جائے اور ہر قدم نتائج پر نظر رکھتے ہوئے اور موقع و مناسبت کا خیال کرتے ہوئے اٹھایا جائے۔ اللہ کا فرمان ہے

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط (النحل:۱۲۵)

''اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے بہت اچھے طریقے سے مباحثہ کیا کرو''۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے ظالم و جابر حکمراں کے پاس بھیجا تو انہیں بھی نرمی اختیار کرنے کی ہدایت کی۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○ (طٰہٰ:۴۳)

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ اس نے سرکشی کی ہے۔ پس تم دونوں اس سے نرم باتیں کہو شاید کہ وہ نصیحت حاصل کر لے یا اس کے اندر ڈر پیدا ہو جائے''۔

نفاذِ اسلام کی کوشش

سوال: جو لوگ دعوتِ دین کا کام کرتے ہیں اور معاشرہ میں مکمل دین کو نافذ کرنا چاہتے ہیں' انہیں اکثر مختلف قسم کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک اعتراض یہ ہے کہ یہ لوگ دین میں سیاست کو شامل کر کے سیاسی مفادات حاصل کرنے کے چکر میں ہیں۔ یہ لوگ معاشرے میں فتنہ پھیلا رہے ہیں اور لوگوں میں تفرقہ ڈال رہے ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرے کا امن وسکون غارت ہو رہا ہے۔ ایسا اعتراض کرنے والے اکثر وہ لوگ ہیں جو مفکرین اور دانشورانِ ملت کہلاتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں جو علماء دین کہلاتے ہیں' لیکن دین کو صرف عبادات و اذکار تک محدود سمجھتے ہیں۔ کیا معاشرہ میں مکمل دین کی دعوتِ دینے والے واقعی فتنہ پرور ہیں؟

جواب: اگر دعوتِ دین کا کام اور مکمل دین کے نفاذ کی کوشش واقعی فتنہ پروری ہے جیسا کہ اعتراض کرنے والے کہتے ہیں تو نَعُوْذُ بِاللّٰہِ' اللہ کے رسول وانبیاء سب سے پہلے فتنہ پرور ہیں' کیونکہ دعوتِ دین کی ذمّے داری اور معاشرہ میں پھیلی برائیوں کے خاتمے کی ذمّہ داری سب سے پہلے ان ہی رسولوں اور انبیاء نے تو نبھائی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دعوتِ دین کی تحریک کے نتیجہ میں معاشرہ دو گروہوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک گروہ مؤمنین وصالحین کا اور دوسرا گروہ کفار ومشرکین کا۔ اور ان دونوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں۔ ملاحظہ ہو اللہ کا فرمان:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ فَاِذَا ھُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ○ (النمل:۴۵)

''اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ اے لوگو! تم اللہ کی عبادت کرو۔ پس وہ دو گروہوں میں بٹ کر جھگڑنے لگے''۔

تو کیا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ صالح علیہ السلام فتنہ پرور تھے کہ دعوتِ دین کے نتیجہ میں ان کا

معاشرہ دو گروہوں میں منقسم ہوگیا اور ان کے درمیان لڑائیاں شروع ہوگئیں۔

حضور ﷺ کی بعثت سے قبل پورا معاشرہ ایک گروہ کی شکل میں تھا' یعنی سب ہی مشرک تھے۔ لیکن جب حضور ﷺ نے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی تو معاشرہ دو گروہوں میں منقسم ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے اسلام قبول کرلیا اور کچھ شرک پر اڑے رہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ان کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ تو کیا نَعُوْذُ بِاللّٰہ حضور ﷺ فتنہ پرور تھے؟

یہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ فتنہ کے مفہوم کو واضح کیا جائے۔ فتنہ دراصل آزمائش اور امتحان کو کہتے ہیں۔ بہت ساری آیتوں میں یہ لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝

(العنکبوت:۱'۲)

''الم! کیا لوگوں کو یہ گمان ہے کہ وہ ایمان لائیں گے اور انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا''۔

قرآن میں متعدد مقامات پر مال واولاد اور عورتوں کو فتنہ کہا گیا ہے تو یہ سب چیزیں اسی مفہوم میں فتنہ ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے امتحان لیتا ہے اور آزماتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اللہ کی نعمت ہیں۔ یہاں فتنہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ ساری چیزیں فتنہ پرور ہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش کا سامان بنایا ہے۔

۔ فتنہ کا ایک دوسرا مفہوم ہے عذاب دینا اور ستانا۔ مثلاً یہ آیت ملاحظہ کیجیے:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَھُمْ عَذَابُ جَھَنَّمَ وَلَھُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ ۝ (البروج:۱۰)

''بے شک جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں کو ستایا اور اپنے اس عمل سے توبہ نہیں کی۔ ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور آگ کا عذاب ہے''۔

اس آیت کی رُو سے فتنہ پرور وہ لوگ ہیں جو مؤمنین کو ستاتے اور تنگ کرتے ہیں۔ فتنہ پرور وہ نہیں ہیں جو دین اور اسلام کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ بلکہ دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کو ستانے والے فتنہ پرور ہیں۔ جو لوگ دعوتِ دین کا کام کرنے والوں پر الٹے سیدھے اعتراضات کر کے پریشان کرتے ہیں۔ انہیں غور کرنا چاہئے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس آیت کی رُو سے وہ خود ہی فتنہ پرور ہیں۔
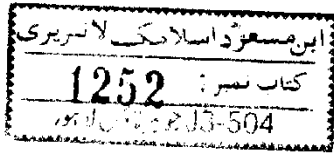
ہماری مقبول مطبوعات

کتاب	مصنف
فتاویٰ یوسف القرضاوی (جلد دوم)	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
اسلامی نظام (ایک فریضہ۔ایک ضرورت)	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
امت مسلمہ کیلئے سلامتی کی راہ	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
فقہ الزکوٰۃ	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
اسلامی زندگی	ڈاکٹر محمد علی ہاشمی
الروح والریحان	محمد وقاص
خلیفۃ الرسولؐ	طالب ہاشمی
تیس پروانےؓ	طالب ہاشمی
چالیس جاں نثارؓ	طالب ہاشمی
ہمارے رسولِ پاک ﷺ	طالب ہاشمی
تذکارِ صحابیات	طالب ہاشمی
سو شیدائی	طالب ہاشمی
ستر ستارےؓ	طالب ہاشمی
پچاس صحابہؓ	طالب ہاشمی
سیرتِ فاطمہؓ	طالب ہاشمی

البدر پبلی کیشنز

23۔راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور

Ph: 042-37225030 37245030

Mob: 0300-8485030